''اردو افسانے میں کشمیری تہذیب و ثقافت''

(جموں و کشمیر کے افسانہ نگاروں کے حوالے سے)

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار

جاوید احمد میر

نگراں

ڈاکٹر اے۔آر۔منظر

(اسسٹنٹ پروفیسر)

شعبہ اردو، اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد۔۵۰۰۰۴۶

جون/۲۰۱۵

فہرست

پیش لفظ	۲
باب اول:	
تہذیب وثقافت کی تعریف	۶
باب دوم:	
کشمیر کا تاریخی پس منظر	۲۲
باب سوم:	
کشمیر کا تہذیبی وثقافتی منظر نامہ	۴۹
باب چہارم:	
اردو افسانے میں کشمیری تہذیب وثقافت (جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کے حوالے سے)	۱۴۲
ماحصل	۲۵۷
کتابیات	۲۶۵

پیش لفظ

کسی قوم کے ماضی کو سمجھنے کے لئے ضروری بنتا ہے کہ ہم اُس قوم کی تہذیب وثقافت کے بارے میں جانیں۔اس ضمن میں ادب بنیادی ماخذ سمجھا جاتا ہے۔جس کی بدولت کسی قوم کی ذہنی نشو ونما،تہذیبی سطح اور فارغ البالی کی سرحدوں کو متعین کیا جاسکتا ہے۔آج سے کئی سال قبل داستان کا رواج تھا جو جی بہلانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ مانا جاتا تھا اور داستان باقاعدہ طور پر ہر اعتبار سے اپنے عہد کے رہن سہن،لباس،زیورات،محلات اور رسومات وغیرہ کی عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی تھی۔وہیں سے ہمیں ادب میں بڑے پیمانے پر تہذیبی وثقافتی نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں۔اسی بنا پر ہم آج سے کئی سال پرانے ماحول، رہن سہن اور طرزِ زندگی وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ناول اور افسانہ اسی کی ارتقائی کڑیاں ہے جن کے اندر پورا معاشرہ سمویا جاسکتا ہے۔

کشمیر تہذیبی وثقافتی لحاظ سے تقریباً دنیا کے ہر خطے سے مختلف ہے جس کی ایک الگ شناخت ہے۔اس تعلق سے وادی کے آپسی بھائی چارہ، پیار ومحبت،قدرتی مناظر،مہمان نوازی،رسم ورواج، پکوان،لباس اور سیر وسیاحت وغیرہ نے اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔اس سے ادب ہمیشہ سے متاثر ہوتا آیا ہے جس کے ساتھ میری بڑی دلچسپی تھی۔اسی بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُستاد محترم پروفیسر بیگ احساس کے رہنمائی سے میرا پی ایچ ڈی کا موضوع ''اُردو افسانے میں کشمیری

تہذیب وثقافت ، جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کے حوالے سے'' منتخب ہوا۔ چونکہ جموں وکشمیر تین خطوں پر مشتمل ہے جموں، کشمیر اور لداخ ،جن میں کشمیر کو تہذیبی وثقافتی لحاظ سے مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے میرے مقالے میں صرف کشمیری تہذیب وثقافت کو مدنظر رکھ کر بحث کی گئی ہے۔

زیرنظر مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول: ''تہذیب و ثقافت کی تعریف'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں تہذیب وثقافت کے تعلق سے ماہرین نے مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں جن کے ذریعہ تہذیب و ثقافت کے معنی ومفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور تہذیب وثقافت کو سمجھنے کے لئے کن کن نکات کی ضرورت ہیں جن سے ایک قوم ،ایک ملک یا ایک ریاست کی تہذیب وثقافت پروان چڑتی ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ سماج میں تہذیب وثقافت کی کیا اہمیت ہے۔

باب دوم: ''کشمیر کا تاریخی پس منظر'' کے عنوان پر مشتمل ہے۔ جس میں اختصار کے ساتھ کشمیر کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ کشمیر کا وجود کیسے عمل میں آیا، کشمیر پر کن کن خاندانوں اور حکمرانوں نے حکومت کی اور کشمیری عوام کے ساتھ اُن کا کیا روئیہ رہا ہے اور آج کشمیر کی تاریخ نے کیا رخ اختیار کیا ہے۔

باب سوم: ''کشمیر کا تہذیبی وثقافتی منظرنامہ'' کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں کشمیری تہذیب وثقافت کے حوالے سے مدلل بحث کی گئی ہے۔ کشمیری تہذیب وثقافت کے مختلف اجزاء پر عنوانات کے تحت روشنی ڈالی گئیں ہیں ۔ جیسے رسومات، لوک گیت، دستکاری، قدرتی مناظر اور لوگ وغیرہ ۔ جس سے تقریباً مکمل طور پر کشمیری تہذیب و ثقافت کے خدوخال کا خاکہ آنکھوں میں اُبھر سکتا ہے۔

باب چہارم: ''اُردو افسانے میں کشمیری تہذیب وثقافت ، جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کے حوالے سے'' رکھا گیا ہے۔ اس باب میں جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کے تقریباً تمام

دستیاب شدہ افسانوں کا مطالعہ کر کے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہاں کے افسانہ نگاروں نے کس طرح سے کشمیری تہذیب و ثقافت کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے اور کہاں تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اس کے بعد ماحصل پیش کیا گیا ہے۔ پھر آخر میں کتابیات کے عنوان سے ایک فہرست دی گئی ہے جس سے استفادہ کر کے یہ مقالہ تکمیل کو پہنچا۔

اُن تمام کرم فرماؤں کا میں سپاس گزار ہوں جنھوں نے زیرِ نظر مقالہ میں میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ سب سے پہلے میں صدر شعبہ اردو پروفیسر مظفر علی شہ میری کا تہہ دل سے ممنون ہوں جو میرے لئے مشفق اُستاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی اور مفید مشوروں سے نوازا۔ میں استادِ محترم پروفیسر بیگ احساس کا بھی بے حد مشکور و ممنون ہوں۔ انھوں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ میرے مقالہ کی نظرِ ثانی بھی کی اور مجھے اپنے قیمتی صلاح مشوروں سے سرفراز کیا۔ میرا ایم۔فل کا مقالہ ان ہی کی نگرانی میں مکمل ہوا۔ وہ ایک قابل اور حساس فنکار بھی ہیں۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ مجھے آپ جیسے استاد کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ ان کے لئے اتنا کہوں گا کہ انھوں نے ایک شفیق اُستاد ہونے کا حق ادا کیا۔ شعبہ کے دیگر اساتذہ کرام استادِ محترم پروفیسر انور الدین، پروفیسر رضوانہ معین، ڈاکٹر حبیب نثار، ڈاکٹر عرشیہ جبین، ڈاکٹر محمد کاشف، ڈاکٹر نشاط احمد، ڈاکٹر زاہد الحق اور رفیعہ بیگم کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔ اور خاص طور سے میں اپنے نگراں ڈاکٹر عبدالرب منظر کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن سے دورانِ تحقیق مجھے رہنمائی ملتی رہی۔ انھوں نے کبھی بھی مجھ پر کوئی پابندی عاید نہیں کی۔ مجھے ہمیشہ اپنی دلچسپی کے مطابق کام کرنے کی آزادی دی۔ میری حوصلہ افزائی کی اور نیک مشوروں سے نوازا۔

ان تمام متعدد کتب خانوں اندرا گاندھی سنٹرل لائبریری حیدرآباد، اقبال لائبریری کشمیر، شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی کی لائبریری، ڈسٹرکٹ لائبریری بارہ مولہ کشمیر، تحصیل لائبریری سوپور کشمیر، ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد اور جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی سرینگر کے تمام اراکین کا میں فرداً

فرداً شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنھوں نے میرے مقالہ کی تکمیل کے سلسلے میں مجھے مواد فراہم کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ان ادیبوں کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے میری مدد فرمائی، خاص طور سے نور شاہ، ترنم ریاض اور پرویز مونوس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انھوں نے بہ آسانی مجھے اپنے افسانے ارسال کیے۔ میں عزیز دوست ثمینہ بیگم کا بھی شکر گزار ہوں۔ انھوں نے بڑی جاں فشانی سے کمپوزنگ کے فرائض انجام دیے۔ آخر میں ان تمام دوست احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے دورانِ تحقیق کے چار سال میرے ہمراہ گزارے۔ ان میں خاص طور سے ارشاد احمد ڈار، فیاض احمد ڈار، رئیس احمد بٹ، سجاد الدین، وسیم حسن راجا اور رحمت اللہ میر کا میں شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انھوں نے دورانِ تحقیق میری مدد کی۔ اللہ رب العزت سے میں دعا گو ہوں کہ میرے تمام اساتذہ، عزیز و اقارب اور دوست احباب کے لئے آسانیاں پیدا فرمائے۔ آمین۔

باب اول

تہذیب وثقافت کی تعریف

تہذیب وثقافت کی تعریف

تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے عربی زبان میں اس کے لغوی معنی ہیں درخت تراشنا، کاٹنا چھاٹنا اور اصلاح کرنا۔ فارسی زبان میں اس کے معنی ہیں آراستن و پیراستن، پاک و درست و اصلاح کردن۔ یہ لفظ مجازی معنی میں شائستگی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے اُردو میں بھی یہ لفظ انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم مجموعی طور پر تہذیب کا تصور پیش کرتے ہیں تو اس میں انسانی زندگی کا ابتدا سے اختتام تک کا سفر شامل ہو جاتا ہے۔ یعنی اس میں انسانی زندگی کا رہن سہن، ماحول، طور طریقے، عادات و اطوار، رسومات، کھانا پینا، لباس و زیورات اور بات چیت وغیرہ کا ذکر آجاتا ہے۔ بقول ترنم ریاض:

''تہذیب یک رُخی نہیں ہوتی، بلکہ اس کے کئی رُخ ہوتے ہیں۔ ان میں رسم ورواج، تصّورات، دیومالا، فنونِ لطیفہ اور فلسفہ شامل ہیں۔'' [1]

سر سید احمد خاں اپنے عہد کے ممتاز مفکر و دانش ور ہیں۔ سر سید اور ان کے رفقائے کار نے اپنی تنقیدات میں تہذیب کے مباحث کو موضوع بنایا۔ اس دور میں انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں تھی، اسی کے زیر اثر سر سید احمد خاں انگلستان کی تہذیب سے بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے انگلستان اور ہندوستان کی معاشرتی زندگی اور مجموعی صورتِ حال کا نہ صرف موازنہ کیا بلکہ انھوں نے انگلستان کی تہذیب کو ہندوستان کی سماجی زندگی پر مقدم خیال کیا وہ تہذیب کے مفہوم کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اس پرچے کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کو

کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے ،تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ مہذّب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہووے،اوروہ بھی دنیا میں مہذب قومیں کہلا دیں۔سویلزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے،مگراس کے معنی نہایت وسیع ہیں، اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعالِ ارادی، اخلاق اورمعاملات اورمعاشرت اورتمدن اورطریقۂ تمدن اورصرفِ اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہُنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا، اوران کو نہایت خوبی وخوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصل خوشی اورجسمانی خُوبی ہوتی ہے،اورتمکین ووقاراورقدرومنزلت حاصل کی جاتی ہےاوروحشیانہ پن اورانسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔''۲

سبطِ حسن تہذیب کے لئے انگریزی لفظ کلچر کا استعمال کرتے ہیں اور اس کے معنی و مفہوم یوں بیان کرتے ہیں:

''کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکرواحساس کا جوہر ہوتی ہیں۔ چناچہ زبان، آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ وحکمت، عقائد وافسوس، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، عشق ومحبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔ انگریزی زبان میں تہذیب کے لئے کلچر کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔کلچر لاطینی زبان کا لفظ ہے۔اس کے لغوی معنی ہیں،'زراعت ، شہد کی مکھیوں، ریشم کے کیڑوں، سیپیوں اور بیکٹیریا کی پرورش یا افزائش کرنا، جسمانی یا ذہنی اصلاح وترقی، کھیتی باڑی کرنا' اُردو، فارسی اور عربی میں کلچر کے لئے تہذیب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے۔اس

کے لغوی معنی ہیں کسی درخت یا پودے کو کاٹنا، چھانٹنا، تراشنا تا کہ اس
میں نئی شاخیں نکلیں اور نئی کونپلیں پھوٹیں۔ فارسی زبان میں تہذیب کے
معنی 'آراستن، پیراستن' پاک و درست کردن واصلاح نمودن' ہیں۔
اُردو میں تہذیب کا لفظ عام طور سے شائستگی کے معنی میں استعمال ہوتا
ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا مہذب یا تہذیب یافتہ ہے
تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ شخص مذکورہ کی بات چیت کرنے،
اُٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا اندازہ اور رہن سہن کا طریقہ ہماری روایتی
معیار کے مطابق ہے۔ وہ ہمارے آدابِ مجلس کو بڑی خوبی سے ادا کرتا
ہے اور شعروشاعری یا فنونِ لطیفہ کا ستھرا ذوق رکھتا ہے۔''[۳]

تہذیب سے ہی ایک انسان کی شناخت قائم ہوتی ہے جب یہ تہذیبیں مختلف قوموں میں الگ الگ طرح سے پائی جاتی ہیں تب ہم ان تہذیبوں کی انفرادیت کو بھی جانچتے ہیں۔ گویا انسانی زندگی گزارنے کے طور طریقوں کو ہم تہذیب کا نام دے سکتے ہیں۔ ہر چیز کے ساتھ ساتھ تہذیب میں بھی تبدیلی ایک ضروری امر ہے۔ یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کا اندازہ بخوبی سماج میں رہنے والے ایک فرد سے لگایا جا سکتا ہے جو آرام طلب اور ترقی یافتہ معاشرے کی تہذیب کو تسلیم کرتا ہے اور اپنی تہذیب کو فراموش کر دیتا ہے۔ مشتاق احمد وانی لکھتے ہیں:

''تبدیلی قدرت کا اٹل قانون ہے۔ اس سے کسی چیز کو مفر نہیں۔ کائنات
کی ہر چیز کی طرح انسان بھی ہر لمحے بدلتا ہے۔ نہ صرف جسمانی اعتبار
سے بلکہ فکری و ذہنی اعتبار سے بھی وہ ہر وقت نیا روپ اختیار کرتا
چلا جاتا ہے۔ کبھی اس تبدیلی کی سمت مثبت منزلوں کی طرف ہوتی اور
کبھی منفی۔ انہیں دو منزلوں سے حیاتِ انسانی عبارت ہے اور یہی اس
کے وجود کو مثبت یا منفی صفات سے ہم کنار کرتی ہے۔''[۴]

اس طرح تہذیب میں بھی تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی لئے ایک خطے یا ایک ملک میں

کئی تہذیبیں پائی جاتی ہیں، ایک تہذیب کے افراد کا طرز احساس، طرزِ فکر، زاویہ نظر اور تجربات دوسری تہذیب کے افراد سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ تجربات بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ عناصر ہیں جو مختلف تہذیبوں کے مابین امتیازات قائم کرتے ہیں۔ زبان ایک ایسا عنصر ہے جو تہذیب کی پیدائش کا سبب بنتا ہے۔ کسی قوم کا اجتماعی شعور دوسری قوم سے مختلف ہوسکتا ہے۔ دنیا میں مسلمان تو ہر ملک میں آباد ہیں۔ لیکن ان کی تہذیب ایک کیسے ہوسکتی ہے، اس کی ایک بڑی اہم وجہ یہ ہے کہ ہر خطے کی زبان، آب وہوا، موسمی حالات مختلف ہوتے ہیں جو ان کو متشکل کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں تہذیب یکساں نہیں ہوتی، موسمی اثرات کے نتیجے میں لباس مختلف ہوگا، زبان مختلف ہونے کے سبب اقدار، طرزِ فکر واحساس پر بھی اثرات مرتب ہوں گے۔ اس طرح تہذیب میں تنوع کی کیفیات ضرور پیدا ہوں گی۔ ہم جب ملکی سطح پر بھی دیکھیں تو مختلف تہذیبیں پائیں گے۔ ہندوستان میں ہر ریاست ایک منفرد تہذیبی شناخت رکھتی ہیں۔ اس بنا پر ہم یہ کہتے ہیں، کشمیری تہذیب، حیدرآبادی تہذیب، پنجابی تہذیب، دہلی کی تہذیب وغیرہ، کیونکہ تمام ریاستوں کی زبان، رسومات، لباس، آرٹ، قوانین اور طرزِ فکر وعمل وغیرہ مختلف ہیں۔ مشتاق احمد وانی تہذیب کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''تہذیب سے متعلق کچھ کا تو یہ قول ہے کہ یہ آدمی کے اجتماعی رویوں اور آداب و اطوار میں پائی جانے والی اچھائیوں کا نام ہے۔ کچھ کے نزدیک 'تہذیب' نام ہے سچائی، پاکیزگی اور نیکوکاری جیسی اقدار کا۔ بعض کا کہنا یہ ہے کہ تہذیب چند ایک عبقری شخصیتوں کی ذاتی اور تخلیقی قوتوں کا ظاہری روپ ہے۔ بعض اسے اتنی شخصی چیز نہیں سمجھتے بلکہ ان کا یہ کہنا ہے کہ تہذیب سماجی اور کسی قوم کے عقیدے اور نظریات، رسم و رواج، آداب واطوار، رہن سہن، طرزِ زندگی بود و باش، رفتار و گفتار اور علمی وفنی سرمائے سے عبارت ہے۔'' ۵

ان سب نظریات کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ تہذیب اپنے اندر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ ہر ایک نے اسے ذاتی طور پر پیش کیا ہے مگر اجتماعی طور پر یہ سب باتیں تہذیب کے

ہی زمرے میں آجاتی ہیں۔ دراصل سماج کے ہر چیز میں تقریباً اچھائی اور شائستگی پائی جاتی ہے۔ کسی بھی قوم کا رہن سہن، بات چیت، رسم و رواج اور بود و باش وغیرہ مہذب ہوتے ہیں اب یہ بھی ایک قوم کے افراد پر منحصر ہے کہ وہ کسے مہذب اور کسے غیر مہذب سمجھے۔ اسی لئے مختلف قوموں کی تہذیبیں منفرد شناخت اختیار کرتی ہے۔ تہذیب ہمارے رویوں کو مذہب، اخلاقیات، شادی بیاں، سائنسی، خاندانی منصوبہ اور جسم فروشی وغیرہ کی طرف رُخ کرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ ذاتی جائیداد، بنیادی حقوق، نمائندہ حکومت، رومانس اور جسم فروشی تہذیبی اقدار سے تاثر لیتی ہیں۔ دوسروں کو سمجھنے، نجات حاصل کرنے، اساتذہ اور بزرگوں کی تابع داری، شوہر سے وفاداری اور وطن سے محبت وغیرہ تہذیب سے متعین ہوتے ہیں۔ ذریعہ معاش کا تعین بھی تہذیب طے کرتی ہے کہ ہم مستقبل میں کون سا پیشہ یا ذریعہ معاش اختیار کریں گے۔ مثال کے طور پر آج سماج میں ٹیکنالوجی کی مانگ زیادہ ہے تو تہذیب میں ایک نیا رجحان پیدا ہوتا ہے اور یہ تہذیب ہی ہمیں ان سب چیزوں کی طرف راغب کرتی ہیں ورنہ انسان اگر اپنی من مانی کرے تو سماج اور تہذیب سے اس کا رشتہ کٹ جائے گا۔ کچھ لوگ ذاتی طور پر اپنی تہذیبی رجحانات کی مخالفت کرتے ہیں، لیکن انھیں ہمیشہ اپنی تہذیب کے دائرہ کار میں ہی رہنا پڑتا ہے۔ صرف چند ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس دائرے سے نکل جاتے ہیں۔ تہذیب کسی بھی شخص کے برتاؤ کے لئے ہدایات دیتی ہے یا اسے روک دیتی ہے اور حسب خواہش رویے اپنانے کے لئے ذرائع مہیا کرتی ہے۔ درحقیقت ہم جو نظارہ کرتے ہیں جو خواب دیکھتے ہیں، خواہش، کام، شادی اور تفریح وغیرہ اپنی تہذیب کے مطابق کرتے ہیں۔ تہذیب ہی انسانی توانائیوں کو کنٹرول کرتی ہے اور آزادی دیتی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان تہذیب کا قیدی ہے۔ انسان کی شخصیت کو بنانے میں تہذیب اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تہذیبی ماحول کے بغیر کسی شخص میں انسانی صفات پیدا نہیں ہوسکتیں۔ یہ تہذیب ہی ہے جو انسان کو گروہی زندگی میں جینے اور زندہ رہنے کے قرینے سکھاتی ہے۔ ڈاکٹر منصور احمد منصور تہذیب کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''تہذیب ایک سماجی حقیقت ہے اور سماج میں ہی اس کی نشونما ہوتی

ہے۔تہذیب اور سماج کا آپس میں گہرااور قریبی تعلق ہے۔ظاہر ہے کہ
ہماری طریق گفتگو، ہمارا لباس، ہمارا طرزِ زندگی، ہمارے معیارِ
اخلاق، ہمارے جمالیاتی احساسات وہی ہوتے ہیں جو ہماری جماعت
کے ہیں لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ تہذیب اور معاشرہ ایک ہی
چیز کے نام ہیں۔'' ۶

غرض تہذیب کے تعلق سے جو بھی نظریات پیش کئے گئے ہیں وہ تمام نظریات تہذیب کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن ان میں کوئی بھی نظریہ تہذیب کی مکمل تصویر پیش نہیں کرتا ہے۔یعنی تہذیب کسی مخصوص نظریہ کی محتاج نہیں ہے۔اس میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن کا تعلق انسانی سوچ اور ذہنی کاوش سے ہے۔علمی جدوجہد انسان کے احساسات ومحسوسات اور جذبات کا تعلق بھی تہذیب سے ہیں۔گویا تہذیب زندگی کی تمام وسعتوں اور بودوباش پر محیط ہے۔تہذیب انسانی زندگی کے ہر پہلو سے وابستہ ہے۔مختصر لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کا پورا نظام تہذیب کے زمرے میں آجاتا ہے۔اس میں مادی، سماجی، ذہنی، روحانی اور مذہبی میلانات سب چیزیں شامل ہیں۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ ثقافت کیا ہے۔دراصل یہ دونوں اصطلاحات اُردو زبان میں ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ان کا آپس میں گہرا رشتہ ہے ان دونوں اصطلاحات کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل امر ہے۔یہ مسئلہ آج بھی زیرِ غور ہے البتہ یوں کہے کہ ثقافت،تہذیب سے محدود معنوں میں مراد لیا جاسکتا ہے بلکہ ثقافت،تہذیب کا ہی ایک پہلو ہے اور تہذیب،ثقافت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

'' کلچر کے لئے عربی اور اُردو میں ثقافت کی اصلاح عصرِ حاضر کی
پیداوار ہے۔اگر چہ لغوی طور پر ثقافت کا مادّہ اپنی مختلف صورتوں میں
قدیم عربی لٹریچر، نیز قرآنِ مجید میں بھی ملتا ہے۔
اُردو میں مخصوص ثقافت کی اصطلاح کے ساتھ ایک عبرتناک حادثہ پیش

آیا ہے کہ وہ اپنے معانی کی رفعت و وسعت سے محروم ہوکر محدود و متبذل مفہوم میں استعمال ہونے لگی اور مدرسہ سے نکل کر نگار خانے میں چلی گئی ہے اور اس سے عموماً رقص وسُرور، تمثیل نگاری، فنکاری وغیرہ مراد لی جاتی ہے۔ اس طرح اس کی معنوی جولانگاہ سمٹ کر فنونِ لطیفہ تک محدود ہوگئی ہے۔'' ۷

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ثقافت، کلچر کا اُردو ترجمہ بتاتے ہیں کیونکہ کلچر وسیع معنی و مفہوم رکھتا ہے جبکہ تہذیب اصطلاح کلچر کے زیادہ قریب ہے اور اکثریت کا بھی ماننا یہی ہیں۔ پروفیسر ممتاز حسین ثقافت اور تہذیب و تمدن کی توضیح و تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں کلچر کے لفظ کو اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ دراصل اس کا جو مقصود ہے، اس کا ہم معنی لفظ اُردو زبان میں نہیں ہے، ثقافت کے لفظ کو اب اُردو زبان میں استعمال کیا جارہا ہے، لیکن یہ ایسا کچھ غیر مانوس لفظ ہے کہ اس سے ذہن میں کوئی تصویر اُبھرتی ہی نہیں، مجبوراً تہذیب اور تمدن کے لفظوں کی طرف تاکنا پڑتا ہے۔'' ۸

اُردو زبان کے لغات میں بھی تہذیب و ثقافت کے مفاہیم کے تعین اور حدود و امتیازات کی صورتِ حال بہت زیادہ ابہام کا شکار ہے۔ اس طرح تہذیب و ثقافت کے مفاہیم متعین کرنے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ''اردو انگریزی لغت مجتہدی'' میں تہذیب کے معنی اس طرح سے ہیں:

''تہذیب:۔ civilization(as qadim misr ki tehzib thecivilization of ancient Egypt; yuropi tehzib European civilization);culture;(as mashriqi tehzib oriental culture;magribi tehzib western

culture).''۹

علمی اردو لغت (جامع) میں تہذیب کے معنی دیکھئے:

''تہذیب :۔ پاک کرنا، اصلاح کرنا۔ (2) اصلاح۔ درستی۔ آراستگی۔ (3) شائستگی۔خوش اخلاقی۔ انسانیت ۔ (4) سوسائٹی کے اصول اور رسم ورواج (انگریزی لفظ Culture کا ترجمہ۔)''۱۰

جامع فیروز اللغات میں ثقافت کے معنی درج ذیل ہے:

''ثقافت :۔عقلمند ہونا، نیک ہونا۔(2) تہذیب۔کلچر''۱۱

انگریزی لفظ کلچر کا بھی لغات میں یہی صورتِ حال ہے۔اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری میں کلچر کے معنی اس طرح دیئے گئے ہیں:

'' Culture:اسم :(الف) فنون اور دیگر ذہنی کمالات ، کارنامے، کرشمے بحیثیت مجموعی، تہذیب وثقافت (A city lacking in culture مظاہر ثقافت سے عاری شہر)(ب) خوش ذوقی ، نفاست پسندی، ذہنی مشاغل کا فروغ، اعلی دماغی (A person of culture شائستہ انسان)2:مخصوص دور کے رسم ورواج، تہذیب اور کارنامے (Studied Chinese Culture چینی ثقافت کا مطالعہ کیا۔)'' ۱۲

سٹنڈاڈ انگلش اردو ڈکشنری میں اس کے معنی یوں ہے:

Culture:۔ 1۔ زراعت،فلاحت ، کاشت، پرورش، پیداواری، کھیتی۔ 2۔ جراثیم پرورده، مغل جراثیم۔ 3 تہذیب ، تربیت، ترقی۔ 4۔کاشت کرنا۔ بونا، فصل لگانا (نیز استعارتاً)۔''۱۳

خلیفہ عبدالحکیم تمدن کو سویلزیشن اور کلچر کو تہذیب قرار دیتے ہیں:

''تہذیب کو بعض اوقات تمدن کا مترادف خیال کیا جاتا ہے۔فکر میں وضاحت پیدا کرنے والوں نے ان دو تصورات کو خلط ملط نہیں کیا،

اگرچہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا بھی آسان کام نہیں۔
۔۔۔۔اکثر مصنفوں نے ان کو ہم معنی سمجھ کر اپنی مرضی کے مطابق کبھی یہ
لفظ استعمال کر دیا اور کبھی وہ ہماری زبان میں تمدن سویلزیشن کا قریب
ترجمہ ہے اور کلچر کا مفہوم تہذیب کا لفظ بہتر ادا کرتا ہے۔'' ۱۴

پروفیسر عتیق اللہ اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''بعض حضرات کلچر کا ترجمہ تہذیب کے بجائے ثقافت کرتے ہیں۔
عربی میں ثقافت کا مصدر ثقف ہے۔ثقف کے معنی فہیم ہونے اور دانش
مند ہونے کے ہیں۔اس لحاظ سے تہذیب، ثقافت کی نسبت کلچر کے معنی
کے زیادہ نزدیک اور مرجع ہے۔'' ۱۵

اس طرح عتیق اللہ نے تہذیب اور کلچر کو معنوی سطح پر ایک دوسرے کے قریب قرار دیا ہے۔انگریزی زبان میں Civilization اور Culture دو ایسی اصطلاحات ہیں جن میں بڑی حد تک اصطلاحی اور معنوی سطح پر بہت زیادہ پیچیدگی، الجھاؤ اور ابہام پایا جاتا ہے۔اہل مغرب میں بھی اس گھتی کو سلجھانے کے لئے بڑی بڑی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔

انگریزی کے ایک مشہور ناقد ریمنڈ ولیمس اپنی کتاب *Keywords: A Vocabulary of Culture and Society* میں کلچر کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''Culture is one of the two or three most complicated words in the English language. This is so partly because of its intricate historical development, in several European languages, but mainly because it has now come to be used for important concepts in several distinct intellectual disciplines and in

several distinct and incompatible systems of thought."١٦

اس کے علاوہ ولیمس Civilization کے وجود میں آنے اور اس کا کلچر کے ساتھ باہمی تعلق کا بھی تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

"The independent noun civilization also emerged in mC18; its relationship to culture has been very complicated (cf. CIVILIZATION and discussion below).There was at this point an important development in German: the word was borrowed from French, spelled first (1C18) Cultur and from C19 Kultur. Its main use was still as a synonym for civilization: first in the abstract sense of a general process of becoming 'civilized' or 'cultivated'; second, in the sense which had already been established for civilization by the historians of the Enlightenment, in the popular C18 form of the universal histories, as a description of the secular process of human development."١٧

اسی طرح UK Essays.Com بھی انگریزی زبان میں کلچر اور سویلیزشن کا ایک دوسرے کے مترادف ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"The usage of 'culture' and 'civilization' in various languages has been confusing.

Webster's Unabridged Dictionary for English defined both 'culture' and 'civilization' in terms of the other. 'Culture' was a particular state or stage of advancement in civilization. 'Civilization' was called advancement or a state of social culture. In both popular and literary English, they were often treated as near synonyms, though 'civilization' was sometimes restricted to 'advanced' or 'high' cultures (Kroeber & Kluckhohn, 1952: 13)." ۱۸

جس طرح انگریزی زبان میں یہ اصطلاحات پیچیدگی، الجھاؤ اور ابہام کا شکار ہیں، اسی طرح اُردو زبان میں بھی ان اصطلاحات (تہذیب وثقافت) کا یہی عالم ہے۔

نبیل احمد اپنے مقالے میں ثقافت کا ترجمہ کلچر اور تہذیب کا ترجمہ سویلزیشن بتا کر ان دونوں اصطلاحات کو معنوی سطح پر الگ الگ گردانتے ہیں وہ کلچر میں غیر مادّی اشیاء کو شامل کرتے ہیں جس میں شعروادب، فنون لطیفہ، مصوری، رقص، عقائد، زبان، رسوم ورواج، عادات واطوار، روایات، فکر وفلسفہ، آدرش، آرزوئیں، جذبات، محسوسات وغیرہ آتے ہیں اور تہذیب میں مادّی اشیاء شہری زندگی، طرز تعمیر، ہتھیار، طبی حالات، آلات وآوزار، ظروف سازی، میشنری، صنعتی وغیرہ کو شامل کرتے ہیں لیکن وہ اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اوائل انیسویں صدی میں کلچر اور سویلزیشن ایسے مبحث مغرب میں بھی ابہام کا شکار ہے۔ ان کی مختلف المعانی تعبیرات میں خاصی پیچیدگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان اصطلاحات کے معنوی حدود کے تعین میں وہاں بھی خاصی مشکلات رہی ہیں۔ یہی صورت حال اُردو زبان میں بھی

موجود رہی ہے۔ انگریزی سے کلچر اور سویلزیشن ایسی اصطلاحات جب اُردو میں ترجمہ کی گئی تو تراجم پر اتفاق نہ ہو سکا۔ کسی نے کلچر کا ترجمہ اُردو میں 'ثقافت' کیا تو کسی نے سویلزیشن کا تہذیب ترجمہ کیا، کسی نے سویلزیشن کا ترجمہ تمدن کیا۔ کسی نے تہذیب کے معنی متعین کرنے کے لئے اسے کلچر کا مترادف تصور کیا۔ اس طرح اُردو میں ان اصطلاحات کے معنی کی لغوی سطح اور اصطلاحاتی سطح پر اُردو میں خاصے مسائل کا سامنا ہے۔ لغوی سطح پر لفظ کی ایک حیثیت اور صورت ہے جب وہی لفظ استعارتی علامتی اور اصطلاحی و تخلیقی سطح کو پہنچتا ہے تو اس کے معنی کچھ اور صورت اختیار کر جاتے ہیں۔'' ۱۹

اس طرح تہذیب و ثقافت کا جائزہ لینے کے بعد جو صورتِ حال درپیش آتی ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تہذیب و ثقافت کے خواہ مغربی مفکرین ہوں یا مشرقی دانش ور۔ ان میں سے بعض تہذیب و ثقافت میں کوئی امتیاز قائم نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے حدود متعین کرتے ہیں بلکہ دونوں اصطلاحات کو ہم معنی قرار دیتے ہیں اور بعض ناقدین تہذیب اور ثقافت کے الگ الگ مفاہیم کا تعین بھی کرتے ہیں۔ جس سے ان دونوں اصطلاحات کو الگ کرنے میں ایک طرح کا جھول پیدا ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ دونوں اصطلاحات ایک دوسرے کے مترادف ہیں اور انھیں معنوی سطح پر الگ کرنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔

الغرض تہذیب و ثقافت ایک ایسی اصطلاح ہے جو اپنے بطن میں بڑی وسعت رکھتی ہے۔ یہ ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے انسانی فکر و نظر اور میلانات و رجحانات کا ایک نہ ختم ہونے والا تفاعل (نظام) ہے۔ یہ سماج کی نہج پر مقرر شدہ عادات و اطوار کا ایک ایسا نظام ہے جو تاریخی طور پر اخذ شدہ میلانات و رجحانات، تعمیر ذات کے اجتماعی نظام سے متعلق ہے۔ اس میں اقوام کا اجتماعی و تاریخی شعور بھی شامل ہے جس کے اثرات تمام انسانی سرگرمیوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ کسی سماج کے نظریات، عقائد، نظامِ حکومت، رسومات، قوانین، ضابطوں، فنونِ لطیفہ، مذہب، آرٹ، زبان و ادب

کسی بھی تہذیب وثقافت کا مجموعی خاکہ مرتب کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔انسان کی تمام ذہنی کارفرمائیاں، عملی زندگی کے تفاعل، افراد کی کسی معاشرے میں اجتماعی زندگی، روحانی سرگرمیاں تہذیب وثقافت کے مدارج ومراحل کو ایسی شکل دیتے ہیں جس سے ایک تہذیب وثقافت دوسرے تہذیب وثقافت سے امتیازات قائم کرسکتی ہے۔ایک قوم یا ایک ملک کا جغرافیائی پس منظر بھی تہذیب وثقافت کے لئے نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔کسی بھی علاقے کا جغرافیہ مختلف ہوتا ہے جس کے اثرات اس علاقے کی تہذیب وثقافت پر بھی پڑتے ہیں اور وہاں کی تہذیب وثقافت اپنی ایک الگ شناخت اختیار کرلیتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ مذہب کا تعلق بھی انسانی زندگی سے ہوتا ہے۔مذہبی افکار بھی تہذیب وثقافت پر اپنے گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔انسانی سماج تہذیب وثقافت کے بغیر ارتقائی منازل طے کرہی نہیں سکتا ہے۔متمدن معاشروں کی پہچان ہی تہذیب وثقافت سے مشروط ہے۔انسانی معاشروں میں تہذیب وثقافت کا اتنا بڑا اور اہم کردار ہوا کرتا ہے کہ انوع قسم کے انسانوں میں یگانگت پیدا ہوتی ہے۔درحقیقت انسان کے بغیر تہذیب وثقافت کے کوئی معنی نہیں اور تہذیب وثقافت کے بغیر انسان کی کوئی وقعت اور حیثیت نہیں۔تہذیب وثقافت انسانی سماج میں انسان کو دیگر موجودات سے امتیاز عطا کرتی ہیں۔تہذیب وثقافت انسانی سماج میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ترنم ریاض۔چشمِ نقشِ قدم(تنقیدی وتحقیقی مضامین)۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔۲۰۰۶۔ص۔۲۰

۲۔حامد حسن قادری۔بحوالہ داستانِ تاریخ اُردو۔آفیسٹ پریس پرنٹرز، دہلی ۔۲۰۰۷۔ص۔۳۵

۳۔سبط حسن ۔پاکستان میں تہذیب کاارتقاء۔دانیال،کراچی ۔۲۰۰۹۔ص۔۱۷۔۱۸

۴۔ڈاکٹرمشتاق احمد وانی۔تقسیم پاکستان کے بعداُردوناولوں میں تہذیبی بحران ۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔۲۰۰۲۔ص۔۲۸

۵۔ڈاکٹرمشتاق احمد وانی۔تقسیمِ پاکستان کے بعداُردوناولوں میں تہذیبی بحران ۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔۲۰۰۲۔ ص۔۲۳۔۲۴

۶۔ڈاکٹرمنصوراحمد منصور۔اُردوافسانے میں ہندوستانی تہذیبی عناصر۔مرکزادبِ اُردو،لکھنؤ۔۱۹۸۸۔ص۔۳۸

۷۔ڈاکٹرنصیراحمد ناصر۔اسلامی ثقافت ۔تاج کمپنی، دہلی ۔۱۹۸۷۔ص۔۴۲۔۴۳

۸۔ پروفیسرممتاز حسین ۔نقدحیات ۔الہ آباد پبلیشنگ ہاؤس،الہ آباد۔۱۹۵۰۔ص۔۱۷

۹۔مرتبہ یعقوب میراں مجتہدی۔اُردوانگریزی لغت مجتہدی۔Volume:I(اتاج)۔حیدرآباد۔۲۰۰۷۔ص۔۸۰۶

۱۰۔وارِث سربندی۔ایم۔اے۔علمی اُردولغت(جامع)۔عملی کتاب خانہ،اُردوبازار، لاہور۔۱۹۸۳۔ص۔۴۷۸

۱۱۔جامع فیروزالغات۔مرتب مولوی فیروزالدین۔ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۔۲۰۰۶۔ص۔۴۳۷

۱۲۔مرتب ومترجم۔شان الحق حقی۔اوکسفرڈ انگلش اُردوڈکشنری۔اوکسفرڈ یونیورسٹی۔ پریس ۔۲۰۰۳۔ص۔۳۶۳

۱۳۔ The Standard English Urdu Dictionary. Edition by- Baba-e-Urdu. Dr. Abdul Haq. Anjumane Taraqqi-e-Urdu, New Delhi-1985, Page-257)

۱۴۔خلیفہ عبدالحکیم۔ثقافت کیا ہے۔ادارہ اسلامیہ،لاہور۔۲۰۱۲۔ص۔۱۶

۱۵۔پروفیسرعتیق اللہ۔ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فراہنگ۔جلداول۔اُردومجلس، دہلی ۔۱۹۹۵۔ص۔۵۴۶

۱۶۔ Williams, Raymond. Keywords: A vocabulary of culture and society. New York: Oxford University Press. 1976. Print. p.87

۱۷۔ Williams, Raymond. Keywords: A vocabulary of culture and society.New York: Oxford University Press. 1976. Print.p.89

۱۸۔ UK Essays. "Understand The Two Concepts Culture And Civilization Sociology Essay" http://www.ukessays.com/essays/sociology/understandthetwoconcepts cultureandcivilizationsociologyessay.php# 4/21/2015 Website.p.5

۱۹۔نبیل احمد۔اُردو تنقید میں تہذیب وثقافت کے مباحث (تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ)۔شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج، لاہور، پاکستان۔۲۰۱۳۔ص۔۹۳

باب دوم
کشمیر کا تاریخی پس منظر

کشمیر کا تاریخی پس منظر

کشمیر کا علاقہ تاریخی اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل ہیں۔ قدیم زمانے سے یہاں کے تاریخی نمونے ملتے ہیں۔ اس کے تعلق سے محمد امین خان نے پیروس جیروس کی یہ صراحت لکھی ہے:

''اس بات نے دوسرے مطالعہ کرنے والوں کی طرح مجھے بھی متعجب کیا ہے کہ کشمیر کے ماضی کے متعلق اتنی معلومات موجود ہیں۔ ریاست کی جس میں جموں و کشمیر دونوں شامل ہیں، تاریخ گذشتہ کی تحریروں و دستاویزوں اور دیگر ذرائع کا تقریباً ایک مکمل اور مربوط سلسلہ موجود ہے۔ برصغیر پاک و ہند کا کوئی اور حصہ اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔''[1]

اس بات سے مشہور مورخین والٹر لارنس اور ایم۔اے۔سٹین (M.A.Stein) بھی متفق ہیں کہ وادی کی تاریخ کے خدوخال تیار کرنے کے لئے اتنی دستاویزات موجود ہیں۔ جس سے وادی کے عوام میں حقیقی تاریخی شعور کی موجودگی کا بجا طور پر احساس ہوتا ہے۔

وادی کشمیر دراصل ابتداء میں ایک بڑی جھیل کی شکل میں موجود تھی۔ جس کو ''ستی سر'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ پھر یہ جھیل کیسے سوکھی اور کس طرح وادی کی صورت اختیار کرگئی اس کے تعلق سے متعدد نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ بیشتر لوگ کشپ رشی پر مشتمل قصّے کہانیوں کو ترجیح دیتے ہیں جس کا بنیادی ماخذ ''نیل مت پران'' (نیل مت پوران) ایک کتاب ہے۔ کلہن پنڈت اپنی کتاب ''راج ترنگنی'' میں لکھے ہیں:

''زمانہ سابق میں ابتدائے کلپ سے لیکر وہ زمین جو ہمالیہ کے دامن

میں واقع ہے ابتدائی چھ مسنوؤں کے عہد میں پانی سے ڈھپی ہوئی تھی اور یہاں ستی سرنامی جھیل واقع تھی۔اس کے بعد جب موجودہ ساتویں منوویو سوت کا زمانہ آیا تو پرجاپتی کشپ نے دورہن (برہما)اوپیندر(وشنو) رودر(شو) کی رہبری میں دیوتاؤں سے مدد حاصل کر کے جلودبھوراکیش کو جواس جھیل میں رہتا تھا مرواڈالا اوراس زمین کو جو جھیل کے باعث رُکی ہوئی تھی کشمیر کے نام سے آباد کیا۔'' ۲؎

اس طرح اور بھی کئی دیو مالائی قصے کہانیوں کو کشمیر کے وجود میں آنے کے تعلق سے پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ تاریخی اعتبار سے اس طرح کی باتوں کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔اس لئے ہمیں ماہر ارضیات کی رائے سے متفق ہونا پڑتا ہے کیونکہ یہی رائے مستند اور اطمینان بخش ہے۔ ماہر ارضیات کے مطابق کشمیر چاروں طرف پہاڑوں سے گھیرے ایک بہت بڑی جھیل تھی۔ پھر ایک زبردست زلزلہ آنے کی وجہ سے اس جھیل کے چاروں طرف سے گھیرے پہاڑوں میں دراریں ہوگئی۔ یہ دراریں شمال کی جانب سے اتنی بڑگئی کہ سارے پانی کا نکاس وہاں سے ہوگیا اور وادی کشمیر وجود میں آئی۔ جوں جوں زمین خشک ہوتی گئی تو لوگ وہاں آباد ہوتے گئے۔ابتداء میں لوگ اونچی اونچی پہاڑی جگہوں پر آباد ہونے لگے جو پہلے وجود میں آئے تھے۔اسی بناپر ماہر ِارضیات اور ماہرِ آرکیاولاجی (A.H.Dani اور H.D.Sankalia) کو پہلگام کے اوپری علاقے وادی لِدر میں انسانی زندگی کے پہلے نمونے ملے ہیں۔ واقعی کشمیر کے اردگرد جھیل کے نیچے کی تہوں میں آتشی عمل چلتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے کشمیر میں کئی بار زلزلے آتے رہے ہیں اور لوگوں کو کئی طرح کے نقصانات اُٹھانے پڑے ہیں۔

وادی کشمیر کے ایک بہت بڑی جھیل ہونے کا ثبوت ہمیں اس بات سے بھی ملتا ہے کہ وادی میں جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ملتی ہیں جنھیں کشمیری زبان میں ''وڈر'' یا ''اڈر'' کہتے ہیں۔ان پہاڑیوں کی بناوٹ میں مچھلیوں، باجری اور دیگر آبی جانوروں کے نشانات کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ

چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں کشمیر کے میدانی علاقوں میں بھی پائی جاتی ہے اور ابتداء میں لوگ ان ہی پہاڑیوں پر آباد ہوتے تھے۔اس کا ثبوت ''برزہامہ'' کے نشانات سے ملتا ہے جو سرینگر کے قریب ایک اوپری سطح کا علاقہ ہے۔اس جگہ پر لگاتار رہن سہن کے نمونے ملتے رہے ہیں۔ابتدامیں وہاں کے لوگ گھڑوں یعنی غاروں میں رہتے تھے۔اس کے بعد جس قدر پانی خارج ہوتا گیا۔اس قدر زمین خشک ہوتی گئی اور لوگ میدانی علاقوں میں پھیلتے گئے۔ پہلے صرف کچھ ہی مہینوں کے لئے لوگ رہ پاتے تھے۔بعد میں موسمی حالات سازگار ہونے سے پورے سال کا گزر بسر کرنا مناسب ہوا۔

کشپ رشی سے متعلق قصے کہانیوں اور اس کی کرامات کا ذکر ہندوؤں کی بہت پرانی کتابوں میں ملتا ہے۔جن میں کلہن پنڈت کی کتاب ''راج ترنگنی'' بھی شامل ہے۔کلہن نے اپنی اس مشہور کتاب کو۱۲۴۹۔۵۰ میں مکمل کیا۔تاریخ کے ماہرین کا ماننا ہے کہ اس کتاب میں کلہن نے اپنے عہد سے قبل کے حالات اور واقعات ''نیل مت پران'' کے قصے کہانیوں سے لئے ہیں۔لیکن اس کتاب میں کلہن جوں جوں اپنے عہد کی جانب آتا گیا۔اتنا ہی اس کتاب کے تاریخی واقعات مستند ہوتے گئے۔ساتویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کی تاریخ اس کتاب کی مستند ترین تاریخ تصور کی جاتی ہے۔جبکہ اس سے پہلے والے حصّے پر مورخین نے بہت شکوک وشبہات پیش کئے ہیں۔

دیومالائی قصے اور کہانیوں کے مطابق ''ستی سر'' نامی اس جھیل میں ایک شیطان نما جن رہتا تھا جس کا نام ''جلود بھاوا'' تھا۔جو باہر سے آنے والے رشیوں اور عبادت گزاروں کو اس جگہ پر آنے سے روکتا تھا۔پھر کشپ رشی نے دعا کی کہ یہ جگہ اس ظالم دیو سے آزاد ہوجائے۔اس کی دعا قبول ہوگئی اور برہمانے وشنو کو حکم دیا کہ اس دیو کو مار ڈالو۔چونکہ یہ دیو پانی میں غائب ہوجاتا تھا۔اس لئے پانی کو نکالنے کے لیے ''ستی سر'' میں ایک طرف چھید کرنا پڑا۔جہاں سے یہ چھید کیا گیا۔اُس جگہ پانی نے ایک بڑا موڑ لے لیا جس کو کشمیری زبان میں ''ور'' کہتے ہیں۔اس لئے اس جگہ کا نام ''ورہ مولا'' پڑا۔جواب ''بارامولہ'' کے نام سے مشہور ہے پھر ''جھلود بھاوا'' مرنے کے بعد یہ جگہ کشپ رشی نے آباد کی اور اسی کے نام پر اس جگہ کا نام ''کشپ مر'' پڑا۔جو ہوتے ہوتے کشپ مر سے کشمیر میں

تبدیل ہوگیا۔

بعض مورخین کے مطابق جھلود بھاوا کوئی دیو یا ظالم نہیں تھا بلکہ وہ کشمیر کا رہنے والا آبائی شخص تھا۔ آریائی لوگ باہر سے آکر اس کو تنگ کرتے تھے۔ جب یہ لوگ اس کو حراست میں نہیں لا پائے تو ان لوگوں نے ایک بڑی لشکر باہر سے لاکر جھلود بھاوا کو مار ڈالا اور اس طرح آریا نسل کی پہلی پود کشمیر میں آباد ہوگئی۔

اب یہ تو واضح ہوگیا کہ کشمیر 'ستی سر' نامی ایک گہری جھیل تھی۔ جس کا پانی بارہ مولہ کی طرف سے خارج ہوگیا اور نتیجے میں وادی کشمیر وجود میں آئی۔ اس کا نام کشمیر کیسے پڑا اس میں بھی کئی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ جو درج ذیل ہے:

> ''تاریخ کے عمیق مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جھیل ستی سر جس پر ستی جی شکتی (قدرت) جی مہاراج سیر کیا کرتی تھیں۔ جھیل ستی سر ان کے نام سے ہی موسوم ہوئی۔ اس علاقہ کی زمین کو خشک کرنے کے لئے پانی کا اخراج لازمی تھا۔ جس کو کیشپ رشی نے بارہ مولا کے راستے خارج کر کے آباد کیا۔ اور یہ جگہ کیشپ سر کہلانے لگی۔ یعنی کیشپ رشی کا علاقہ جو کیشپ میر بنا جو کشمیر بننے کا پیش خیمہ تھا۔ بعد ازاں چونکہ قبیلہ پشاج پاکش، کاش اور کاش وغیرہ کے لوگ آباد ہوئے۔ اس لئے ممکن ہے کہ کشمیر کا پہلا جز کش انہیں سے ماخوذ ہوکر میر کے معنی پہاڑی یا وادی کے ہیں میر کے دوسرے معنی پہاڑی علاقہ سے گھیری ہوئی ہونا ہے۔ یہ جگہ پہاڑی علاقہ سے گھیری ہوئی تھی۔ اس لئے اس سر زمین نے میر کہلانا شروع کیا اور دوسرے لوگوں نے جو لوگ اس پر قابض تھے اس جگہ کو ان کا علاقہ تصور کرتے ہوئے ان کے نام کے آگے میر کا اضافہ کر دیا۔ کیشپ مر کا نام ذہنوں سے خارج ہوکر رہ گیا۔ پہلے کاش میر بنا جس کا مقصد یہ تھا کہ کاش لوگوں کا حلقہ یا وادی اس طرح کشن میر جس

کے معنی کشن کی وادی۔ کاش میر سے ''ا'' اور کشمیر سے ''ن'' خارج ہو کر
صرف کشمیر رہ گیا۔''۳

''کسمیر پراکرت زبان کا لفظ ہے۔ کسی نہر، کھائی یا خندق کو کہتے ہیں۔
اور میر پہاڑ کو، گویا کسمیر نام ہے ایک ایسی کھائی کا جس کے دونوں
جانب پہاڑ ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ کشمیر کی وادی ایک لمبی کھائی کی
شکل میں موجود ہے۔ جس کی لمبائی ۸۴ میل اور چوڑائی ۲۰ سے لیکر ۲۵
میل تک ہے۔''۴

''ماہرین جغرافیہ کے نزدیک لفظ کشمیر کو مروج ہوئے تقریباً ڈھائی ہزار
سال ہو چکے ہیں۔ اس کا قدیم نام ستی سر یعنی بلند تالاب تھا۔ ستی سر سے
کشمیر کا نام تجویز ہوا۔ کا پانی کو کہتے ہیں اور سمیرا ہوا کو۔ پراکرت کے ان
دونوں لفظوں کے باہم ملاپ سے کاسمیرا یا کشمیرا یا کشمیر کی ترکیب وجود
میں آئی، اور اس سے مراد وہ زمین ہے، جہاں سے ہوا کے ذریعہ پانی
نکالا گیا ہو۔ لفظ کشمیر کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ پراکرت میں 'کس' نہر یا
ندی کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ پنجابی میں بھی ندی اور نالے کے لئے 'کسی' کا
لفظ مرّوج ہے۔ میر کا مطلب ہے پہاڑ۔ اس تعبیر کے مطابق کسمیر یا
کشمیر وہ ندی یا نہر ہے، جو پہاڑ سے نکالی گئی ہو۔''۵

بہر حال کشمیر تو کشمیر ہے۔ کشمیری زبان میں اس کو کشیر کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مورخین نے اور بھی کچھ نظریات اس تعلق سے پیش کئے ہیں لیکن کتاب کی تنگ دستی کی وجہ سے ہم ان ہی چند نظریات پر اکتفا کر کے کشمیر کے تاریخی پس منظر کو آگے بڑھائیں گے۔

مورخین کا کہنا ہیں ۲۴۵۰ قبل مسیح سے کشمیر کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔ تب سے لیکر ۱۲۳۹ء تک اکیس ہندو خاندانوں کے باون راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی ہے۔ جن میں صرف پینتیس (۳۵) کے حالات کا پتہ تاریخی کتابوں میں ملتا ہیں۔ چونکہ اب میرا مقصد کشمیر کے تاریخی پس منظر کو

مختصراً ایک باب کے طور پر پیش کرنا ہے۔اس لئے اختصار کے ساتھ چند اہم راجاؤں کا ذکر کیا جائے گا۔

راجہ آدو گونند:- کہا جاتا ہے، یہ کشمیر کا پہلا راجہ گزرا ہے۔جو جموں کے راجاؤں میں سے تھا۔بعض مورخین کا کہنا ہیں وہ متھرا کی اولاد میں سے تھا۔اس نے سترا(۱۷)برس کشمیر پر حکومت کی ہیں۔اس کے بعد اس کا بیٹا راجہ دمودر تخت نشین ہوا۔دمودر لڑائی میں قتل ہو گیا، پھر اس کی رانی جشومتی نے حکومت سنبھالی۔جشومتی کے بعد اس کا بیٹا بال گونند حکمران بنا۔اس نے چالیس سال حکومت کی۔ بالاخر ہری دیو کے ہاتھوں قتل ہوا اور ہری دیو کے حکمران بننے کے ساتھ حکومت پانڈو خاندان کے ہاتھ میں آئی۔اس خاندان کے(۲۲)راجاؤں نے ایک ہزار سال تک کشمیر پر حکومت کی۔اس خاندان کا آخری راجا سندرسین تھا۔جس کے عہد میں زلزلہ آنے کی وجہ سے سیلاب آ گیا اور پورا شہر ڈوب گیا۔اس طرح پانڈوؤں کا راج ختم ہوا۔

مہاراجہ اشوک:- پانڈوؤں کے بعد راجہ لو تخت پر بیٹھا۔کہا جاتا ہے کہ راجہ لو نے وادی لولاب بسایا تھا۔اسی کے خاندان سے مہاراجہ اشوک پیدا ہوا تھا جو اپنے عہد کا عظیم بادشاہ گزرا ہے۔اس نے ہندوستان میں بدھ مت کو رواج دیا۔اس کے عہد میں عوام کو اپنے عقیدے اور رسم و رواج پر چلنے کی پوری آزادی دی گئی۔کہا جاتا ہے اشوک نے ہی موجودہ سرینگر شہر آباد کیا تھا۔لیکن اس پر سارے مورخیں متفق نہیں ہے کہ یہ اشوک وہی اشوک ہے جو موریا خاندان کا اشوک تھا بلکہ وہ کشمیر کے ہی راجاؤں میں سے تھا۔کلہن پنڈت نے بھی اپنی کتاب میں اس کے بیٹے کا ذکر کیا ہے جس نے کشمیر پر حکومت کی۔لیکن اس کے بارے میں ہندوستان کی تاریخ میں کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں شہر سرینگر بسانے کا سہرا بھی بہت سارے تاریخ دانوں نے راجا پرورسینہ (Parvarsena) کو دیا ہے۔جو کشمیر کا ہی ایک راجہ تھا۔

للتادتیہ:- للتادتیہ اپنے دور کا مشہور ترین مہاراجہ تھا۔اس نے ۶۹۵ سے ۷۳۲ء تک

کشمیر پر حکومت کی۔ للتا دتیہ کارکوٹ خاندان میں سے تھا۔ اس خاندان سے پہلے کشن خاندان، گونندا خاندان، ہن خاندان، وکر مادتیہ خاندان نے حکومت کی۔ للتا دتیہ نے بہت سے علاقوں کو فتح کیا۔ جموں، کشتواڑ، پونچھ اور راجوری کو اس نے اپنی سلطنت کے ساتھ شامل کرلیا۔ نیک دل حکمران ہونے کے علاوہ للتا دتیہ میں فیاضی فاتح کے اوصاف بھی تھے۔ اس کے دور میں عوام میں کسی قسم کی بے چینی ظاہر نہ ہوئی اور نہ کسی جانب سے تخت کو چھیننے کی کوشش کی گئی۔ اس کا دارالخلافہ پری ہاسپورہ (Parhaspora) میں تھا جہاں پر آج بھی اس شہر کے کھنڈر موجود ہے۔

اونتی ورمن:— کارکوٹ خاندان کے بعد اتپال خاندان کا آغاز ہوا۔ اونتی ورمن اس خاندان کا ایک عظیم حکمران گزرا ہے۔ ۸۵۵ء میں یہ تخت نشین ہوا۔ اس کی خواہش تھی کشمیری عوام سماجی اور تمدنی لحاظ سے بلند ہو۔ اس کے عہد میں وادی کا کثیر حصّہ زیرِ آب چلا آرہا تھا۔ کاشت کاری کے لئے بہت کم حصّہ میسر تھا۔ قحط ہر سال نمودار ہوتا تھا۔ اتفاق سے راجہ کو ایک ذہین انجینئر ''سویا'' کے خدمات حاصل ہوئے۔ بارامولا کے قریب دریائے جہلم میں ملبہ جمع ہوگیا تھا۔ سویا نے اس ملبہ کو نکلوایا اور مختلف طریقوں سے دریا کا پانی خارج کردیا اور دریا کے دونوں کناروں پر بڑے باندھ لگوا دیئے۔ اس طرح زراعت کا رقبہ اور وسیع ہوگیا۔ اونتی ورمن نے سویا میں اس طرح کے وصف دیکھ کر اس کی حوصلہ افزائی کی اور اس بڑے انجینئر کے لئے ایک قصبہ سویا پور کے نام سے آباد کیا۔ جو سویا پور سے آج سوپور کہلاتا ہے۔ اونتی ورمن نے آرٹ اور تعمیرات کی طرف بھی توجہ دی۔ اس نے اونتی پورہ ایک قصبہ آباد کیا اور اس کے قریب دو مندر تعمیر کرائے۔ اونتی ورمن کے بعد کوئی بھی حکمران قابل تعریف نہیں گزرا ہے۔ پریم ناتھ بزاز لکھتے ہیں:

> ''۸۸۴ء میں اونتی ورمن کی موت کے ساتھ کشمیر میں تاریکی کا ایک طویل دور چھا گیا۔ مابعد کے ان تمام حکمرانوں کی تاریخ جو یکے بعد دیگرے ہندو دور بادشاہت کے نابود ہونے تک تخت نشین ہوئے ان کی بدکرداریوں اور شرمناک افعال کا گویا ایک سیاہ نامہ اعمال ہے اور اس

سارے دور میں حسنِ عمل کی ایک حقیر سی بھی جھلک نظر نہیں آتی۔

اس دور میں کوئی ایسا خاصی واقعہ نہیں ملتا جو قابل ذکر ہو۔ البتہ اس زمانے میں ایک طاقتور رانی دیدا کا ذکر ملتا ہے۔ جس نے ۹۰۰-۱۰۰۳ء تک اس ملک میں حکومت کی۔'' ۶ے

دیدا رانی کے متعلق کہا جاتا ہے وہ گندھارا کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور کشم گفت کی بیوی تھی۔ اس نے اپنی دانشمندی سے ایک طویل عرصہ تک کشمیر پر حکومت کی۔

کشمیر میں اسلام کا آغاز:۔ کشمیر میں اسلام کی آمد اور اس کے پھیلاؤ پر بہت ساری کتابیں لکھیں گئیں ہیں اور اُن کا انگریزی سے دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔ جن میں پروفیسر محمد اسحاق خان کی کتاب ''کشمیر اسلام کی جانب(Kasmir's transition to Islam)'' ادبی اور تاریخی حلقوں میں مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ پروفیسر محمد اشرف وانی کی کتاب'' Islam in kashmir'' بھی بہت ہی مستند کتابوں میں سے ہے۔ پروفیسر عبدالقیوم رفیقی کی کتاب''Sufism in Kashmir'' تاریخی اعتبار سے کافی سرائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سارے تاریخ دان اور کشمیر پر کام کرنے والے اسکالروں نے اپنی رائے اس موضوع پر رکھی ہے۔ جن میں عزیز احمد، محبّ الحسن، غلام محی الدین صوفی، رتن لال ہانگلو وغیرہ کے نام قابل ذکر ہے۔ ان سب ادیبوں اور تاریخ دانوں سے ایک متفق رائے نکالنا اگرچہ مشکل ہے لیکن یہ بات وسوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کشمیر میں اسلام کا پھیلاؤ جنوبی ایشیاء کے دیگر علاقوں کے مقابلے میں کافی مختلف رہا ہے۔ کشمیر میں اسلام کے پھیلاؤ کا زیادہ تر رول صوفیاء کرام اور کشمیر کے ریشی سلسلہ کا رہا ہے۔ جن کے سرخیل حضرت شیخ نورالدین ولیؒ عرف نندرشی تھے۔ جنھوں نے اسلام کے لئے نظامِ حیات کو مقامی مادری اور مروجہ زبان میں لوگوں کے دلوں تک پہنچایا۔ چنانچہ سینکڑوں سال گزرنے کے بعد بھی ان کا کلام عقیدت مند شائقین کو آج بھی زبانی یاد ہے۔ کشمیر میں اسلام کی آمد کے تعلق سے مسعودی صاحب لکھتے ہیں:

''تاریخ کے صفحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل کشمیری سماج طبقاتی نظام اور اس کے وحشتناک نتائج کا شکار ہو چکا تھا۔ چند بااقتدار اشخاص کو چھوڑ کر سماج کے تقریباً سبھی طبقے زندگی گزارنے کے بنیادی وسائل سے محروم تھے۔ اسلامی نظام معشیت ان کے لئے ایک زبردست پناہ گاہ تھی جہاں وہ کھل کر آزادی کی فضا میں سانس لے سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی آمد کے ساتھ ہی کشمیری عوام کا ایک کثیر طبقہ اسلامی نظام کے زیرِ سایہ آ گیا۔''[ے]

۱۳۲۰ء میں رینچن شاہ، سلطان صدرالدین کے نام سے کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ بنا۔ رینچن شاہ نے حضرت بلبل شاہ کی تبلیغ دین سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ اس نے کشمیر میں بہت سی عمارتیں تعمیر کرائی۔ بلبل شاہ کی فرمائش پر ایک خانقاہ سرینگر میں تعمیر کرایا اور ایک مسجد بھی بنوائی۔ رینچن شاہ نے دو سال کشمیر پر حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ اسی دوران بلبل شاہ کا بھی انتقال ہو گیا اس کے بعد حضرت امیر کبیر میر سید علی شاہ ہمدانی نے کشمیر میں اسلام کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

سلطان صدرالدین (رینچن شاہ) کی وفات کے بعد پھر سے ایک بار برسراقتدار ہندوؤں کے ہاتھ آیا۔ چھوٹے بڑے سابق راجاؤں، جاگیرداروں اور کوٹارانی کے درمیان جنگیں شروع ہونے کے بعد ادین دیو کو حکمران بنایا گیا اور کوٹارانی کی شادی ادین دیو کے ساتھ ہوئی۔ ادین دیو کو حکومت کے ساتھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے کوٹارانی حکومت کے کاروبار کو خود سنبھالتی تھی۔

شہمیری عہد:- (۱۳۳۹تا۱۵۵۵) ۱۳۳۹ء میں ادین دیو کا انتقال ہو گیا۔ کوٹارانی کے مختلف حربے کرنے کے باوجود حکومت شہمیر کے ہاتھوں میں آ گئی اور کوٹارانی کو شہمیر کے ساتھ شادی کرنی پڑی۔ اس کے بعد کشمیر میں شہمیری خاندان کا وجود عمل میں آیا۔ شہمیر نے حکومت میں نمایاں تبدیلیاں لائی۔ انھوں نے امن وامان قائم رکھنے کے لئے لگان وصول کرنے میں نرمی برتی۔

فوج میں زیادہ تر چک خاندان کے افراد کو بھرتی کیا۔ کیونکہ وہ قد آور اور بہادر مانے جاتے تھے۔ شہمیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایران سے آیا تھا اور بعض کے مطابق وہ سوات سے آیا تھا۔ انھوں نے پانچ سال کشمیر پر حکومت کی۔

شہمیر کے بعد ان کا بیٹا سلطان جمشید ۱۳۴۲ء میں تخت پر بیٹھا۔ جمشید کی تخت نشینی کے بعد ہی علی شیر نے بغاوت کی اور دوسرے ہی سال علاؤالدین کے لقب سے حکمران بن گیا۔ اس کے عہد میں کشمیر قحط سالی کا شکار ہوا۔ شہمیری خاندان کو عروج کی سمت لے جانے والا پہلا بادشاہ علاؤالدین کا بیٹا سلطان شہاب الدین تھا۔ سلطان شہاب الدین کے دورِ حکومت میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کی کشمیر میں آمد ہوئی۔ آپ کی تبلیغ اور عمل کے نتیجے کے طور پر کشمیر میں اسلام بہت تیزی سے پھیل گیا۔ سلطان کے عہد میں گلگت، تبت اور بدخشاں وغیرہ کی تسخیر ایک بڑا کارنامہ ہے۔

شہاب الدین کی جگہ اس کا بھائی سلطان قطب الدین حکمران بنا۔ وہ ایک صاحب علم اور شاعر تھا۔ امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ سے کافی متاثر تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت عبادت گزاری میں صرف کرتا تھا۔ سولہ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۳۹۲ء میں وفات پائی اور صدارت اس کے بیٹے سلطان سکندر بت شکن کے ہاتھ میں آئی۔ اس کا زمانہ اشاعت اسلام کے لئے مشہور ہے۔ اس کے عہد میں امیر کبیرؒ کے فرزند حضرت سید محمد ہمدانیؒ نے آ کر مستقل طور پر کشمیر میں سکونت کی۔ جس سے کشمیر میں بڑی تیزی کے ساتھ اسلام پھیل گیا۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں صرف گیارہ خاندان باقی رہ گئے تھے، جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ سلطان کے دور میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ سلطان نے اپنے علاقے کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے بیٹے کو تحائف کے ساتھ تیمور کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس طرح ان کے تعلقات خوشگوار بن گئے۔ پچیس سال حکومت کرنے کے بعد سلطان نے ۱۴۱۷ء میں وفات پائی اور اس کا بیٹا میر خان علی شاہ کے لقب سے اس کا جانشین ہوا۔ چھ سال نو مہینے تک بادشاہ رہا۔ اس کے بعد اس کا بھائی زین العابدین تخت نشین ہوا۔

سلطان زین العابدین نے ۱۴۲۳ء سے ۱۴۷۰ء تک کشمیر پر حکومت کی ہے۔ سلطان

شہمیری خاندان کا سب سے ہر دلعزیز بادشاہ گزرا ہے۔ عام لوگوں میں بڑشاہ کے لقب سے بھی مشہور ہے۔ ان کے دور میں صنعت وحرفت کو بہت مقبولیت ہوئی۔ سلطان فنِ تعمیری کا بہت شوقین تھا۔ انھوں نے کئی عمارات تعمیر کرائی اور کئی قصبے آباد کئے۔ جن میں زینہ گیر، رینہ پور، زینہ کوٹ، زینہ کدل، اور زینہ بازار قابلِ ذکر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی نہریں بھی بنوائی۔ سلطان کے متعلق عنصر صابری راقم الحروف ہیں:

> ''آپ نے چونکہ مندروں کی مرمت کروائی۔ ہندوؤں کو عہدے دیئے
> ان کی مذہبی کتابوں کی اشاعت کرائی۔ ان کے مذہبی مدارس قائم کئے۔
> اور ان کو بہت سی مراعات عطا کیں۔ اس وجہ سے ہندو اس کو بڑشاہ یعنی
> بڑا بادشاہ کہتے ہیں۔ آپ کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ آج تک کسی بادشاہ
> کو نصیب نہیں ہوئی آپ کی تمام مورخین نے یک قلم تعریف کی ہے۔
> اور آپ کو بہادر سخی علم گستر عادل قدر دان اور منتظم گردانا ہے۔''۸؎

سلطان کو سمرقند جانے کا موقعہ بھی نصیب ہوا تھا۔ وہاں سے ماہرینِ فن کشمیر بلوائے اور بہت سے کشمیری حصول علوم وفنون کے لئے دیگر ممالک بھیج دیئے۔ بڑشاہ نے جھیل ولر میں ایک جزیزہ بھی بنوایا تھا اور اس میں ایک شاہی محل اور ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اس کے عہد میں ملک زراعت اور کاشت کاری کے اعتبار سے بھی خوشحال رہا۔ بڑشاہ کے بعد اس کا بیٹا حیدر شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کا زیادہ تر وقت عیاشی میں گزرجاتا تھا اس لئے وہ بحیثیت حکمران کامیاب نہیں رہا۔ دوسال حکومت کرنے کے بعد ۱۴۷۲ء میں سپردخاک ہوگئے۔

حیدر شاہ کے بعد اس کا بیٹا حسن شاہ حکمران بن گیا۔ اس کے دور میں ملک بدامنی اور عدم استحکام کا شکار ہوگیا۔ حسن شاہ نے مرنے سے پہلے اپنے سسر سید حسن بہقی سے وصیت کی جو اس کا وزیر بھی تھا کہ اس کے مرنے کے بعد فتح شاہ یا یوسف شاہ تخت کا وارث ہوگا یہ دونوں سلطان کے بھتیجے تھے۔ بہقی نے وصیت پر عمل نہیں کی اور اپنے ذاتی مقصد کے لئے حسن شاہ کے بیٹے محمد شاہ کو تخت پر

بیٹھایا۔محمد شاہ کی عمراس وقت سات سال تھی۔محمد شاہ اور فتح شاہ کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی۔ فتح شاہ نے چندحمایتوں کے ساتھ سلطنت پرتین بار حملے کرنے کے بعد فتح پائی اور۱۴۹۰ء میں تخت نشین ہوا۔خانہ جنگی کا سلسلہ یہی پرختم نہیں ہوا بلکہ اورآگے بڑھتا گیا۔ یہ جنگ۱۵۵۴ءتک جاری رہی اس درمیان شہمیری خاندان کے اور بھی حکمرانوں نے حکومت کی جن میں سلطان شمس الدین دوم، اسماعیل شاہ اول، ابرہیم شاہ دوم، نازک شاہ اور اسماعیل شاہ دوم شامل ہیں۔اسی کے ساتھ شہمیری خاندان کا زوال ہوگیااور برسراقتدار چک خاندان کے ہاتھوں میں آ گیا۔

چک خاندان:-(۱۵۵۵تا۱۵۸۶) چک خاندان کا پہلا بادشاہ سلطان محمد غازی چک۱۵۵۵ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ نہایت ہوشمند اور مستقل مزاج بادشاہ تھا۔انھوں نے باغیوں کو کچل کے رکھ دیااور سیاسی اقتدار کو مضبوط بنا دیا۔ غازی چک نے سات سال حکومت کی۔ پھر بیمار ہونے کی وجہ سے۱۵۶۳ء میں تخت تاج اپنے بھائی حسین شاہ چک کے حوالے کردیا۔حسین شاہ مزاجاً نرم تھا۔اس کی نرم مزاجی کا فائدہ اٹھا کران کے مضالفین نے شاہی محل پرحملہ کیا۔جس کی وجہ سے وہ نہایت شکی مزاج بن گیااور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کوروزاول ہی کچل دینا چاہتا تھا۔تا کہ آگے چل کر وہ اس کے لئے کسی خطرے کاباعث ثابت نہ ہو۔حسین شاہ نے اپنے بھائی کے بیٹے احمد خان کو بھی اندھا کروایا کہ وہ کہیں تخت کا دعویدار نہ بن بیٹھے۔حسین شاہ کے عہد میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے تاجِ شاہی اپنے بھائی علی شاہ کے پاس بھیج دیا۔ بقیہ زندگی زین پور میں خاموشی سے گزاردی۔

علی شاہ ایک رحم دل بادشاہ تھا۔ ملک میں امن و امان بحال کرنے کے ساتھ ساتھ بیرونی مما لک سے اپنے تعلقات قائم کئے۔علی شاہ اپنا زیادہ تر وقت عوام کی خدمت میں گزارتا تھا۔ اس کے دور میں اکبراعظم کی طرف سے مولانا عشق اور قاضی صدرالدین سفیر بن کرعلی شاہ کے دربار میں حاضر ہوکرشہزادہ سلیم کے لئے دختر طلب کی۔علی شاہ نے سلیم کے لئے اپنی بھتیجی کا پیغام بھیجااور

ملک میں اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا اور سکے جاری کئے۔اس کے عہد میں ۱۵۷۶ء میں زبردست قحط پڑا۔سلطان نے لوگوں کو قحط سے بچانے کے لئے ہر ممکنہ کوشش کیں۔۱۵۷۹ء میں سلطان کا انتقال ہوگیا اوراس کے بیٹے یوسف شاہ چک اور بھائی ابدال چک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔وزیر مبارک خان نے یوسف کی مدد کی اور تخت پر بیٹھا۔

یوسف شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی حکومت کا کاروبار سید مبارک کو سونپ دیا اور خود عیش وعشرت کی طرف مائل ہوگیا۔یوسف شاہ ایک حسینہ حبہ خاتون پر عاشق ہوگیا جس کا اصلی نام زون تھا۔کہا جاتا ہے کہ وہ بے حد خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی شاعرہ اور گانے میں بھی ماہر تھی۔یوسف نے اس کے شوہر سے اسے طلاق دلا کر خود اس کے ساتھ شادی کر لی۔یوسف شاہ کا یہ برتاؤ دیکھ کر سید مبارک نے وزیرِ سلطنت سے استعفیٰ دے دیا اور محمد بٹ کو وزیر بنایا گیا۔یوسف شاہ نے سید مبارک کے خلاف جنگ شروع کی جس میں شکست یوسف کو ہوئی اور حکومت مبارک کے ہاتھوں میں آ گئی اور سید مبارک نے تاج شاہی کو توڑ کر غریبوں میں تقسیم کیا۔ان کو حکومت سے دلچسپی نہ تھی اس لئے یوسف شاہ کو دوبارہ تخت نشین ہونے کے لئے بلایا۔لیکن ابدال چک نے یوسف شاہ کو یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ سید مبارک کی کوئی چال ہوسکتی ہے اور تخت پر اپنے بیٹے لوہر چک کو بیٹھایا۔جو یوسف شاہ کا چچازاد بھائی تھا۔

یوسف شاہ نے اپنی بحالی کے لئے اکبر سے مدد مانگی۔اکبر نے راجہ مان سنگھ اور مرزا یوسف خان رضوی کو فوج دے کر یوسف شاہ کے ساتھ روانہ کیا۔لیکن جب کشمیر کے سرداروں نے خود سلطنت کی پیش کش کی تو مان سنگھ کو اطلاع کئے بغیر یوسف شاہ چار ہزار فوج کے ساتھ کشمیر چلا آیا اور دوبارہ تخت نشین ہوا۔یوسف شاہ کے اس رویے کو اکبر نے اپنی شان کے خلاف سمجھا اور راجہ بھگوان داس کو پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ روانہ کر کے کشمیر پر حملہ کیا۔جس میں وہ بُری طرح ناکام رہا۔بھگوان داس نے یوسف شاہ سے صلح کرنے کی چال چلی اور یوسف شاہ کو اکبر کے دربار میں حاضر ہونے کی دعوت دی۔چنانچہ جب یوسف شاہ اکبر کے دربار میں حاضر ہوا۔اکبر نے موقع کا فائدہ

اُٹھا کر یوسف شاہ کو قید کر دیا۔ پھر اکبر نے یوسف شاہ کو ایک جاگیر دے کر بہار روانہ کیا۔ جہاں تھوڑے دنوں کے بعد دیوانے ہو کر یوسف شاہ نے ۱۵۹۲ء میں وہی پر دم توڑ دیا۔

یوسف شاہ کے بعد اس کا بیٹا یعقوب شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں اکبر نے قاسم مرزا کی سرکردگی میں ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ کشمیر پر حملہ کیا۔ جس میں یعقوب شاہ کی شکست ہوئی اور وہ کشتواڑ بھاگ گیا۔ اس طرح چک خاندان کا خاتمہ ہوا اور کشمیر مغلیہ سلطنت کا حصّہ بن گیا۔ اس کے بعد یہاں دہلی سے صوبیدار مقرر ہو کر آنے لگے۔

مغلیہ عہد:۔ (۱۵۸٦ تا ۱۷۵۲) مرزا قاسم ۱۵۸٦ء میں کشمیر کا پہلا مغل ناظم مقرر ہوا۔ وہ ایک بہادر آدمی تھا مگر سیاسی اعتبار سے کمزور تھا۔ کشمیر کا ناظم بننے کے بعد اُس نے عوام پر ظلم و ستم کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے عوام میں اسے کبھی مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ لوگوں نے یعقوب خان سے مل کر اکثر ان کے خلاف بغاوت بلند کی۔ مرزا قاسم خان کے ایک سال بعد سید یوسف خان صوبیدار مقرر کیا گیا۔ وہ ایک ہوشمند حکمران تھا۔ اس نے عدل وانصاف سے حکومت کی اور ہر طرح سے امن وامان بحال رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے عہد میں اکبر پہلی بار کشمیر آیا اور مشہور جگہوں کی سیر کی۔ اس وقت یعقوب شاہ اکبر کے دربار میں حاضر ہوا اور معافی مانگی۔ پھر اکبر نے اس کو بیس ہزار کی جاگیر دے کر باپ کے پاس بہار بھیج دیا۔ مرزا یوسف خان اپنے عہدِ حکومت میں ایک بار اکبر کے دربار میں گیا اور حکومت کا کاروبار یادگار خان کے سپرد کر دیا۔ یادگار خان نے کشمیر کا سلطان بننے کے لئے بغاوت شروع کر کے فتح پائی اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکے جاری کئے گئے۔ جب یہ خبر اکبر تک پہنچی تو اکبر نے یادگار خان پر حملہ کر کے اسے قتل کروادیا۔ اور پھر یوسف خان سوبیدار مقرر رہوا۔

کشمیر میں امن و امان بحال رکھنے کے لئے اکبر نے کشمیریوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات بڑھائے۔ اس نے شمس الدین چک کی بیٹی سے اپنا اور حسین چک کی بیٹی سے شہزادے سلیم کا نکاح کیا۔ ۱۵۹۳ء میں اکبر نے یوسف خان کو اپنے ساتھ لے لیا اور اس کی جگہ آصف خان کو صوبیدار

بنا دیا۔اس کا دور مختصر اور خوشحال رہا۔اس کے بعد ۱۵۹۷ء میں قلی خان صوبیدار مقرر ہوا۔قلی خان کے بعد مرزا اکبر صوبیدار بنایا گیا۔اس کے عہد میں کشمیر میں قحط پڑا۔اکبر نے لوگوں کو قحط سے محفوظ رکھنے کے لئے تمام اقدامات کئے۔کشمیر میں فلاح و بہبود کے لئے کافی روپیہ دیا۔اکبر نے ہر طرح سے کشمیر کو آسودہ بنانے اور خوشحال رکھنے میں کافی مدد کی۔اکبر کے دور میں کشمیر میں مغل باغات بنانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔اکبر نے چناروں سے بھرے ایک بہت بڑے باغ نسیم باغ کی تعمیر شروع کی جس میں ۱۲۰۰ سو چنار کے پیڑ لگائے۔

۱۶۰۵ء میں اکبر کا انتقال ہو گیا اور اس کا جانشین شہزادہ سلیم جہانگیر ہوا۔اس کے عہد میں قلیح خان، ہاشم خان، صفدر خان، احمد بیگ خان، دلاور خان، ارادت خان اور اعتقاد خان یکے بعد دیگرے ناظم رہے۔اس کا دور خوشحال رہا۔جہانگیر کا نام عدل و انصاف کے لئے مشہور ہے۔کشمیری عوام کے ساتھ ان کو کافی لگاؤ تھا۔اس کے عہد میں سرینگر میں آگ لگ گئی تھی۔آگ پر قابو پانے کے بعد جہانگیر نے لاکھوں روپیہ تعمیر کے لئے دیا۔اس کے علاوہ یہاں باغات اور نہریں بنا کر کشمیر کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ویری ناگ اور مانسبل جیسے مقامات پر عالیشان عمارتیں تعمیر کروائی۔

صوبیدار دلاور خان کے عہد میں جہانگیر نے کشتواڑ فتح کیا۔اس خوشی میں جہانگیر نے دلاور کو کشمیر کی ایک سال کی آمدنی بطور بخشیش دی۔کشتواڑ میں ہندوؤں کے اثر سے مسلمان عورتوں کو بھی ستی ہونا پڑتا تھا۔اس کو شہزادے سلیم نے سختی سے روکا اور ہندوؤں کے ساتھ مسلمان عورتوں کی شادی پر پابندی لگا دی۔چوتھی مرتبہ کشمیر سے واپسی پر راجوری کے مقام پر ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کی موت ہو گئی اور لاہور میں لا کر سپردِ خاک کر دیا گیا۔اُن کی ملکہ نور جہاں نے جہانگیر کی انتڑیوں (Intestnies) کو چینگس سرائے (chings sarai) راجوری میں دفنا دیا تا کہ اُن کی لعش سے بدبو پیدا نہ ہونے پائے۔جہانگیر کو کشمیر کے ساتھ اتنا لگاؤ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ مرتے وقت بھی جہانگیر نے کشمیر میں دفن ہونے کی وصیت کی تھی لیکن نور جہاں نے وصیت کے باوجود بھی اُن کو لاہور

میں دفن کر دیا۔

جہانگیر کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ جہانگیر نے اپنے دور میں صوبیداروں کو آزادی دی تھی۔مگر شاہجہاں نے صوبیداروں پر کڑی نظر رکھی تا کہ وہ عوام کے ساتھ کسی بھی طرح کا ظلم وستم نہ کریں جس سے عوام میں بدامنی اور بے چینی پیدا ہوسکتی ہے۔اس لئے اس نے صوبیدار کے لئے باصلاحیت اور وفادار لوگوں کا انتخاب کیا۔اس کے عہد میں مندرجہ ذیل اشخاص صوبیدار کے عہدے پر فائز رہے۔اعتقاد خان، خواجہ ابوالحسن، ظفر خان احسن دوبار، شہزادہ مراد بخش، علی مردان خان دوبار، تربیت خان، حسن بیگ اور لشکر خان۔

شاہجہاں کا عہد ہر اعتبار سے خوشحال رہا۔اس کے عہد میں ۱۶۳۴ء میں لداخ اور تبت فتح ہوا۔۱۶۴۱ء میں کشمیر میں زبردست قحط پڑا۔شاہجہاں نے قحط زدہ لوگوں کے لئے لنگر خانے تعمیر کرائے۔اور ایک لاکھ روپیہ خیرات کیا۔مسلمانوں کی تعلیم کے لئے معلم مقرر کئے۔سڑکیں، عمارت اور باغات بنوائے۔دور دراز ممالک سے پھل پھول کے درخت منگوا کر لگوائے۔

شاہجہاں کے بعد ۱۶۵۹ء سے اورنگ زیب کا دور شروع ہوا۔اورنگ زیب نے اپنے عہد میں ایک بار کشمیر تشریف لایا۔اور تین ماہ تک سرینگر میں قلعہ ہاری پربت میں قیام کیا۔وہ مذہبِ اسلام کے پابند تھے۔کشمیر میں قیام کے دوران بعض بُرے کاموں افیون کی کاشت، تھیٹر کا رواج، نوٹنکیوں کا چلن اور عورتوں کی بے حجابی وغیرہ کو روکنے کی پوری کوشش کی۔اس کے دور میں سیلاب، زلزلے، لداخ اور بلتستاں میں قزاقوں کا عمل دخل اور حسن آباد کا شعیہ سنی فساد وغیرہ ہوتے رہے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد ۱۷۰۷ء میں بہادر شاہ تخت نشین ہوا مگر اس وقت مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔آخری بادشاہ محمد شاہ تھا۔چونکہ مرکز میں حکومت مستحکم نہ رہی تھی مغل سلطنت کا دبدبہ قائم نہ رہ سکا جس کی وجہ سے کشمیر میں بھی حالات بگڑ گئے اور ۱۷۵۲ء میں ابدالی حملے کے ساتھ کشمیر افغانوں کے قبضے میں آ گیا اور اب گورنر افغان سے آنے لگے۔

افغانوں کا عہد:-(۱۷۵۲ تا ۱۸۱۹) احمد شاہ ابدالی نے عبداللہ خان ایشک قاضی کو پندرہ ہزار فوج کے ساتھ کشمیر تسخیر کرنے کے لئے روانہ کیا اور مغل ناظم ابوالقاسم خان کو شکست دے کر کشمیر فتح کیا۔ عبداللہ خان ایشک نے چھ ماہ کشمیر پر حکومت کی اس مدت میں اس نے کشمیر پر ظلم وستم کرنا شروع کیا۔ جس سے کشمیر اقتصادی طور پر پامال ہوگیا۔ ظلم وتشدد سے تنگ آ کر لوگوں نے بغاوت بلند کی۔ چنانچہ عبداللہ خان کو ملک سے نکال کر اس کے جانشین اعبداللہ خان کابلی کو صوبیدار اور سکھ جیون مل کو نائب مقرر کیا گیا۔ ابھی اس کی حکومت کو چار ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ سکھ جیون مل نے ابوالحسن خان پانڈے سے مل کر عبداللہ خان کابلی کو قتل کر کے صوبیدار بن گیا۔ اور ابوالحسن خان کو اپنا نائب مقرر کیا۔ ان دونوں نے مل کر بادشاہ کے خلاف بغاوت شروع کی اور فتح پائی۔ اس کامیابی کے ساتھ ہی سکھ جیون مل نے عوام پر ظلم کرنا شروع کیا۔ ابوالحسن نے اس کے خلاف بغاوت بلند کی اور شکست کھا کر پونچھ کے پہاڑوں میں روپوش ہوگیا۔ اس کی جگہ سکھ جیون مل نے مہانند پنڈت کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ احمد شاہ درانی نے یہ خبر سنتے ہی کشمیر میں داخل ہوکر سکھ جیون مل کے خلاف علان جنگ کر دیا اور سکھ جیون مل کو گرفتار کر کے نورالدین خان کو صوبیدار مقرر کیا۔

احمد شاہ درانی کی وافات کے بعد ۱۱۸۶ھ میں تیمور شاہ تخت نشین ہوا۔ تیمور شاہ کے عہد میں امیر خان ستور احمد شاہ صوبیدار مقرر رہا۔ اس کے بعد کئی صوبیدار بدلتے رہے۔ مگر امیر خان عیش پسند آدمی تھا۔ شیر گڑھ قلعہ، امیرا کدل، باغِ امیر آباد وغیرہ اسی کے یادگار ہے۔ اس نے کشمیر میں بغاوت اور ظلم وستم کا بازار گرم کر دیا۔ جب یہ خبر تیمور کو ہوئی تو اس نے تیسری بار کریم خان کی قیادت میں امیر خان پر حملہ کیا اور ویری ناگ شاہ آباد کے پہاڑی پر اس کو قتل کر دیا۔ تیمور شاہ کے بعد اس کا بیٹا زمان شاہ حکمران بنا۔ اس کے عہد میں ہر طرف بغاوتیں شروع ہوگیں۔ ایک طرف پنجاب کے سکھوں نے سر اُٹھانا شروع کیا اور لاہور پر قابض ہوگئے۔ دوسری طرف اپنے بھائی محمود شاہ کے ساتھ جنگیں لڑنی پڑی۔ اسی اثناء میں سکھوں کو موقعہ ملا اور محمود شاہ کے عہد میں رنجیت سنگھ نے پنڈت

بیردھر کی سرکردگی میں تیس ہزار فوج کو تسخیرِ کشمیر کے لئے روانہ کیا۔صوبیدار جبار خان نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا۔آخر شدید زخمی ہو کر کابل بھاگ گیا۔اس کے ساتھ ۱۲۳۴ھ میں افغان حکومت کا خاتمہ ہوا اور کشمیر سکھوں کے قبضے میں ہو گیا۔

سکھ عہد:- (۱۸۱۹تا۱۸۴۶) کشمیری عوام نے افغانوں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر سکھ حکومت کا استقبال کیا یہ سوچ کر کہ شادی ظلم وتشدد میں کوئی کمی آ جائے۔لیکن سکھوں نے ظلم وزیادتیوں کا بازار انتہا کو پہنچا دیا۔مسلمان ہر طرح سے ظلم وزیادتی،لوٹ مار کی چکی میں پسنے لگے۔مسجدوں میں نماز ادا کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔سینکڑوں عورتوں کی عصمت زنی کی گئی۔

محمد امین خان لکھتے ہیں:

''جب سے کشمیر غلام ہوا مسلسل اسی سلوک سے دوچار رہا ہے، جو آقا اپنے غلام سے روا رکھتا ہے مغلوں اور افغانوں کے بعد انھوں نے سکھوں کو نجات و ہندہ تصور کیا۔انھوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ بقول محمد دین فوق (۲) افغانوں کی حکومت اگر تلخ گھونٹ کے مشابہ تھی تو خالصہ بہادر زہر میں بجھے ہوئے تیر نکلے۔''[۹]

سکھوں کے عہد میں ۱۰ گورنروں نے کشمیر پر حکومت کی۔ پہلا گورنر دیوان مہر چند تھا۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت ظالم تھا۔اس نے پٹھانوں کی عورتوں کو، جو فوجیوں کی بیویاں تھی،گرفتار کر کے لاہور میں جنسی استعمال کے لئے نیلام کر دیا۔اس کے بعد موتی رام ناظم مقرر ہوا۔اس نے مسلمانوں کو بہت تنگ کیا۔سرینگر جامعہ مسجد کو بند کر دیا۔اس کے بعد بھی جتنے سیکھ گورنر یکے بعد دیگرے آئے سب نے مسلمانوں پر ظلم ڈھائے۔سوا ایک گورنر مان سنگھ کے،جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے عوامی فلاح و بہبود کے لئے بہت کام کیئے۔اس کی اس نرم رویے کی وجہ سے سکھ فوجیوں نے اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔اس کے بعد دو مسلمان گورنر شیخ غلام محی الدین اور شیخ امام الدین یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے۔انھوں نے کشمیر میں امن وامان بحال کرنے کی کوشش کی اور

سرینگر جامع مسجد کو ۲۵ سال کے بعد دوبارہ عبادت کے لئے کھول دیا۔ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد سکھ سلطنت میں افراتفری پھیل گئی۔ سکھوں نے انگریزوں سے بھی بگاڑ لی اور انگریزوں کے مقبوضہ علاقے پر حملہ کیا۔ جس میں سکھوں کی شکست ہوئی اور عہد نامہ امرتسر کی رو سے راجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں کو پچھتر لاکھ روپے دے کر کشمیر پر قبضہ کرلیا۔

ڈوگرہ عہد:۔ (۱۸۴۶ تا ۱۹۴۷) ۱۸۴۶ء میں ڈوگرہ خاندان کے راجہ گلاب سنگھ نے جموں کو کشمیر کے ساتھ جوڑ کر موجودہ ریاست ''جموں وکشمیر'' کی بنیاد ڈالی۔ وہ بہت ہی ظالم حکمران گزرا ہے۔ اس کے متعلق عنصر صابری لکھتے ہیں:

> '' گلاب سنگھ ایک کٹر فرقہ پرست شناتن دھری ہندو تھا۔ اس نے جموں میں کئی مندر تعمیر کروائے اور ملک میں گاؤ کشی بالکل بند کردی۔ اگر کوئی مسلمان اپنی ناکارہ اور بیمار گائے کو بھی معاشی مشکلات کی بنا پر ذبح کرتا تھا تو اس کو گھاس کی آگ میں زندہ جلایا جاتا تھا۔ مسلمانوں سے تمام قسم کے ہتھیارات چھین لینے کی مہم شروع کردی۔'' ۱۰

۱۸۵۷ء میں گلاب سنگھ کی موت کے بعد اس کا لڑکا رنبیر سنگھ تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں کشمیریوں کو شروع میں کسی حد تک ظلم وستم سے چھٹکارہ ملا بعد میں یہ بھی اپنے باپ کے نقشہ قدم پر چلنے لگا۔ معمولی مزدور سے بھی لگان وصول کرتا تھا۔ اس کے بارے میں سروری صاحب لکھتے ہیں:

> '' بھوکے روٹی مانگنے والے محتاجوں کے بارے میں یہ مشہور ہوگیا تھا کہ مہاراجہ انہیں بوریوں میں بھر کر، ولر جھیل میں ڈبو دیتے ہیں۔'' ۱۱

مہاراجہ رنبیر کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا پرتاب سنگھ ۱۸۸۵ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کے دور میں کشمیر میں جدید سیاسی بیداری بھی شروع ہوگئی تھی۔ کشمیر کے پڑھے لکھے لوگ ہندوستان اور دنیا کے باقی ممالک میں چلنے والی عوامی تحریکوں کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ اسی دوران پرتاب سنگھ کی موت ہوئی اور اس کی جگہ ۱۹۲۵ء میں اس کا بھتیجا ہری سنگھ حکمران بن گیا۔ اس کے دور میں کشمیریوں

کی جدوجہد نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔اس وقت جو کشمیری مسلم لوگوں کی حالت تھی اس کو محمد امین خان یوں بیان کرتے ہیں:

''(۱) مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمت کے تمام دروازے بند تھے۔(۲) تجارت پر غیر مسلم چھائے ہوئے تھے، کیونکہ انہیں حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ (۳) مسلمان کسانوں اور کاشت کاروں کی حالت ناگفتہ بہہ تھی۔مسلمان محنت کرتے اور جب فصل پکتی تو مہاراجہ کے کارندے اٹھا کر لے جاتے۔(۴) بیگار عام تھی اور اس کا زیادہ شکار مسلمان رہتے تھے۔(۵) ریشم، کاغذ، تمباکو، نمک، اناج و زعفران کی خرید وفروخت سرکاری تحویل میں تھی۔(۶) مسلمان ہتھیار نہیں رکھ سکتے تھے، مگر ہندوؤں کو اجازت تھی۔(۷) گائے ذبح کرنے والوں کو جان سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔(۸) فوج میں تیرہ بٹالین میں صرف ایک ایسی تھی جس میں کچھ مسلمان تھے۔(۹) ۱۸۴۶ء سے ۱۹۴۶ء تک آٹھ وزیراعظم بنے، مگر مسلمان ایک بھی نہ تھا۔(۱۰) تعلیم میں مسلمان پسماندہ تھے۔صرف ایک فیصد پڑھے لکھے تھے۔(۱۱) مسلمانوں کو بھیڑ بکریوں پر ٹیکس دینا پڑتا۔(۱۲) چولہوں پر بھی ٹیکس لیا جاتا۔(۱۳) اگر کوئی ہندو مسلمان ہوتا تو تمام جائیداد سے محروم ہو جاتا اور اگر مسلمان ہندو ہوتا تو جائیداد محفوظ رہتی۔(۱۴) جلسے کرنا یا شکایت کرنا سخت جرم تھا۔''[۱۲]

۱۹۳۲ء میں لوگوں نے مل کر ''آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس'' نامی تنظیم قائم کی۔دوسری طرف مہاراجہ ہری سنگھ کی فوج نے ہر طرح سے تنظیم سے وابستہ لوگوں کو کمزور کرنے کی کوششیں کیں۔ اس تعلق سے سروری صاحب راقمطراز ہے:

''ہزاروں انسانوں کو جیل میں ٹھونسا گیا۔گولیوں کی بوچھاڑ سے سینے چھلنی ہوئے۔تازیانے کی سزاؤں نے آزادی خواہوں کی کھالیں

اُدھیڑ دیں، مسجدیں مقفل کر دی گئیں غرض وہ سب کچھ ہوا جو ایک پسپا
ہوتی ہوئی شخصی مطلق العنان حکومت اور جاگیرداریت جھنجھلاہٹ میں
کر سکتی تھی۔''۱۳؎

جب صورت حال مہاراجہ کے قابو سے باہر ہو گئی اس نے وائسرائے ہند سے امداد طلب کر لی۔ اس کی درخواست پر انگریز فوج کشمیر میں داخل ہوئی اور اس کے بعد ۱۲/ نومبر کو ایک کمیشن قائم ہوا۔ یہ کمیشن ''گلانسی کمیشن'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے اس کے سامنے ایک مکمل آئینی حکومت کا مطالبہ پیش کیا پھر مارچ ۱۹۳۲ء میں ''گلانسی کمیشن'' نے اپنی سفارشات مہاراجہ کو پیش کر دیں۔ مسلمانوں کی شکایات کا کافی حد تک ازالہ کیا گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے مل کر ایک سیاسی جماعت ''مسلم کانفرنس'' تجویز کی۔ شیخ محمد عبداللہ صدر اور چوہدری غلام عباس جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں الیکشن ہوئے۔ مسلمانوں کے لئے جتنی سیٹیں مختص ہوئی تھیں وہ سب مسلم کانفرنس نے بلا مقابلہ جیت لیں۔ ۱۹۳۵ء میں شیخ محمد عبداللہ نے پنڈت پریم ناتھ بزاز کے ساتھ مل کر مسلم کانفرنس کا نام تبدیل کرنے کی مہم چلائی۔ جون ۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کا نام نیشنل کانفرنس رکھا گیا۔ اور متحدہ طور پر حکومت کو مزید مطالبات پیش کئے گئے۔ ۱۹۴۰ء میں دوبارہ مسلم کانفرنس کا احیا ہوا اور اس طرح کشمیری مسلمان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ (نئی مسلم کانفرنس کا نام 'آزاد مسلم کانفرنس' رکھا گیا اور اس کی قیادت اُس وقت میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ کر رہے تھے۔

۱۹۴۶ء میں شیخ عبداللہ کی زیر قیادت میں نیشنل کانفرنس نے ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک شروع کی۔ اس تحریک کا اہم مقصد ڈوگرہ راج کا خاتمہ تھا۔ شیخ محمد عبداللہ کو انڈین نیشنل کانفرنس کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ اس تحریک کے تمام اراکین کو ڈوگرہ حاکم نے گرفتار کر لیا۔ دوسری طرف مسلم کانفرنس نے ظاہری طور پر ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک کی مخالفت کی مگر اندرونی اس کے اراکین نے پورے آب و تاب کے ساتھ اس تحریک کا ساتھ دیا۔ اس الزام میں مسلم کانفرنس کے لیڈر غلام عباس کو گرفتار کیا گیا۔ جب ان قیدیوں کو چھوڑنے کی بات آئی تو انڈین نیشنل کانفرنس نے صرف شیخ محمد

عبداللہ کو چھڑوانے پر زور دیا۔ یہ دوستانہ تعلقات تھے جو نہرو اور شیخ عبداللہ کے بیچ ۱۹۳۸ء سے شروع ہوئے تھے۔ یہی بنیادی وجہ تھی کہ نیشنل کانفرنس نے کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ ملانا چاہا۔ جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا اس کے ساتھ ساتھ ۵۶۲ خودمختار ریاستیں بھی آزاد ہوئیں۔ ۱۹۴۷ء انڈین خودمختار را یکٹ کے تحت یہ خودمختار ریاستیں اپنا مستقبل چننے کے لئے آزاد تھیں۔ ان کو یہ آزادی دی گئیں کہ یا تو وہ خودمختار رہیں یا کسی ایسے ملک کے ساتھ الحاق کریں جو ان کا ہمسایہ ہو اور جس کے ساتھ ان کی آبادی زیادہ ملتی ہیں۔ ان میں سے ۵۶۰ خودمختار ریاستوں نے الحاق کیا۔ بغیر جموں کشمیر، جنگڑ اور حیدرآباد کے جو خودمختار رہنا چاہتی تھیں۔ یہی سے مسلۂ کشمیر شروع ہوتا ہے۔

چناچہ ہری سنگھ اس وقت کشمیر کا مہاراجہ تھا جو یہ طے نہیں کر پار ہا تھا کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کرے یا پاکستان کے ساتھ، لیکن اس کے اوپر دونوں ملکوں کی طرف سے کافی دباؤ ڈالا گیا کہ وہ الحاق کریں۔ اس دوران پونچھ کے مسلمانوں نے ڈوگرہ فوج کے خلاف بغاوت شروع کی اور ساتھ ہی قبائیلی مظفرآباد سے داخل ہوئے اور ڈوگرہ فوج کو مار بھگایا۔ اسی وقت مہاراجہ نے ہندوستان سے الحاق کیا اور کچھ شرائط پر بھارت نے مہاراجہ کی مدد کی جن میں ایک شرط یہ تھی کہ شیخ عبداللہ کو وزیرآعظم بنایا جائے اور دوسری شرط امن و امان بحال ہونے کے بعد کشمیری عوام کو خود اپنا فیصلہ لینے کا حق دیا جائے گا۔ لیکن یہ حق کشمیریوں کو کبھی نہیں دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری عوام آج بھی اس حق کے لئے جدو جہد کر رہیں ہیں۔

۲۷ اکتوبر کو ہندوستانی فوج کشمیر میں داخل ہوئی۔ اس وقت پاکستان کی ساری حکومت کشمیر میں مداخلت کے خلاف تھی اس لئے قبائیلیوں کو اور نہ مقامی مجاہدین کو پاکستان کی طرف سے کسی قسم کی مدد دی گئی۔ جب ہندوستانی فوج نے تیزی سے پیش قدمی کی تو قبائیلیوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ پاکستان کو اپنی سلامتی کی فکر لگی اور پاکستانی فوج کے کمانڈ ران چیف جنرل گرسی نے اپریل ۱۹۴۸ء کو حکومت پاکستان سے تجویز پیش کی کہ وہ اپنی سرحد کو محفوظ کرنے کے لئے دشمن کو اوڑی، پونچھ اور نوشہرہ لاین پر روک دے۔ اس کے بعد پاکستان کی فوج نے مداخلت کی اور ہندوستان نے

مسلۂ کشمیر کواقوام متحدہ میں لے لیا۔اس لڑائی میں کشمیر دوحصّوں میں تقسیم ہوگیا اور کشمیر کا چار ہزار مربع میل علاقہ '' آزاد کشمیر'' اور ۲۹ ہزار مربع میل کا سرحدی علاقہ '' گلگت بلتستان'' پاکستان کے قبضے میں آ گیا۔

اس طرح دو تہائی (2/3rd) ہندوستان کے قبضے میں اور ایک تہائی (1/3rd) حصّہ پاکستان کے قبضے میں ہوگیا۔ ہندوستان کے زیر قیادت والے کشمیر میں نیشنل کانفرنس کی حکومت بنائی گئی۔اس پارٹی کا اہم رکن شیخ محمد عبداللہ کو وزیر آعظم بنایا گیا اور اس نے کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ جوڑنے کی پوری کوشش کی۔محمد امین خان لکھتے ہیں:

> '' جہادِ آزادی ۱۹۴۷ء ایک عمدہ کوشش تھی مگر اس کے نتائج مثبت بر آمد نہ ہو سکے۔ان نتائج کو یوں بیاں کیا جا سکتا ہے:(۱) کشمیر کو تین ٹکڑوں میں منقسم کر کے قوت کو کمزور کر دیا گیا، جو حصّہ بھارت کے حصّے میں آیا، اس میں بھارت نے کٹھ پتلی سجادی۔ جو پاکستان کے حصّے میں آیا، اس کے ایک حصّہ پر کٹھ پتلی سجانا ضروری سمجھا گیا۔ جبکہ گلگت بلتستان کے لئے اسے بھی ضروری نہ سمجھا گیا۔
>
> (۲) جموں اور وادی سے بہت سے لوگ ہجرت کر کے آزاد کشمیر میں داخل ہو گئے۔ان لوگوں کو آزاد کشمیر میں بسانے کے بجائے گوجرانوالہ اور جنگ کے دور دراز علاقوں میں بسایا گیا، جس سے ان لوگوں کے دلوں سے آزادی کے جذبے کو مٹا دیا گیا اور آزادی کی جدوجہد میں ہم ایک بڑی قوت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔''[۱۴]

چند سالوں بعد شیخ محمد عبداللہ میں بدلاؤ آ جاتا ہے اور وہ کشمیر کو ایک آزاد ملک بنانے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کو ۱۹۵۳ء میں گرفتار کیا گیا۔ یہاں سے حکومت ہند نے کشمیر کے صرف ان لوگوں کو سرکاری نظام میں رکھا جو ہندوستان کی حمایت میں تھے۔الیکشن ہوئے اور اس میں وہ لوگ جیت گئے جن کو دہلی میں بیٹھی سرکار نے چن لیا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ بھی کشمیر کی تحریکِ آزادی میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔اس جنگ میں کشمیر کے دونوں اطراف سے حصّہ لیا گیا۔اس کا منصوبہ حکومتِ پاکستان نے بنایا تھا جو آخر میں ناکام ہوگیا۔اس جنگ کے بعد دونوں ملکوں کے لیڈروں نے آپس میں بات چیت کی اور مسلۂ کشمیر کو پرامن طریقے سے حل کرنے پر زور دیا۔اس معاہدے کا ابھی لوگ استقبال ہی کررہے تھے کہ ہندوستان کے وزیرآعظم جواہرلال نہرو کی وفات ہوئی۔

۱۹۷۱ء میں ہندوستان اور پاکستان کے بیچ جنگ ہوئی جو مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے کے لئے لڑی گئی جس سے ایک نیا ملک بنگلہ دیش وجود میں آگیا۔اس جنگ میں بری طرح پاکستان کی ہار ہوئی۔۹۰،۰۰۰ پاکستانی فوجوں نے ہندوستانی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔جن کو چھوڑانے کے لئے ''شملہ اگریمنٹ'' ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوا۔اس میں کشمیر مسلۂ کو پرامن طریقے سے حل کرنے کی بات بھی ہوئی اور کہا گیا اس میں کوئی بھی تیسرا ملک مداخلت نہیں کرے گا۔اس کے بعد اندرا گاندھی نے کشمیر میں انڈین نیشنل کانفرنس کو مضبوط بنانے کی ترغیب دی۔۱۹۷۲ء کے الیکشن میں جموں وکشمیر کانگریس پارٹی جیت گئی۔شیخ عبداللہ اب خودمختار (Autonomy) ریاست کے لئے بولنے لگے۔اس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اندرا گاندھی نے شیخ عبداللہ کے ساتھ agrement کیا جس کو ''اندرا شیخ اکارڈ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس ایکٹ کے تحت شیخ عبداللہ نے کشمیر کو ہندوستان کا حصّہ مان لیا۔پاکستان نے اس کی سخت مذمت کی اور کہا کہ یہ اقوام متحدہ کی قرارداد (UN Resalution accard)اور Shimla agrement کے خلاف ہے۔جس میں کہا گیا تھا کہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے کشمیری عوام سے رائے لی جائے گی۔اس کے بعد ۱۹۷۱ء سے لیکر ۱۹۸۹ء تک ہندوستان اور پاکستان کے بیچ کی لڑائی نے بین الاقوامی رخ لے لیا۔۱۹۸۹ء میں کشمیر میں ہندوستانی حکومت اور کشمیر کے نااہل حکمرانوں کے خلاف تحریک نے ایک مسلح رُخ اختیار کرلیا۔جو ابھی تک جاری ہے۔حکومت ہند نے اس تحریک کو فوجی زور سے کچل ڈالا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ موت کی ابدی نیند سُلا دئے گئے۔پچھلے

۲۵برسوں سے ریاست جموں وکشمیر ابتر حالات سے دوچار ہے۔اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جب لگ رہاتھا کہ حالات امن کی سمت میں جارہے ہیں تب ۲۰۰۸ءاور ۲۰۰۹ کے سرمائی ناگفتہ حالات جسے کشمیر میں ''رگڑا''(Ragda)تحریک سے یاد کیا جاتا ہے سامنے آئی۔ رگڑا تحریک کا فوجی بالا دستہ سے کچل دینا ایک بار پھر اس نتیجہ پر حالات کو لایا کہ کشمیر کا مسلۂ پوری طریقے سے سلجھا نہیں ہے اور نہ ہی کشمیری عوام فوجی بالادستی سے کیا گیا ظلم وتشدد بھول گئے ہیں۔ بقول محمد امین خان:

> ''جب انگریزوں نے اپنی بساط برصغیر سے سمیٹ لی تو ڈوگرہ عہد کا بھی خاتمہ ہوگیا مگر کشمیر کی وادی جنتِ نظیر پر چھائی ہوئی غلامی کی سیاہ رات ابھی تک نہیں ڈھلی۔ ڈوگرہ راج کا تو خاتمہ ہوگیا مگر اس دورِ غلامی کی باقیات خطِ متارکہ کے دونوں اطراف میں بدستور موجود ہیں۔''[۱۵]

بہرحال ہر قوم امن وامان سے رہنا چاہتی ہے۔کشمیر کے لوگوں کی بھی یہی خواہش ہے۔عزّت اور وقار کے ساتھ جمہوری امن قائم کرنے کا ایک ہی راستہ ہے وہ یہ کہ عوام کی رضامندی ،فوجی بالادستی سے قائم کیا گیا امن ہمیشہ ناپائیدار ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔محمد امین خان۔آئینہ تاریخِ کشمیر۔گلشن پبلیشر ز،سرینگر کشمیر۔۲۰۰۲ء۔ص–۳۱۔بحولہ نصرت کشمیر نمبر۔۱۹۶۰ء

۲۔کلین پنڈت۔مترجم۔۔۔مکمل راج ترنگنی جلداول۔۔۔ص–۸

۳۔عنصر صابری۔تاریخ کشمیر(مظلوم کشمیر)۔اُردو بازار،لاہور۔۱۹۹۱ء۔ص۔۱۳۔۱۴

۴۔محمد امین پنڈت۔مختصر تاریخ کشمیر۔گلشن پبلیشر ز،سرینگر کشمیر۔۲۰۰۱ء۔ص–۲۶

۵۔ڈاکٹر ایم۔ایس۔ناز۔تصویر کشمیر۔گلشن پبلیشر ز،سرینگر کشمیر۔۲۰۰۳ء۔ص–۱۰۳

۶۔پریم ناتھ بزاز۔مترجم عبدالحمید نظامی۔تاریخ جدوجہدِ آزادی کشمیر۔گلشن پبلیشر ز،سرینگر کشمیر۔۲۰۰۲۔ص–۴۱

۷۔محمد منور مسعودی۔ریچن سے رنجیت سنگھ تک۔انڈین پرنٹنگ پریس،سرینگر۔۱۹۹۳۔ص–۱۱

۸۔عنصر صابری۔تاریخ کشمیر(مظلوم کشمیر)۔اُردو بازار،لاہور۔۱۹۹۱ء۔ص۔۸۲

۹۔محمد امین خان۔آئینہ تاریخِ کشمیر۔گلشن پبلیشر ز،سرینگر کشمیر۔۲۰۰۲۔ص–۴۱

۱۰۔عنصر صابری۔تاریخ کشمیر(مظلوم کشمیر)۔اُردو بازار،لاہور۔۱۹۹۱ء۔ص۔۱۳۶۔بحوالہ کشمیر کی تحریکِ آزادی۔

۱۱۔عبدالقادر سروری۔کشمیر میں اُردو،جلداول۔جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی،سرینگر۔۱۹۹۳ء دوسرا ایڈیشن۔ص–(۸۹)

۱۲۔محمد امین خان۔آئینہ تاریخِ کشمیر۔گلشن پبلیشر ز،سرینگر کشمیر۔۲۰۰۲۔ص–۳۰۳۔۳۰۴۔بحوالہ عبداللہ قریشی۔آئینہ کشمیر۔

۱۳۔عبدالقادر سروری۔کشمیر میں اُردو،جلداول۔جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی،سرینگر۔۱۹۹۳۔ص–۹۵

۱۴۔محمد امین خان۔آئینہ تاریخِ کشمیر۔گلشن پبلیشر ز،سرینگر کشمیر۔۲۰۰۲۔ص–۳۱۶

۱۵۔محمد امین خان۔آئینہ تاریخِ کشمیر۔گلشن پبلیشر ز،سرینگر کشمیر۔۲۰۰۲۔ص–۴۳

باب سوم
کشمیر کا تہذیبی و ثقافتی منظر نامہ

کشمیر کا تہذیبی وثقافتی منظر نامہ

کسی مخصوص ملک کی تہذیب عالمی تہذیب کی حصّہ ہوتی ہے۔اور عالمی تہذیب اُس ملک کی تہذیب پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ ہر ملک کی تہذیب ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے۔ سماجی اور معاشرتی تبدیلیاں اس پر گہرے اثرات ڈالتی ہیں۔ جب ہم کشمیری تہذیب وثقافت کی بات کرتے ہیں تو یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ اس تہذیب وثقافت نے بھی کئی منزلیں طے کی ہیں اور اس پر مقامی، وسط ایشیائی اور یورپی اثرات خصوصاً اور عالمی تہذیب کے اثرات عموماً وقتاً فوقتاً پڑے ہیں۔ متعدد تبدیلیوں کے باوجود اس تہذیب وثقافت کے عناصر ایسے ہیں جو اسے دیگر قوموں کی تہذیب وثقافت سے منفرد شناخت عطا کرتے ہیں۔

وادی کشمیر پیر پنچال اور قراقرم پہاڑی سلسلوں کے درمیان دلہن کے مانند نہ جانے کتنے سالوں سے رقصاں ہے۔ اس میں ٹھنڈی ہواؤں کا بانکپن، برف سے لدی چوٹیاں، شاندار بدلتے موسم، بہتے دریا، خاموش جھیلیں، جھرنوں اور چشموں کی بر مار اور پراسرار نظارے اس وادی گلپوش کو دنیا کے تمام خوبصورت خطوں پر سبقت عطا کرتے ہیں۔ رسول پُونپر لکھتے ہیں:

> ''جغرافیائی حالات کسی بھی ملک کی تاریخ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وادی کشمیر کے فلک پوس پہاڑوں، آبشاروں، ندیوں اور آب وہوا نے یہاں کے لوگوں کی زندگی کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالنے میں بہت ہی اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ سبھی چیزیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں لیکن وادی کشمیر ہر طرف سے پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ سربفلک برفیلے پہاڑ جو اس

کی فصیل کی حیثیت سے عظیم نگہبان کا کام دیتے آئے ہیں، ہماری مدنی اور تہذیبی زندگی پر بھی بارش، سیلاب اور قحط سالی وغیرہ آفتیں ہر دور میں اثر انداز ہوئی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو جغرافیہ کو کسی بھی ملک کی تہذیب کے زوال وارتقاء میں ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ جموں و کشمیر اور لداخ کی دُشوار گزار گھاٹیاں اس ریاست کو میدانِ حرب ہونے کے ناطے بہت ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ کشمیر سے بین الاقوامی دلچسپیاں اس کی جغرافیہ کی مرہونِ منت ہیں۔'' ۱؎

کشمیر واقعی خوبصورت ہے۔ اسے جنت ارضی اور فردوسِ بریں کے خطاب سے نوازہ گیا۔ یہاں کی ہر شئے کو محبت اور حسن نے نکھارا ہے۔ ہر طرف حسن وعشق اور محبت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ یہ امر فطری ہے کہ جس چیز میں حسن ہو، انسان اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ کشمیر بھی اس حسن وعشق کی ایک رنگارنگ تصویر ہے۔ جس کا عاشق ہونا یقینی ہے۔ اس جنت بے نظیر کو کشمیری تو کیا باہر کے لوگ بھی ایک بار دیکھ کر بار بار دیکھنے اور لطف اندوز ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ بقول ایم۔ ایس۔ ناز:

''قدرت ہے تو اس کی ہر چیز میں خوبصورتی ہی خوبصورتی، برفانی چوٹیاں، گھاٹیاں، تلیٹیاں، باغ و راغ، گونا گوں اشجار، ان کے برگ بار، تختہ تختہ کیارے، زعفران کے سنیلے سنیلے کھیت، چرند پرند، آتی جاتی رُتوں کا جوبن، جھومتے بادل، رمتے دریا، شور مچاتے جھرنے، چپ چاپ جھیلیں، سرمست آبشار، طرارے بھرتے شکارے اور انسان ہیں تو چندے آفتاب، چندے ماہتاب، حسن و جمال کی چلتی پھرتی مورتیں۔ ان کے ہوتے ہوئے ہر دل میں اُمنگیں ہی اُمنگیں اُبھرتی ہیں۔ خواہ کوئی اس ہری بھری وادی کا باسی ہو یا کہیں باہر سے آیا ہو۔'' ۲؎

اس خوبصورت وادی میں جس وقت ہندو تہذیب رائج تھی اس وقت سارے

ہندوستان کی طرح یہاں بھی ہر طرف بت پرستی، ذات پات کی تمیز، غلام اور آقا میں امتیاز، شہری اور مذہبی حقوق میں عدم مساوات اور معاشی ناہمواری کے سوا کچھ دیکھنے کو نہ آتا تھا۔ ۱۴۰۰ء میں یہاں اسلام طلوع ہوا جس کے زیرِ سایہ لوگوں کو آزادی سے جینے کا موقعہ ملا۔ اسلامی تہذیب میں ہندو تہذیب کے فرسودہ روایت مثلاً ذات پار کی تمیز، ستی کا رواج، غلام اور آقا میں امتیاز وغیرہ شاذ ہی ملتے ہیں اس لئے لوگ اسلام کی طرف بہت جلد راغب ہو کر اسلام قبول کرنے لگے۔ تہذیب ہمیشہ تغیر پذیر ہوتی ہے۔ یہ سماج کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اس طرح کشمیر میں مسلم تہذیب آنے کے بعد ایک نئی تہذیب نمودار ہوئی۔ جو یہاں کے آپسی بھائی چارے کی ایک مشترکہ تہذیب کہلاتی ہے۔ بقول رحمان مذنب:

> ''مسجد کی چٹائی اور گھر کا بوریا اسلامی کلچرل (تہذیبی فکر) اور تمدن کا سرچشمہ ہیں۔ روشن خیالی اور توانائی کا بھی یہی چشمہ ہیں۔ تاریخِ عالم گواہ ہے کہ اس نے بہت کم مدت میں بڑی سے بڑی مستحکم سے مستحکم اور شاندار سے شاندار حکومت کی بساط اُلٹ دی۔ تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ حیرت خیز اخلاق اور روحانی اقدار سے لیس عالمگیر انقلاب آیا۔ آسماں تلے قبل ازیں ایسا انقلاب نہیں آیا جس نے انسان کو قابل رشک اور اس کے شایانِ شان مرتبہ دیا۔ غلامی اور استحصال کی زنجیریں کاٹ دیں۔'' ۳۱

کشمیری عوام پر ہمیشہ دوسرے ملکوں نے اپنا دبدبہ جمانے کی کوشش کی۔ مگر کشمیری عوام نے کبھی ہار نہیں مانی۔ انھوں نے اپنی تہذیبی قدروں کی سلامتی کے لئے ہمیشہ قربانیاں دی ہیں۔ ان کا آپسی تحفظ، بھائی چارہ اور محبت ہی ان کا تہذیبی میراث ہیں۔ اس تعلق سے انوار احمد کی یہ صراحت قابلِ ذکر ہے:

> ''بدھ، ہندو، مسلمان، سکھ اور ڈوگرہ سبھی نے یہاں حکومت کی ہے اور اپنے تہذیبی و تمدنی آثار چھوڑے ہیں۔ کشمیریوں نے ان میں سے

صحت مند عناصر کو بڑی فراخدلی سے قبول کیا۔مختلف زمانوں میں یہاں
مختلف زبانیں رائج رہیں ہر زبان کا ادب یہاں موجود ہے۔اس سے
اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم زمانے سے ہی کشمیر علم وفن کا گہوارہ رہا ہے اور
اس کا تہذیبی وتمدنی کردار نہایت شاندار رہا ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا
جاسکتا ہے۔''[۴]

کشمیری تہذیب و ثقافت کا ہر موضوع دلچسپی کا باعث ہے۔ اس صدیوں پر پھیلی تہذیب نے کئی رنگ بدلے،لیکن پھر بھی اس کی انفرادیت برقرار رہی۔ ہر دور میں اس نے اپنے اعلیٰ پائے کے نمونے چھوڑے، جو باعث فخر ہے۔ کشمیر میں وارد ہونے والے ہر سیاح کو کشمیری تہذیب و ثقافت نے اپنی طرف راغب کیا۔اس پر جتنا بھی لکھا جائے تقریباً یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔کافی سارے لوگوں نے اس کے تعلق سے لکھا ہے۔جن میں بیشتر بیرونی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر ایک نے اسے مختلف نظریہ سے پرکھا اور پیش کیا۔ والٹر روبرٹ لارنس نے ''ویلی آف کشمیر'' لکھ کر کشمیری تہذیب وثقافت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔اس کتاب کا ترجمہ ''کشمیر کی وادی'' کے زیرِعنوان کشمیر کے مشہور صحافی، شاعر اور ادیب غلام نبی خیالؔ نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ حسن کھویہامیؔ نے کشمیری تہذیب وثقافت کے حوالے سے ''تاریخ حسن'' لکھ کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔مزید کتابیں اور رسائل وغیرہ بھی اس ضمن میں کافی معاون ثابت ہوتے ہیں۔جن میں تصویر کشمیر(ایم۔ایس۔ ناز)،کشمیر میں اُردو(عبدالقادر سروری)،رسالہ ہمارا ادب (کشمیر) اور رسالہ شیرازہ (کشمیر) وغیرہ شامل ہے۔اسی ماخذ کو زیرِغور رکھ کر میں نے کشمیری تہذیب وثقافت پر لکھنے کی ایک طالبانہ کوشش کی ہے جو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت پیش ہیں۔لیکن اس سے پہلے میں رسول پونپر کی یہ صراحت ارض کرنا چاہتا ہوں:

''زندگی تغیر مسلسل سے عبارت ہے۔تہذیبوں کی شکست وریخت کا عمل
کائنات کا عکاس بھی ہے اور امین بھی۔تہذیبیں مٹتی ہیں تو کھنڈرات اور
آثار ہی باقی رہتے ہیں جو ہمارے ماضی کے دُھندلکوں میں سے ہماری

قدیم تہذیب کی نقاب کشائی کرتے ہیں اور انسانی تاریخ کے اوراق بھی
اُلٹا کر ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑنے میں بہت حد تک حمد و معاون ثابت
ہوتے ہیں۔ کشمیر کو اپنے درخشندہ ماضی پر فخر ہے جو تاریخ کے اوراق
میں بھی محفوظ ہے اور آغوش ارضی میں بھی گویا ہے۔'' ۵؎

مندریں:۔ کشمیر میں ہندو عہد کے بے شمار مندریں موجود ہیں۔ جو ملک بھر میں مشہور ہیں ۔ یہ مندریں کشمیری فنکاری کے اعلیٰ نمونے پیش کرتے ہیں۔ مہاراجہ اشوک نے کشمیر میں بدھ ازم کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے عہد میں مندریں بنانے کی طرف خاص توجہ دی۔ ان کے تعمیر کردہ مندروں میں ''وجیشوری'' مندر مشہور ہے جس کے آثار آج بھی سرینگر سے پچاس کلومیٹر دُور ویجہ برور کے علاقے میں موجود ہیں۔ اشوک کے بعد راجہ گویادت نے اپنے عہد میں ایک مندر تعمیر کیا جو شنکر اچاریہ کی پہاڑی پر'' گو پادری مندر'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مندر تمام پرانے مندروں میں تقریباً واحد مندر ہے جو آج بھی آباد ہے۔

ساتویں صدی کے اواخر سے مہاراجہ للتا دتیہ ایک عظیم الشان بادشاہ کا دور شروع ہوا۔ انھوں نے تقریباً نصف صدی تک کشمیر پر حکومت کی ہے۔ اور اپنے دور کی کئی یادگاریں چھوڑ دیں ہیں۔ ان کے تعمیر کئے گئے مندروں میں ''مارتنڈ کا سوریہ'' مندر سب سے زیادہ وسیع اور عالیشان فنِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ جو مٹن اننت ناگ کے قریب ایک کریوہ پر واقع ہے۔ اس کے پتھروں پر کندہ مجسمہ سازی اور گل کاری کو دیکھ کر اس وقت کی کاریگری کی داد دینی پڑتی ہے۔ ان پتھروں کو تراشنے والے سنگتراش نہایت اعلیٰ مذاق اور خوبیوں کے مالک رہے ہوں گے۔ پتھر پر نقش و نگاری اور پالش سے اس تعمیر کی رونق کو دوبالا کیا گیا تھا۔ للتا دتیہ کی طرح اونتی ورمن کے تعمیر کردہ مندر ''اونتی سوامن'' اور اونتی ایشور'' شہر اونتی پورہ میں پتھروں کی صورت میں بکھرے پڑے ہیں اور زبان حال سے اپنے شاندار ماضی کی داستان دُہرا رہے ہیں۔ ان پتھروں کو دیکھ کر کشمیر کی کاریگری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندو عہد کے منادر میں پاندریٹھن مندر اور امرناتھ کی گھپا جو سب سے

بڑی پویتر مانی جاتی ہے۔مٹن کا متبرک مندر جہاں چشموں سے پانی نکل کر ایک تالاب کی صورت اختیار کرتا ہے اس تالاب کے بیچ میں چھوٹی سی سنگین بارہ دری بنوائی گئی ہے جس کے اندر شواجی کی مورتی ہے۔اس تالاب میں مچھلیوں کی کثرت بھی پائی جاتی ہیں۔دور دراز کا سفر طے کر کے لوگ اس کا نظارہ کرنے آتے ہیں۔مزید گدادھر مندر، ہنومان مندر اور رگھوناتھ مندر جو سرینگر کا سب سے پُر رونق اور بڑا مندر مانا جاتا ہے وغیرہ فنِ تعمیری کے اعلیٰ قدروں کے شاہد ہیں۔سروری صاحب لکھتے ہیں:

''دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح تعمیر کاری میں بھی، کشمیر کے فن کار اپنے نقوش چھوڑ گئے ہیں قدیم عہد میں کشمیر کی تعمیر کاری اپنے عروج کی منزلوں کو پہنچ چکی تھی، جس کا ثبوت ہم کو ہندو عہد کے آثار سے ملتا ہے۔ ان میں مارتنڈ، اونتی پورہ، پٹن، بنیار، پاندریتھن، وانگت اور پرسپور کے مندر قدیم عہد کی تعمیر کاری کے مہتم بالشان نمونے ہیں۔ مارتنڈ کا مندر للتادتیہ کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ اپنی وسعت، پتھروں پر کندہ کاری، اور ستونوں کے تناسب اور حسن کے اعتبار سے قابل دید عمارت ہے۔اونتی پورہ کے مندروں میں سنگتراش اور کندہ کاری، اس عہد کے شعور فن کی نمائیدگی کرتی ہے۔ان میں اور پاندریتھن کے مندر کے کام میں کشمیری تعمیر کاری کی ذہانت اور چابکدستی کا عروج نظر آتا ہے۔شنکر آچاریہ کا مندر جو شہر سری نگر کے قلب میں پہاڑی کی بلند چوٹی پر جسے فارسی مورخین تختِ سلیمان کے نام سے موسوم کرتے ہے واقع ہے، اپنی عظمت اور اپنے موٴقف کے لحاظ سے دارالحکومت کی زینت بنا ہوا ہے۔''[٦]

مساجد اور خانقاہیں:۔ کشمیر میں مساجد اور خانقاہوں کی تعمیرات بڑے پیمانے پر ہوئی ہیں۔جب سے کشمیر میں اسلام رائج ہوا تب سے بزرگانِ دین اور مسلم بادشاہوں نے مساجد اور

خانقاہوں کی تعمیرات میں بڑی دلچسپی لی۔جس کی روایت آج تک قائم و دائم ہے۔ ہر چند کہ آج بزرگانِ دین اور بادشاہ نہ رہے لیکن اس کے باوجود آج بھی کشمیری عوام کا یہ ایک خاص مشغلہ ہے۔ تقریباً کشمیر کے سب لوگ مساجد کی تعمیرات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ہر آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر مسجد کا پایا جانا لازم ہے۔ جہاں پنچگانہ نمازیں ادا ہوتی ہیں۔ ہر مسجد میں نماز جماعت ادا کرنے کے لئے ایک امام منتخب کیا جاتا ہے جو پانچوں وقت نماز پڑھانے کا پابند رہتا ہے اور پانچوں وقت ہر طرف اذانیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ مساجد ایرانی طرزِ تعمیرات کی غمازی کرتی ہیں۔ان میں غسل خانوں اور ایک بڑے حمام کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔حمام سردیوں میں مسجد اور پانی کو گرم کرنے کے لئے بے حد مفید ہے۔اب حمام کا رواج مسجدوں کے ساتھ ساتھ گھروں میں بھی ہوا ہے۔ جب کہ آج سے کچھ سال قبل عام گھروں میں حمام نایاب تھا۔ یہ کشمیری تہذیب کا اہم پہلو ہے۔ کیونکہ یہ سردی سے محفوظ ہونے کا بہترین ذریعہ ہے۔لغوی معنوں میں حمام غسل خانہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔لیکن کشمیر میں یہ دوسرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔یعنی ایک ایسا کمرا جو مخصوص سردی سے محفوظ ہونے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔حمام بنانے کے لئے پتھروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کمرے میں اس طرح تراشے گئے پتھروں کو لگایا جاتا ہے کہ پتھروں کے نیچے کمرہ بالکل خالی رہتا ہے اور اسی میں آگ جلا کر کمرہ گرم کیا جاتا ہے۔جس کو ’’حمام‘‘ کہا جاتا ہے۔

کشمیر کے پہلے مسلم بادشاہ رینچن شاہ نے اپنے عہد میں دریائے جہلم کے کنارے ایک خوبصورت مسجد تعمیر کرائی۔ جواب خستہ حال ہونے کی وجہ سے محکمہ آثارِ قدیمہ کے تحویل میں ہے۔شاہ میری دور میں سلطان سکندر نے سرینگر کی جامع مسجد کی بنیاد ڈالی۔ جو فن تعمیر کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔اس مسجد کے نقش ونگار دیکھ کر کشمیر کی مینا کاری کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔بشیر اختر لکھتے ہیں:

> ’’یہ عالی شان مسجد چوبی فن تعمیر کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ بلحاظ وسعت کشمیر کی کوئی مسجد اس کے مقابلے کی نہیں ہے۔ مسجد کی سلسلۂ عمارت ایک سطح اور چوکور رقبے پر محیط ہے جس کے درمیان ایک کشادہ صحن

ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کیلئے مشرق شمالاً و جنوباً بیت بلند چوبی میناروں کے نیچے وسیع اور کشادہ دروازے ہیں۔ مسجد مغرب میں شاہی دروازہ ہے۔ صحن کے اردگرد چاروں طرف محراب دار دالان ہیں اور ہر دالان کے وسط میں چالیس چوبی ستونوں پر قائم خوبصورت مینار و بام۔ ان میں ہر ستون کی بلندی ۶۶ فٹ اور موٹائی ۷ فٹ ہے۔ دور سے دیکھنے پر ان دیوقامت ستونوں کی قطاریں بہت دلکش معلوم ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ مسجد کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت تالاب ہے جس میں آٹھوں پہر پانی رہتا ہے۔ تالاب کا حوض سنگِ سیاہ سے سجایا گیا ہے۔''ے

یہ مسجد کئی بار آتش زنی کے آغوش میں آئی۔ کشمیر عوام نے ہر بار اس کی مرمت کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے علاوہ سکندر کے عہد میں حضرت میر محمد ہمدانیؒ کی فرمائش پر کئی خانقاہیں تعمیر ہوئیں جو مٹن، شاہ آباد، بارہ مولہ اور سوپور قصبوں میں واقع ہیں۔ عبادت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا کام بھی ان خانقاہوں میں کیا جاتا تھا۔ عقیدت مند لوگ ان خانقاہوں کو بے حد مقدس مانتے ہیں۔ شہمیری دور کی جامع مسجد بجباڑہ اور زین العابدین کی تعمیر کردہ جامع مسجد شوپیاں کشمیر کی اعلیٰ فنِ تعمیری کی زندہ مثالیں ہیں۔

جہانگیر کی ملکہ نور جہاں کی تعمیر کردہ پتھر مسجد فنِ تعمیری میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ مسجد دریائے جہلم کے بائیں کنارے خانقاہ معلیٰ کے بامقابل اُس پار واقع ہے۔ یہ مسجد پتھروں سے بنائی گئی ہیں۔ سکھوں نے اپنے دور میں اس مسجد کو کئی بار ضبط کر لیا تھا۔ اس عالیشان مسجد کی فنِ تعمیری کے تعلق سے ایم۔ ایس۔ ناز رقمطراز ہیں:

''ان پتھروں کے نقش نگار اور بیل بوٹے ہر دیکھنے والی آنکھ کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ہر پتھر کو اس کے طول و عریض حجم کے باوجود اس خوبصورتی سے تراشا گیا ہے اور اتنی صفائی سے ایک دوسرے میں

پیوست کیا گیا ہے کہ ساری مسجد فقط ایک پتھر کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔بعض سیاح پہلی نظر میں دیکھتے ہیں تو انھیں دھوکہ ہوتا ہے کہ اسے کسی پہاڑ میں سے تراشا گیا ہے۔''۸؎

شاہجہاں کے فرزند داراشکوہ نے ہاری پربت کے جنوبی دامن میں ایک سنگ اہنگ کی مسجد تعمیر کرائی ہے۔ یہ مسجد آج بھی روضہ مخدوم صاحب کے نشیب میں واقع ہے۔اس کے علاوہ کشمیر میں اور کئی مسجدیں تعمیر ہوئی ہیں۔ بڑشاہی مسجد اور مسجد حضرت بل جہاں حضرت عربی محمد رسولؐ کا موئے مبارک موجود ہیں۔فنِ تعمیر کے بہت بڑے نمونے ہیں۔ دور دراز کا سفر طے کر کے اس موئے مقدس کا دیدار کرنے لوگ آتے ہیں۔لارنس لکھتے ہیں:

''درگاہ حضرت بل جھیل ڈل کے کنارے پر نہایت خوبصورت پس منظر میں واقع ہے اور یہاں پر مارچ میں ایک بھاری میلے کا انعقاد ہوتا ہے۔ جس میں شرکت کرنے کے لئے وادی کے تمام حصوں سے ہزاروں لوگ آتے ہیں۔اپنے ہمراہ یہ لوگ مشہور اولیا کرام کے پرچم بھی لاتے ہیں۔حضرت بل کا تقدس یہاں پر موجود موئے مقدس آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب ہے جسے سید عبداللہ نے ۱۱۱۱ھ میں مدینہ شریف سے لایا تھا۔اس نے یہ موئے مقدس ایک تاجر نورالدین کو ایک لاکھ روپے کے عوض فروخت کیا۔نورالدین نے اس موئے مقدس کی نمائش سرینگر میں کی۔''۹؎

مسجدوں اور خانقاہوں کے ساتھ ساتھ لوگ یہاں کے صوفی بزرگ ہستیوں کی زیارت گاہوں کو بھی معتبر اور مقدس مانتے ہیں۔ اور حاجت روائی کے لئے اکثر بیشتر ان کی چوکھٹ تک حاضری دیتے ہیں۔

حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ چودھویں صدی کی آخر میں علاقہ کیموہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ محترمہ کا نام سدرہ ماجی تھا۔انھوں نے اسلام کی ترویج اور اس کا پیغام کشمیری عوام تک

پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کشمیری لوگ انھیں شیخ العام اور نندرشی کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کی قرارگاہ چرار شریف میں ہے۔ اس مزارِ شریف اور اس کے ساتھ ایک خانقاہ کی بنیاد زین العابدین نے ڈالی تھی۔ اس خانقاہ کی دیواروں میں کشمیری ڈیزائن میں ایک خاص طریقے سے لکڑی کی شہتیریں جوڑی گئی ہیں۔ مزار شریف بہترین نقش و نگار سے مرصع ہے۔ شیخ العالم خلفاء میں بابا زین الدین ریشی کی قرارگاہ عیش مقام پہاڑی کی ڈھلان پر واقع ہے۔ اور وہاں سے آٹھ کلومیٹر دور دریائے لدر کے ساحل پر بُمہ زو علاقہ میں بابا بام الدین کی زیارت گاہ ہے۔ ان فنِ تعمیرات کو بشیر اختر یوں سراہاتے ہیں:

> ''کشمیر میں ریشی زیارت گاہوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی چار بام چھت ہے جو چینی طرز کے پگوڑوں کو مدنظر رکھ کر اپنائی گئی ہے۔ اس طرز میں ایک دوسرے کے اوپر تین سے چار تک بام تعمیر کئے جاتے ہیں جن کے آخر پر خالص کشمیری طرز کا چار پہلو والا دریچے دار مینار (برنگ) کھڑا کیا جاتا ہے۔ یہ مینار خالص لکڑی کا بنا ہوتا ہے جس میں طرح طرح کی کندہ کاری کی گئی ہوتی ہے۔ مینار کا کلس عام طور پر پیتل اور کہیں کہیں سونے کا ہوتا ہے۔''[۱۰]

حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومؒ نے وادی کشمیر میں اصلاح عقائد میں بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ حضرت سلطان کشمیری صوفی سلسلے کے وہ عظیم بزرگ ہے جنھوں نے نہ صرف تصوف کی بلند منزلیں طے کیں بلکہ ان کی آرام گاہ بھی بلندی پر سرینگر کے وسط میں کوہ ماران کے ڈھلان پر واقع ہے۔ جہاں سے شہر کے مختلف علاقوں میں رہنے والے دور سے بھی فیض اور برکت حاصل کرتے ہیں۔ ان کے خلیفہ بابا داؤد خاکیؒ بھی وہی پر مدفن ہے۔ ان کے روضہ کے اردگرد کئی تعمیرات ہیں جن میں حمام مسجد، ذاکر مسجد، مریم محل اور ذرا اُوپر ایک خانقاہ شامل ہے۔ روضہ پاک کے مغرب میں نئی طرزِ تعمیر پر سنگِ مرمر کی ایک وسیع خوبصورت مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ مسجد کے علاوہ

مستورات کے لئے مریم محل کے جنوب میں ایک عبادت گاہ تعمیر کیا گیا ہے۔صحن کے فرش کو تراشے گئے خوبصورت پتھروں سے جلا بخشی گئی ہیں۔نئی تعمیرات میں فرش بندی کے علاوہ مشرقی سمت میں ایک قد اور دیوڑھی کی تعمیر بھی شامل ہے جسے بابِل سلطان کا نام دیا گیا ہے۔زیارت گاہ کو وسعت دینے اور اس کو مزید خوبصورت بنانے میں عقیدت مند اپنا کردار ادا کر رہے ہیں اور دل کھول کر اس کام میں اپنی دلچسپی دکھارہے ہیں۔یہاں تعمیر کیا گیا تالاب جدید طرزِ تعمیر کا ایک منفرد شاہکار ہے۔ اس تالاب کی دو منزلیں ہیں۔اس تالاب کو وضو بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

پیر دستگیر حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کی خانقاہ سرینگر کے محلّہ خانیار میں واقع ہے۔ اس کے ساتھ وہاں آستان عالیہ کی زیارت بھی ہے جس کے اندر سید عبدالقادر جیلانیؒ کے موئے مبارک موجود ہے۔سرینگر کے محلّہ خواجہ بازار میں حضرت شاہ نیاز نقشبندیؒ کی زیارت ہے۔مغل دورِ حکومت میں اس زیارت کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مقدس کچھ عرصہ قبل اسی زیارت گاہ میں تھا۔بعد میں جگہ کی تنگی کو محسوس کر کے موئے مقدس درگاہ حضرت بل منتقل کیا گیا۔وادی کشمیر میں جب بھی کوئی آفت آتی ہے۔تو لوگ ان ہی مقدس زیارت گاہوں پر جا کر رجوع کرتے ہیں۔اور خدا تعالیٰ سے اپنی حاجت روائی کرتے ہیں۔

موسیقی:۔ کشمیر کی موسیقی خاصیت کے لحاظ سے سنجیدہ اور مدہم ہونے کے ساتھ ہی شوخ بھی ہے۔فطری طور پر یہ صوفیانہ موسیقی کی طرح دلپزیر و فرحت بخش بھی ہے اور دلگیر و غمگین بھی۔ کشمیری میں موسیقی کی تین قسمیں ہیں۔''صوفیانہ موسیقی'' جو موجودہ نسل کو ورثے میں ملی ہے۔یہ کلاسیکی اور روایتی موسیقی بھی کہلاتی ہے۔''لوک موسیقی'' دوسری قسم کی موسیقی ہے جس میں چھکری ٗونہ ونٗ اور روف وغیرہ شامل ہے۔''جدید ہلکی موسیقی'' تیسری قسم کی موسیقی کہلاتی ہے غزل، گیت اور کورس نغمے اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

صوفیانہ استاد کم سے کم تین ساتھی موسیقاروں کے ساتھ مل کر ایک مقام یا راگ کو

سازوں کی سنگت کے ساتھ چھیڑ دیتا ہے اوراس کی حسن ودلکشی کو سننے والوں پر عیاں کر دیتا ہے۔ استاد اوراس کے ساتھی موسیقار گاہک بھی ہوتے ہیں اور سازندے بھی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر گیت گاتے ہیں۔ جسے ''بأ تھ'' کہا جاتا ہے۔ صوفیانہ موسیقار شمالی ہند کے موسیقار کی طرح وقت کے اُصولوں کا سختی سے پابند ہوتا ہے۔ وہ کسی مقام کو کسی محفل میں یا ریڈیو پر وقت کے اُصولوں کو توڑ کر پیش کرنا بے حرمتی کے مترادف سمجھتا ہے۔ صوفیانہ موسیقی کلاسیکی رنگ میں ہو بہو اُسی انداز سے اپنی تالوں میں گائی جاتی ہے جو انداز اور تال اس کے لئے ابتداء سے رائج تھا۔ صوفیانہ موسیقی میں موسیقی کو جوں کا توں رکھنے سے اس کے دلدادہ اس سے حظ اُٹھاتے رہے اور آج بھی جب کہ اہستہ روی پر مبنی موسیقی سننا لوگ کم پسند کرتے ہیں تاہم اس کے شایقین کی تعداد کتنی ہی تھوڑی کیوں نہ ہو اس سے برابر لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ اس میں گائی جانے والی غزلوں کو مقدس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انہیں بزرگانِ دین سے وابستہ کرتے ہیں۔ یوسف شاہ چک اور ان کی بیگم حبہ خاتون نے صوفیانہ موسیقی کی تزئین میں کافی وقت اور محنت صرف کیا۔ وہ دونوں موسیقی کے سر پرست ہی نہیں بلکہ خود بھی موسیقار تھے۔ صوفیانہ موسیقی میں سُر صرف اُستاد شروع کرتا ہے۔ وہی بأ تھ کو مکمل طور پر گاتا ہے یا ایک نیم مصرعہ ادا کرتا ہے جس کے بعد گروپ کے دوسرے موسیقار اس کے ساتھ لے سے لے ملا کر گاتے ہیں۔ کئی بار ایک مقام کو واحد آواز میں پیش کرنے کی کوشش بھی ہوئی ہیں اس بارے میں محمد عبداللہ تبت بقال کی مثال قابل ذکر ہے۔

لوک موسیقی پہاڑوں اور وادیوں سے لیکر شہر کی پُر شور گلیوں تک عام آدمی ہی نہیں بلکہ بڑے عہدیداروں، صوفیوں، فقیروں، سادھوؤں اور سیاحوں کی مرغوب اور پسندیدہ موسیقی رہی ہے۔ لوگ گیت گانے والے، جن میں مرد وخواتین دونوں شامل ہوتے ہیں، موقعہ ومحل کے مطابق رومانی اور دوسرے گیت اپنی میٹھی اور مترجم آواز میں گاتے ہیں۔ تہوار، میلے اور شادی جیسے مختلف تقریبات یا کسی بھی دوسرے موزون موقعہ پر موسیقاروں کو بلایا جاتا ہے اور وہ اپنے فن سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بناتے ہیں۔ لوک موسیقی کی وقت اور موقعہ ومحل کی مناسبت سے الگ الگ طرحیں ہیں۔

ونہ ون کے گیت شادی بیاہ کے موقعہ پر گائے جاتے ہیں۔اس کا انداز اچھوتا اور رنگین قسم کا ہے اور اس میں آواز کی کیفیت بھی ساتھ ساتھ بدل جاتی ہے۔شادی بیاہ کے موقعہ پر ابتداء سے لیکر دلہن کے سسرال پہنچنے تک جو بھی مراحل آتے ہیں ان کے تعلق سے الگ الگ گیت گائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ عقیقہ۔منڈن اور ختنہ جیسی رسموں پر بھی ونہ ون کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

''روف'' تہوار رمضان کے مہینہ کے موقعہ پر گایا جاتا ہے۔ونہ ون کی طرح روف کے گیت بھی ابتداء سے عورتیں ہی گاتی رہی ہیں۔ایم۔ایس۔ناز لکھتے ہیں:

> ''رؤف سہیلیوں اور سکھیوں کا رقص ہے گھر کے آنگن یا گوشہ میں محلے یا گاؤں کی لڑکیاں بالیاں آمنے سامنے دو قطاروں میں کھڑی ہوجاتی ہیں۔ایک لڑکی دوسری لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال لیتی ہے اور دوسری تیسری لڑکی کی کمر میں۔یوں ہر قطار کی آٹھ دس لڑکیاں ایک دوسری کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اور پاؤں سے پاؤں ملا کر کھڑی ہوجاتی ہیں۔اسی طرح سامنے کی قطار کی لڑکیاں ایک دوسری کی کمر میں ہاتھ یا بازو ڈال کر ایستادہ ہوتی ہیں، کمریں جھکتی ہیں، گردنوں میں لہریں پیدا ہوتی ہیں اور پاؤں آہستہ آہستہ آگے پیچھے ہوتے ہیں۔جسم و جاں کی پُرسکون حرکت کے ساتھ ساتھ لب بھی ملتے ہیں اور گیت کے بول پھول کی پتیوں پر شبنم کے قطروں کی طرح تازگی اور شگفتگی کا سماں پیدا کرتے ہیں۔''[11]

اس طرح مذہبی، نیم مذہبی اور عوامی زندگی سے تعلق رکھنے والی تقریبوں پر موسیقی کا خاص دخل ہوتا ہے۔حتیٰ کہ نئی برف باری یا کھیتوں میں بیج بونے کے وقت آس پاس کی فضا روف کی رسیلی لہروں سے جھوم اُٹھتی ہے۔لوگ گیتوں میں بے پناہ درد اور سوز گداز ملتا ہے۔کشمیری لوک گیتوں کی مدھر آواز سن کر شاید ہی کوئی ایک ٹھنڈی آہ نہ بھر دے۔جب دور کسی گاؤں میں معصوم دوشیزائیں روف کے طرز پر گیت گا رہی ہوں:

''زون کھڑ مئے لوپییہِ مئے ببرے۔۔۔
چاند نکلا ریحان کے پودے پر شبنم گری
ویسی زونے بے کسن خبرے۔۔۔
اے چاند! اُتر آ اور بیکسوں کا حال پُوچھ
بأ ے واجبن بأ ے یوان خبرے۔۔۔
جن کے بھائی ہوتے ہیں وہ انکی خبر گری کے لئے آتے ہیں۔
یس نہ آسان سوہ چھہ روزان نظرے۔۔۔
اور جن کا (بھائی) نہیں ہوتا وہ بس راستے تکا کرتی ہے۔''[۱۲]

اس طرح لوک موسیقی کو زندہ جاوید رکھنے میں عورتوں کا اہم کردار رہا ہے۔انفرادی طرز کے گیتوں کے ساتھ ساتھ مذہبی طرز کے گیتوں کی بڑی تعداد بھی لوک موسیقی میں موجود ہے جن کو خواتین دو قطاروں کی صورت میں جڑ کر گاتی ہیں۔مذہبی گیتوں کے تعلق سے چند گیت ملاحظہ ہو:

''آیہ قوران رودم پَرنے۔۔۔آیت فرمان کی تلاوت مجھ سے نہ ہوسکی
سے شرنے ژوُلُم زانہہ۔۔۔اس کا افسوس کبھی دل سے نہ گیا
خوداصاً ب رودم سَرنے۔۔۔اللہ کی تلاش وعرفان مجھ سے نہ ہوسکا
سے شرنے ژوُلُم زانہہ۔۔۔اس کا افسوس کبھی دل سے نہ گیا
تس بندگی روزم کَرنے۔۔۔اس کی بندگی مجھ سے نہ ہوسکی
سے شرنے ژوُلُم زانہہ۔۔۔اس کا افسوس کبھی دل سے نہ گیا''[۱۳]

چھکری لوک موسیقی کی ایک مقبول صنف ہے۔اس میں کم سے کم چار موسیقار حصّہ لیتے ہیں۔سارنگ، رباب، تمبکھ ناری اور نوٹ (گھڑا) اس کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔افغانوں کے دور حکومت میں اس کے ساتھ ایک ناچنے والا ''بچہ'' منسلک ہوا۔جسے کشمیری میں ''پیش واز'' کہا جاتا ہے۔اس کو خاص رقاصہ کا لباس زیب تن کیا جاتا ہے۔گانا شروع کرنے سے پہلے کشمیر کے دو برگزیدہ صوفیائے کرام کی رباعیاں محفل موسیقی میں سنجیدگی اور پاکیزگی کے نام پر گائی جاتی ہے۔ان کے

گانے میں ساز،آواز کے ساتھ برابر سنگیت نہیں کرتے بلکہ چندسُر وں کی جھنکار سے سماں باندھ دیتے ہیں۔چھکری مرد اور خواتین گلوکار دونوں گاتے ہیں۔غلام محمد بٹ،غلام محمد ڈار،حبیب اللہ بمبو،علی محمد شیخ،زون بیگم،غلام احمد صوفی اور گوپی ناتھ چندروغیرہ چھکری گانے میں مشہور رہے ہیں۔لوک موسیقی میں ''نیندبأ تھ'' اور'' ہکچہ بأتھ'' بھی مشہور ہیں۔جن کو چنار کے سائے میں زیادہ تر گایا جاتا تھا۔اس میں تھالی اور گھڑا ساز کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اوراس کے ساتھ گھنگرو بھی لگائے جاتے ہیں۔'' نیندبأ تھ'' شالی کے پودے لگانے اور ان سے گھاس پھوس نکالنے کے موقعہ پر عام طور سے گائے جاتے ہیں۔فصل کی کٹائی کے موقع پر کاشتکاروں کی خوشی کا مظاہرہ اُس وقت ہوتا ہے جب چھکری، ہکچہ بأ تھ اور روف کی گونج شام کی خاموشی کو توڑ دیتے ہیں۔کاشتکار جوش،شوق اور چاؤ کے ساتھ گیت گاتے ہیں۔

ہلکی موسیقی جدید قسم کی ہے۔جو پچھلے ستر سال سے رائج ہے۔اس سے قبل لوک موسیقی کا ڈھانچہ سیدھا سادہ،تال عام فہم اور نغمے کا پھیلاؤ چند سُر وں تک محدود تھا۔اس کے برعکس فارسی موسیقی زیادہ جامع اور سنجیدہ تھی اوراس کو زیادہ پسند بھی کیا جاتا تھا۔یہ فارسی غزلیں کئی تالوں میں گائی جاتی تھیں۔اس سے مقامی موسیقار متاثر ہوئے۔رفتہ رفتہ اس طرز کی موسیقی میں کشمیری موسیقاروں نے کشمیری غزلیں اور گیت کھپائے اور یہ خواص میں مقبول ہوتے گئے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ فن کار اکثر واحد آواز میں غزل گانے کی سعی کرتے تھے۔لیکن انہیں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے کوئی ذریعہ میسر نہیں تھا۔اس لئے ریڈیو کشمیر نے کشمیر کی جدید ہلکی موسیقی کو بروقت سہارا دیا۔اسی دوران ریڈیو کشمیر نے آشا بھونسلے سے گانے کی فرمائش کی جس نے کشمیری انداز کو برقرار رکھکر کشمیری گیت گایا۔اس سے کشمیری ہلکی موسیقی کی چال بھی بدل گئی اور رومانی رنگ بھی نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگا۔

''جولائی 1948ء کے بعد کشمیری ہلکی موسیقی کے افق پر کئی نامور غزل گو
موسیقار نمودار ہوئے۔مردوں میں غلام حسن صوفی،غلام محمد راہ،علی محمد،
جلال گیلانی،اونکار ناتھ کول اور خواتین میں راج بیگم،نسیم اختر،آشا کول

اور نرملا دیوی نے کافی شہرت پائی ہے۔نسم بیگم پنجابی زبان بولنے والی
ایک خاتون ، ریڈیو کشمیر کے ابتدائی دنوں میں کشمیری گانے نشر کرنے
والی پہلی خاتون تھی۔اس کے بعد باصلاحیت اور با اثر گلوکارہ راج بیگم
اس میدان میں آئی۔''[۱۴]

اس کے علاوہ کشمیر میں موسیقاروں کا ایک پیشہ ورانہ طبقہ ہے جنہیں ''بھانڈ'' کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اکثر ''سورنے'' (شہنائی سے ملتا جلتا ساز) بجایا کرتے ہیں اور اس کی سنگیت میں گاتے بھی ہیں۔گاؤں میں بھانڈ دیہاتیوں کے لئے ہنسی خوشی کا سامان میسر کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں گانے بھی سناتے ہیں جو زیادہ تر موسیقی پر مبنی ہوتے ہیں۔انسانی کمزوری کی نقالی میں انہیں مہارت حاصل ہے۔ یہ طبقہ اکثر کسی سماجی بُرائی کو طنز کا نشانہ بنا کر پیش کرتے تھے۔ ان کے اندازِ ایکٹنگ میں طنز کم مزاح کی چاشنی زیادہ پائی جاتی ہے۔آج سے بیس سال قبل لوگ انہیں شوق سے شادی بیاہ کے موقعہ پر ناٹک کے لئے بلاتے تھے اور دیکھنے والے شوقین دور دور سے آ کر اس میں حصّہ لیتے تھے۔ اسی دور میں طنز کے لئے ایک اور صنف کشمیر میں رائج تھی جسے ''لیڈی شاہ'' کہا جاتا ہے۔لیڈی شاہ کوئی بھی بن سکتا تھا اور لوہے کا ایک سیخ لئے گاؤں گاؤں پھرتا تھا اس لوہے کے سیخ میں چند لوہے کے کڑے ہوتے تھے جنہیں بجا کر وہ ساز کا کام لیتا تھا۔لیڈی شاہ سماج کی برائیوں پر طنزیہ نغمے گاتا تھا یہ نغمے موسیقی کے لحاظ سے ایک ہی قسم کے ہوا کرتے تھے۔''بانڈپائَ تھر'' اور ''لیڈی شاہ'' کے علاوہ محاوارت ،ضرب الامثال اور کہاوتوں میں بھی سماجی اور طبقاتی برائیوں پر طنز کے نقوش نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ لوک موسیقی بھی اس سے خالی نہیں ہے۔اس میں بھی طنز اور ہجو کے غالب رجحانات نظر آتے ہیں۔ جب شادی بیاں کے موقعہ پر عورتیں ''ونہ وون'' میں دلہے میاں کو طنز کا نشانہ بناتی ہیں۔گیت ملاحظہ ہو:

''مہرنی دیدی یے ہُبس کُن وُچھتے۔۔۔۔
پیاری دلہن! آسمان کی طرف تو دیکھ لے

بس کھوتۂ بوڈ مہراز ہےَ اوے۔۔۔۔
تمہارے لئے (تمہارا) باپ سے بڑا دلہا آگیا
پانژ پیٹھی چھکھ سا پنژاہ وُہرُے۔۔۔۔
تمہاری عمر تو پچپن سال کی ہے
بڈوَلہ وُنہِ چھکھا انہو رئے۔۔۔۔
اے او بڈھے کھوسٹ! کیا تم ابھی کنوارے ہی ہو"۱۵

جہاں تک بجانے والے سازوں کا تعلق ہے ان میں سنطور، سارنگی، گھڑا، تمبخ ناری، ستار، رباب اور ساز وغیرہ موسیقی کے لئے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

سارنگی:۔ سارنگی میں تین سے بارہ تک تار ہوتے ہیں۔لوک موسیقی میں اسے پسند کیا جاتا ہے۔چھکری میں سارنگی کے ساتھ رباب اور گھڑا بجایا جاتا ہے۔اس کی آواز میں نرمی اور حلاوت ہے چھکری کو گونج بخشنے والا واحد کمان والا ساز یہی ہے۔غلام حسن صوفی، علی محمد شیخ، غلام قادر لنگو اور غلام قادر بٹ نے سارنگی بجانے کے میدان میں کافی شہرت پائی۔

رباب:۔ رباب کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ افغانوں کے دورِ حکومت سے یہ کشمیری موسیقی میں رائج ہوا۔ یہ چھکری کے ساز اور لے کو پرسوز بنانے کے علاوہ ایک جوش اور ایک زندگی سی بخشتا ہے۔اس ساز کی آواز اور بجانے کا ڈھنگ بہادری اور زور آزمائی کا پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس فن میں ثناءاللہ بٹ نے کافی شہرت پائی ہے۔آزادی سے قبل انھوں نے کئی علاقوں کی سیر کی اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔کہا جاتا ہے جب وہ رباب بجاتے تھے تو لوگ حیرت میں پڑ جاتے تھے اور اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ ثناءاللہ بٹ کے ہاتھ سونے کے ہیں۔

ستار:۔ ستار صوفیانہ موسیقی کا ساز ہے۔اس کی ڈنڈی کوئی دو انچ چوڑی ہوتی ہے اور اس کے اوپر سات تار بچھائے ہوتے ہیں۔ بجائے جانے والے پہلے دو تار ساتھ ساتھ ہوتے ہیں دوسرے تار کو پہلے تار کے ساتھ ملانے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔اس کو بجاتے وقت سروں کو

تھوڑا سا ہلا یا جاتا ہے جس سے تھوڑی سی نزاکت پیدا ہوتی ہے۔

سنطور:۔کہا جاتا ہے سنطور ایران یا ترکستان سے یہاں آیا ہے۔اس پر سو تار کھچے ہوتے ہیں۔ ہر چار تاروں کو ایک گوٹے پر چڑھایا گیا ہوتا ہے۔ایک سُر کے آٹھ تار ہوتے ہیں جنھیں دائیں بائیں باندھا گیا ہوتا ہے۔عموماً اسے بائیں طرف بجایا جاتا ہے۔دائیں طرف کے تار پیتل کے ہوتے ہیں اور باقی سب تار لوہے یا فولاد کے ہوتے ہیں۔پیتل کے تار ہونے کی وجہ سے یہ گرام آواز پیدا کرتے ہیں۔اسے لکڑی کے قلموں سے بجایا جاتا ہے۔صوفیانہ موسیقی میں اسے ایک فخریہ مقام حاصل ہوا۔

ساز:۔ساز کو صوفیانہ موسیقی میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔لیکن زمانہ کی بے رخی کی وجہ سے اب یہ ناپید ہو رہا ہے۔اس کے اوپر تین تار ہوتے ہیں دو تار ریشم کے اور ایک فولاد کا۔ ان تاروں کے نیچے باقی تار ہوتے ہیں۔اس ساز کو گز سے بجایا جاتا ہے۔جس سے شروتیاں نکلتی ہیں۔اور صوفیانہ موسیقی کی اصل شکل اور گانا صحیح انداز میں سامنے آتا ہے۔

تمبخ ناری:۔تمبخ ناری شادی بیاہ کے موقعہ پر عموماً خواتین بجاتی ہے۔بجانے کا ڈھنگ نہایت سیدھا سادہ ہے۔ یہ مٹی کی بنی ہوتی ہے اور اس کے سرے پر خاص طور سے تیار کی ہوئی کھال لگی ہوتی ہے۔اس کو انگلیوں سے بجایا جاتا ہے۔

نوٹ (گھڑا) :۔نوٹ مٹی کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ چھکری میں اکثر اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔نوٹ کے پھیلاؤ پر کبھی کبھی انگوٹھی پہنے ہاتھ سے نزاکتیں پیدا کی جاتی ہے۔اس کو بجانے میں موسیقار غلام احمد ڈار اور غلام حسن صوفی مشہور رہے ہیں۔

نگارہ:۔اس کا استعمال بھانڈ طبقہ کرتے ہیں۔اسے دو چھڑیوں سے بجایا جاتا ہے۔ اس پر چڑھائے گئے چمڑے کا منہ آسمان کی طرف ہوتا ہے۔شکل پیالے کی طرح ہوتی ہے۔اسے لے میں روانی پیدا ہوتی ہے۔

دستکاری:۔ کشمیر کے لوگ فطرتاً حسن پرست، فن شناس اور پُرخلوص ہوتے ہیں۔ کشمیری دستکار قدیم دور سے ہی اپنی فن کارانہ صلاحیت کے لئے مشہور ہیں۔ پندرھویں صدی عیسوی میں کشمیر کی دستکاریوں کو سلطان زین العابدین (بڈشاہ) کی سرپرستی میں ایسی حوصلہ افزائی ملی جو کشمیر کی تاریخ میں نا قابل فراموش ہے۔ انھوں نے تقریباً آدھی صدی تک کشمیر پر بڑے امن وامان سے حکومت کی اور فلاح و بہبود کے لئے ہر ممکن کوششیں کیں۔ ان کے بنائے ہوئے دستکاری کے بے مثال نمونے مختلف عمارات اور مذہبی مقامات کی آرائش وتزئین کے لئے دنیا کے مختلف مقامات میں پہنچ گئے۔ زین العابدین کو تیموؔر کے زمانے میں سمرقند جانے کا موقعہ بھی ملا تھا اور وہاں کی فن کاری کو دیکھ کر کافی متاثر ہوا۔ تیمور کے انتقال کے بعد جب کشمیر واپس آیا تو وہ بہت سے فن کاروں کو کشمیر میں آباد کرنے کی غرض سے اپنے ساتھ لیتا آیا۔ یہاں ان کی حوصلہ افزائی کی اور بہترین مواقع فراہم کئے۔ زین العابدین کے عہد میں کشمیر کی دستکاری کو بہت فروغ ملا۔

مغلوں کے دور میں کشمیری دستکاریوں کو کافی وسعت ملی۔ مغل حکمران کشمیر سے والہانہ محبت کرتے تھے اور اسے سنوارنے اور بنانے کی ہر ممکن کوششیں کیں۔ جس کا ثبوت ان کے بنائے گئے باغات، مساجد اور قلعوں سے ملتا ہے۔ ان کے دورِ حکومت میں شال بافی کا کام عروج پر پہنچ گیا۔ سکھ عہد میں بھی کشمیری دستکاری عروج پر تھی۔ اگر چہ سکھ حاکم کشمیریوں کے لئے اچھے ثابت نہ ہوئے۔ پھر بھی انھوں نے کشمیری دستکاریوں کی طرف خاطر خواہ توجہ دی۔ انھوں نے ویری ناگ کے قریب کاغذ سازی کا ایک بڑا مرکز قائم کیا تھا۔ جہاں کا بنا ہوا کاغذ پنجاب بھیجا جاتا تھا۔ دھات کے کام کو بھی فروغ دیا۔ ان کے دور میں شال کی مختلف قسمیں تیار کی جاتی تھی اور ان شالوں کو یورپ کی منڈیوں میں بھیجا جاتا تھا۔ کشمیر کے شال کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ کشمیر ہندوستان میں دستکاری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ مگر ہاتھ سے بنائے گئے مال کی جگہ مشینوں سے بنائے گئے مال نے لی جس کا اثر براہ راست کشمیر کی دستکاری پر پڑا اور اس کا کاروبار سمٹ کر رہ گیا۔ کشمیری دستکاری کی کئی قسمیں ہیں جو

درجِ ذیل ہے۔

شال بافی:۔ مورخین کے مطابق شال بافی کا کام زین العابدین کے زمانے سے شروع ہوا۔ انھوں نے ترکستان سے کئی شال بافوں کو کشمیر لایا اور یہاں کے لوگوں کو اس فن سے متعارف کرایا۔ ایم یاسین نے رسالہ رشیرازہ میں ''کشمیری دستکاری'' کے عنوان سے ایک بڑا مضمون تحریر کیا ہے۔ جس میں انھوں نے شال تیار کرنے کے دو طریقے بتاتے ہیں۔ ایک طریقہ میں شال بنانے کے ساتھ ساتھ اس پر نقش نگار بھی بنائے جاتے تھے جس میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ کسی مشکل ڈیزائن والے شال کو بنانے میں کم از کم اٹھارہ مہینے لگ جاتے تھے۔ پھر انیسوی صدی میں ایک نئے طریقے سے اس کام کو انجام دیا جانے لگا۔ یعنی ایک شال کو بیک وقت دو تین کھڈیوں پر تیار کرنے کا کام شروع ہوا اور بعد میں مختلف کھنڈیوں پر بنے ہوئے ٹکڑوں کو یکجا کر کے اس طرح جوڑ دیا جاتا ہے کہ فرق کا احساس نہ ہوتا۔ اس طرح اس کام کو صرف نو ماہ کے اندر اندر تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس تعلق سے ایم یاسین لکھتے ہیں:

> ''شال بنانے کا دوسرا طریقہ کم وقت میں طلب اور مقبول ہے۔ اس طریقے کو پہلی بار ۱۸۵۳ء میں خواجہ یوسف ایک آرمینین ایجنٹ نے اپنایا اور کشیدہ کی ہوئی شال کو کھڈی پر بنی ہوئی شال کے مقابلہ پر ۱/۳ قیمت پر بیچا۔ عام کاری گروں نے جب یہ دیکھا کہ اس طریقے سے شال کو بہت ہی کم وقت میں زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنایا جا سکتا ہے تو انھوں نے بھی اس طریقہ کو اپنا لیا۔ اس طریقے سے شال بنانے کی صورت میں نقش کو سب سے پہلے ایک نہایت صاف، لیکن سادہ کپڑے پر کاغذ سے پنسل یا خام سیاہی کے ساتھ اُتارا جاتا ہے۔ نقش اُتارنے میں کافی احتیاط برتی جاتی ہے۔ بعد میں اس کپڑے کو تن کر سوئی کی مدد سے مختلف رنگوں کے دھاگوں یا طبلّے سے اس نقش کو پُر کر دیا جاتا ہے۔ کشمیری بہترین کشیدہ کار ہیں اور ان کو نقش کرنے کی صلاحیت حیرت

انگیز ہے۔شالوں پر بنائے گئے ڈیزائنوں میں فطری حُسن کی جھلک
بہت زیادہ ملتی ہے۔''[۱۶]

کشمیر کی دستکاریوں میں شال بافی کا کام وسیع پیمانے پر ہوتا ہے۔اس کے مختلف اقسام ہیں۔دوشال (جوڑا شال) حاشیہ دار، دوحاشیہ دار، چہار حاشیہ دار، چاندار، جالی دار، قلم کار، سادہ اور گل بدن وغیرہ۔اس کام کے لئے سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ایک شال بنانے میں کئی کاری گروں کا حصہ رہتا ہے۔مرد وزن دونوں کا اس میں عمل دخل ہوتا ہے۔عورتوں کا کام اکثر اُون کا تنا ہوتا ہے۔ باقی دھاگوں کو ڈھنگ سے رنگ دینا اور نقش نگار بنانے والا کام مردوں کا ہیں۔ کشمیری شالوں کی تعریفیں کشمیر آتے ہوئے تمام بادشاہوں اور سیاحوں نے کی ہیں۔کشمیری شالیں ملائم اور نفیس ہوتے ہیں۔اُون سے بنے شالوں کے مقابلے میں پشمینے اور توزے سے بنی شالیں زیادہ عمدہ اور پسندیدہ قسم کی ہوتی ہیں۔اس صنعت نے زوال اور ترقی کے دور بھی دیکھے ہیں۔لیکن اس صنعت پر محنت کرنے والے محنت کش کی حالت ہمیشہ ابتر رہی ہے۔

پیپر ماشی:۔ پیر ماشی کے آرٹ نے کشمیر میں بڑی ترقی کی اور شہرت بھی پائی ہے۔ یہ فن بھی بڈ شاہ کے توسط سے کشمیر پہنچا۔انھوں نے سمر قند اور ایران سے فن کاروں کو بلا کر کشمیر میں بسایا اور یہاں اس فن کو ایجاد کیا۔خوبصورت تصویریں، پیالے، پاؤڈر کے ڈبے، طشتریاں، صابن دان، لیمپ شیڈ وغیرہ پیر ماشیوں کی فن کارانہ صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ جو بے حد پسند کئے جاتے ہیں۔ یہ اشیا کوٹے ہوئے کاغذ میں اسٹارچ ملا کر بنائی جاتی ہیں۔سانچے پر گودا لگانے سے بیشتر کوٹے ہوئے کاغذ کی متعدد پرتیں اس پر چسپاں کردی جاتی ہیں اور پھر اس عمل کو اس وقت تک جاری رکھا جاتا ہے۔ جب تک کہ تیار کی جانے والی چیز اپنی اصلی شکل اور موٹائی نہ پالے۔

لکڑی کا کام:۔ کشمیر کے فن کار لکڑی پر بہترین نقش بنانے میں مشہور ہیں۔ یہ کام ان کو ورثے میں ملا ہے۔''راج ترنگی'' جو کشمیری تاریخ کی بنیادی ماخذ ہے۔اس میں ایسے حوالے ملتے ہیں

جن سے یہ ثابت ہوا ہے کہ زمانہ قدیم سے یہ فن کشمیر میں رائج تھا۔ بڈشاہ کے دور میں اس فن کو کافی فروغ ملا اوراس میں ایرانی طرز کا اثر بھی شامل ہوگیا۔کشمیر میں اس فن کے شاندار نمونے تعمیر کردہ مسجدوں اورمقبروں کی صورت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔پنجرہ، خاتم اورلکڑی پر کھدائی کا کام اس کی قسمیں ہیں۔

پنجرہ:۔ اس میں عام طور پر پھولوں کا کام کیا جاتا ہے۔لکڑی پراس طرح خوبصورت نقش بنائے جاتے ہیں کہ یہ بالکل حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔اس کام میں بدلواورکایر کی لکڑی کا استعمال کیا جاتا ہے۔لکڑی کے مختلف ٹکڑوں کو نہایت نفاست سے جوڑ کر بہترین پنجرہ ڈیزائن تیار کیا جاتا ہے۔ پوش کندور، چہارخانہ، سادہ کندوں، شش تیز، شش ستارہ، شش پہلو، جعفری، جہاں شہری اور طوطاشش تیرہ اس کے مختلف ڈیزائن ہیں۔

خاتم بند:۔ یہ کام زیادہ تر کمروں کے اندرچھت پر کیا جاتا ہے۔اس سے چھت کی سجاوٹ میں اضافہ ہوجاتا ہے۔اس کے کئی ڈیزائن ہوتے ہیں۔ ہزار گردان، بندروم، بشت پہل، چہاربخش، موج بشت ہزاراورسیہ بخش وغیرہ اس کی مختلف قسمیں ہیں۔

لکڑی پرکھدائی کا کام:۔ یہ کام کشمیر میں قدیم زمانے سے ہوتا آیا ہے۔جس میں آج نئے تکنیکی اضافے ہوئے ہیں۔اس میں اخروٹ کی لکڑی کا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔جس پر کھدائی کر کے مختلف پھول بنائے جاتے ہیں۔ یہ کام آج بھی وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہے۔

قالین بافی:۔ کشمیر کے دستکاروں نے اس فن میں بہت زیادہ شہرت پائی ہے۔کشمیری قالین ایرانی اور دیگر ملکوں کے قالینوں سے زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ جو نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب اور یورپ کو بھی برآمد کئے جاتے تھے۔کشمیری فن کار مشکل سے مشکل ڈیزائن کی نقل اُتارنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ یہ فن بھی بڈشاہ کے بدولت کشمیر پہنچا ہے۔کشمیری قالین بافی کی خاص

جدت ''تعلیم'' ہے جواس فن کو سیکھنے کے لئے یاد کی جاتی ہے۔اس سے قبل ڈیزائنوں کو دیکھ کر رنگدار دھاگوں میں گرہیں ڈالی جاتی تھی جو بہت ہی دقت طلب کام تھا۔''تعلیم'' سے اس فن میں سہولت آئی اور غلطیوں کا بھی کافی حد تک ازالہ ہوگیا۔اس کام کو بھی شال بافی کی طرح بیک وقت کئی کھدایوں پر تیار کیا جاتا ہے اور بعد میں جوڑ دیا جاتا ہے۔

دھات کا کام:۔ کشمیر میں دھات کا کام بھی بہت پہلے سے ہو رہا تھا۔اس کاری گری پر ایرانی کاری گری کے بہت زیادہ اثرات پڑے ہیں۔افتابہ، صراحی اور لوٹا وغیرہ۔ یہ انڈو پرشین روایت کے مطابق بنائے گئے ہیں۔اور بعض نمونے ایسے بھی ہیں جو خالص کشمیری ہیں۔کشمیر میں مختلف قسم کے برتن بنائے جاتے ہیں اور مختلف وضع سے ان پر نقش ونگار بنائے جاتے ہیں جو نقش اکثر شالوں اور قالیوں پر بنائے گئے نقشوں سے ملتے ہیں ان پر بنے نقش کشمیری ہی ہے۔کشمیری برتن زیادہ تانبے کے ہوتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ چاندی کے برتن بھی بہت ہی خوبصورت ڈھنگ سے بنائے جاتے ہیں۔اس طرح یہاں کئی طرح کے مختلف برتن تیار کئے جاتے ہیں۔جن میں سماوار، دیگچی، گلاس، ڈل، کنز، سینی (ترامی)، تاش، سرپوش اور لوٹا وغیرہ شامل ہے۔کشمیری سماوار کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ یہ روس اور کشمیر کے درمیان گہری دوستی کا ثبوت ہے اور بعض لوگ اسے چینی برتن بھی کہتے ہیں۔لیکن سماوار پر بنے نقش خالص کشمیری ہوتے ہیں۔کشمیر میں سماوار کو چائے اور قہوہ بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دیگچی کا استعمال کھانا تیار کرنے کے لئے ہوتا ہے۔یعنی سبزیاں، گوشت اور چاول تیار کرنے کے لئے مفید ہے۔ہاتھ دھونے کے لئے تاشی اور لوٹا، کھانا کھانے کے لئے کنز، سینی اور بشقاب کا استعمال کیا جاتا ہے۔ان تمام برتنوں کو مختلف سائز کے مطابق بھی تیار کیا جاتا ہے۔ یہ برتن زیادہ تر تانبے کے ہوتے ہیں پرانے زمانے میں مٹی کے برتن بھی استعمال کئے جاتے تھے۔

کشیدہ کاری:۔ اس فن میں کشمیر سارے ملک میں مشہور ہے۔ یہ کام سوئی کے ذریعے

کیا جاتا ہے اور پوشاک پر خوبصورت ڈیزائن بنا کے اس کو اور زیادہ دلکش بنا دیا جاتا ہے۔ کشمیری کشیدہ کاری کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً ڈوریا، رفو گری، ذالک، زردوزی، داتا چکن اور طلائی کار وغیرہ۔

کاغذ سازی:۔ کاغذ سازی میں چین کو کافی شہرت حاصل تھی وہی سے اس فن کی شروعات ہوئی۔ چین سے سمرقند جا پہنچا۔ وہاں اس میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور وہاں سے وسط ایشیا کے مختلف حصّوں میں پہنچایا گیا۔ جن میں کشمیر بھی شامل ہے۔ کشمیر میں اس فن کو زین العابدین نے شروع کیا۔ یہاں اس کا اولیں مرکز گاندربل علاقے میں تھا۔ اس کام کے لئے پُرانے چیتھڑوں، سوڈا کازبونیٹ، پھٹکری اور ٹارچ وغیرہ استعمال کیا جاتا ہیں۔ کاغذ سے پہلے کشمیر میں کاغذ کی جگہ بوج پتر کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ خط وکتابت کا کام بھی اسی سے لیا جاتا تھا۔ جس کے بے شمار مسودات یورپ کے لوگ کشمیر سے ساتھ لے گئے اور کتب خانوں میں محفوظ رکھے ہیں۔ اس طرح کے کچھ تحریری نسخے کشمیر میں بھی موجود ہیں۔ کشمیر میں کاغذ کے چار قسموں کا ذکر ملتا ہے۔ ''فرمائشی کاغذ'' (شاہی کاغذ) جس کو راجہ مہاراجہ کے لئے بنایا جاتا تھا۔ دوسرے نمبر کا ''مشتی'' کاغذ کہلاتا تھا۔ تیسری قسم کا ''قلمدانی'' کاغذ جو عام لوگ استعمال کرتے تھے اور چوتھا اعلیٰ ترین درجے کا کاغذ کہلاتا تھا۔ اسی کاغذ پر علم وادب اور شعر وشاعری ضبطِ تحریر میں لائی جاتی تھی یہی سب اقسام کے کاغذات سے پابندار مانا جاتا تھا۔

کشمیری کاغذ کی شہرت دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی یہ ہر جگہ دستیاب ہوا کرتا تھا۔ نفاست اور عمدگی کے علاوہ اس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس پر کی گئی تحریر دھوئی جاتی تھی اور کاغذ کو پھر سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ جو اس کا ایک نقص بھی کہا جاتا تھا کیونکہ اہم ریکارڈ آرام سے مٹایا جا سکتا تھا۔ جب سے کاغذ سازی کے لئے مشینوں کا استعمال ہونے لگا۔ اُسے کشمیری کاغذ سازی کو بڑا نقصان ہوا۔ مشینی کاغذ بازاروں میں ہر جگہ کم قیمت پر پہنچ گیا جس کا مقابلہ کشمیری کاغذ نہ کر سکا اور دھیرے دھیرے کشمیر میں اس صنعت کا بھی خاتمہ ہونے لگا۔

کانگڑی اور ٹوکریاں بنانے کا کام:۔ یہ کام کشمیر میں بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ کانگڑی وہاں ضروری اشیا میں سے ایک ہے۔ اگر یہ نا ہوتو یخ آلود سرما سے نپٹنا بے حد مشکل ہو جاتا۔ کانگڑی رسم ورواج کے ساتھ بھی جڑی تھی۔ جب نیا رشتہ ہو جاتا تھا تو کانگڑی کو نذرانے کے طور لے جانا ایک ضروری امر تھا۔ کسی بھی خوشی کے موقع پر اسبند جلانے کے لئے کانگڑی استعمال کی جاتی تھی۔ اس کو مختلف وضع سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس کو بید وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں سے بُنا جاتا ہے اور بیچ میں مٹی کا ایک چھوٹا پیالہ رکھا جاتا ہے جس میں انگارے ڈالے جاتے ہیں۔ بید کی ٹہنیوں کو موڑ کر چھوٹے چھوٹے دائرے بنا کر اس کے اویزان رکھے جاتے ہیں۔ اور مختلف رنگوں سے کانگڑی کو سجایا جاتا ہے۔ شادی بیاہ والی کانگڑی کچھ زیادہ ہی خوبصورت ہوتی ہے۔ جس میں مختلف رنگوں کے کاغذ بھی بڑی نفاست سے فسائے جاتے ہیں۔ کشمیر کے ہر گھر میں کانگڑی کا پایا جانا ایک یقینی بات ہے۔ اس کام کے لئے خاص چرار شریف، بانڈی پورہ اور لولاب کے علاقے مشہور ہیں۔ اس کا زیادہ استعمال صحت کے لئے مضر ہے۔ کشمیر کے لوگ اکثر سردی کے پانچ مہینے کانگڑی سے چپکائے نکالتے ہیں۔ شاذ ہی لوگ اس کی جلن سے بچ جاتے ہیں۔ رات بھر بستر میں کانگڑی کا استعمال کرنے سے اکثر آگ لگنے کی وارداتیں نمودار ہوتی ہیں۔ اسی طرح بید کی ٹہنیوں سے ٹوکریاں بھی بُنی جاتی ہیں۔ جن کو کئی طرح سے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ زعفران توڑنے، سیب توڑنے اور کھیتوں میں دال اور چاول وغیرہ لانے کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے۔

کشمیر نمدہ اور گبہ سازی کے لئے بھی بہت مشہور ہے۔ جس کو بھیڑ کے اون (بالوں) سے بنایا جاتا ہے اور پھر اس پر کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔ ان دونوں کو کشیدہ کاری کے بہترین نمونوں کے طور پر دنیا میں کہیں بھی پیش کہا جاسکتا ہے۔ ان کو بنانے کے طریقے کو کشمیر میں مقامی طور پر ہی اپنایا گیا ہے۔ ان سب دستکاریوں کے علاوہ اور بھی کئی دستکاریاں ہیں جن میں پتھر کا کام، مٹی کے برتن اور کھلونے بنانے کا کام، چٹائی سازی اور زیورات بنانے کا کام وغیرہ مہارت سے انجام دیئے جاتے ہیں۔ اگرچہ آبادی کا خاصہ حصہ ان دستکاریوں سے وابستہ رہا۔ لیکن اس کا فائدہ صرف ان کے

کاروبار کرنے والوں کو ہی ملتا ہے۔ان صنعتوں کو حُسن بخشنے والے کاریگروں کا فن دنیا بھر میں مشہور تو ہے مگر ان کاریگروں کی خستہ حالی سے پوری دنیا بے خبر ہے۔

باغات:۔ زمانے قدیم سے ہی کشمیر میں باغات کی بھرمار رہی ہیں۔اگر چہ مغل عہد کے باغات مثلاً ''نشاط باغ''،''شالمار باغ'' اور''نسیم باغ'' وغیرہ آج سیر و تفریح کے لئے بہت مشہور ہے تاہم قدیم حکمرانون نے بھی اپنی سیر و سیاحت کے لئے چند خوشنما اور خوبصورت باغات لگوائے تھے۔مگر زمانے کے حوادث کی وجہ سے آج ان باغات کا نام ونشان تک نہیں ملتا ہے۔ شاہمیری خاندان کے حکمرانوں نے وادی کشمیر میں کئی مقامات پر خوبصورت باغات بنوائے تھے۔عبدالاحد رفیق لکھتے ہیں:

> ''سلاطین کشمیر کے دور میں سلاطین کے علاوہ بعض تاجروں اور دوسرے دولت مند باشندوں کو بھی پھولوں اور باغوں سے شغت تھا۔اوران کے مکانوں میں ملحق باغ ہوتے تھے۔اس کے علاوہ رشی فرقہ کے لوگوں کی عادت یہ تھی کہ وہ جہاں بھی جاتے ، سایہ دار درخت لگاتے ۔سلاطین امراء، تاجروں اور رشی فرقہ کے لگائے ہوئے باغوں میں مختلف قسم کے پھول بکثرت پیدا ہوتے تھے۔جن میں خوبانی، شفتالو، آلوچہ، انگور، بادام اور شاہ دانہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔جنگلوں اور باغوں میں اُگنے والے پھولوں میں نرگس، گلاب، چنبیلی، کنول، سوسن، سنبل، نفشہ وغیرہ کے نام گنوائے جاسکتے ہیں۔''[17]

اس طرح شاہمیری خاندان کے بادشاہوں نے سرینگر کشمیر کے مختلف مکانات پر باغات لگائے تھے۔اس عہد کے ایک حکمران سلطان زین العابدین نے باغات بنوانے میں کافی دلچسپی لی تھی۔ان کو سیر وسیاحت اور تعمیرات کا بہت شوق تھا۔انھوں نے''باغ زین العابدین'' کے نام سے ایک عظیم الشان باغ بنوایا تھا جو آج بھی اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔اوراس باغ میں بارہ منزلہ

ایک محل تعمیر کروائی تھی جس کو چکوں کے شورفساد کے زمانہ میں مخالفوں نے نظرِ آتش کر دیا تھا اور اس باغ کا نام ونشان مٹا دیا۔ اس کے علاوہ ان کے بنائے گئے کئی باغات کا ذکر ملتا ہے۔ جس میں باغ زینہ پور، باغ زینہ کوٹ اور صفا پور میں پہاڑ کے دامن میں باغ انگور وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے دیگر ملکوں سے طرح طرح کے میوہ دار درخت اور رنگ برنگے خوشبودار پھول منگا کر لگائے تھے۔ جو زمانے کے ہاتھوں مسمار ہوگئے۔ اس کے بعد چک دور میں عوام فسادات اور بدامنی کا شکار ہوگیا تھا تاہم اس خاندان کے ایک حکمران یوسف شاہ چک نے اپنے دور میں باغات لگوائے تھے۔ جن کے اب کھنڈرات تک موجود نہیں ہیں۔

مغل حکمران فنِ تعمیرات اور باغات لگوانے کا بے حد شوق رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کشمیر کے حسن وخوبی، ڈھکے ہوئے پہاڑوں، سرسبز میدانوں، بل کھاتے ہوئے دریاؤں اور خوشگوار آب وہوا نے مغلوں کے حساس دلوں کو کشمیر میں باغات بنانے پر اکسایا اور یہاں باغات لگوانے کے کام کو حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا۔ پہاڑوں کے دامنوں میں باغات لگا کر انھوں نے کشمیر کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ یہ باغات آج بھی اپنی عظمت اور جلال کی گواہی دے رہے ہیں۔ محمد جلال الدین اکبر نے جھیل ڈل کے مناظر دیکھنے کے لئے کوہ ماران کے دامن میں مشرق کی طرف ''باغ جردگہ شاہی'' کے نام سے ایک دلکشا اور روح پرور باغ تعمیر کروایا تھا۔ اس باغ میں طرح طرح کے درخت پھل اور پھول لگوائے تھے۔ مزید کئی باغات مغل عہد میں لگوائے گئے۔ باغ عیش آباد، باغ بحر آرا، نور باغ، باغ دلاور خان، باغ دولت آباد اور باغ ملا شاہ وغیرہ ایسی دلکش باغات جہاں آج کھنڈرات، چند درختوں اور کہیں کہیں پر تعمیرات کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ علاوہ از کچھ باغات ایسے بھی جو آج اپنی جدو جلال کی وجہ سے مغل عہد کے یادگار ہیں۔

''شالیمار باغ'' جو اکبر کے عہد میں تیار کیا گیا تھا۔ شاہجہاں نے اس کو اور وسعت دی اور ایک دلکشا اور دلرُبا باغ بنوایا۔ اس کے وسط میں ایک حوض بنوایا اور فوارے لگوائے۔ یہ فوارے ہنرمندی اور قرینے سے آراستہ کئے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے باغ عجوبہ روزگار بن گیا ہے۔ یہ باغ

مغل باغات میں بڑا اہم اور حسن و نفاست کا شاہکار ہے۔ ڈل جھیل کے کنارے پہاڑ کے دامن میں ''نشاط باغ'' ایک عظیم اور شاندار باغ واقع ہے۔ جس کو شاہجہاں کے وزیر آصف جاہ نے بنوایا تھا۔ یہ باغ بادشاہ کی سیر و تفریح اور ڈل جھیل کا نظارہ کرنے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا اور بادشاہ اکثر و بیشتر کشتی میں بیٹھ کر لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ ''نسیم باغ'' حضرت بل کے قریب جھیل ڈل کے کنارے مغل بادشاہ شاہجہاں نے بنوایا تھا۔ اس باغ میں بارہ سو کے قریب چنار کے درخت لگوائے گئے تھے۔ باغ کی آبیاری کے لئے نہر ذکرہ سے پانی لایا جاتا تھا۔ باغ کے فوارے اور آبشار بھی اسی پانی کی مدد سے چلتے تھے۔ افغانوں کے دورِ حکومت میں امیر جواں شیر گورنر نے اس باغ کی بربادی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس سے قیمتی پتھر نکال کر شیر گڑھی میں نصف کئے۔ باغ کے فوارے بھی ہٹا دئے گئے۔ جس سے باغ کی وسعت روز بہ روز کم ہوتی گئی اور باغ محدود ہو کر رہ گیا۔ لیکن آج بھی چنار کے درخت اس باغ کی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں۔ شاہجہاں نے ''باغ پری محل'' اور ''باغ چشمہ شاہی'' پہاڑ کے دامن میں تعمیر کرائے تھے جہاں آج کھنڈرات کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے۔ تاہم سرکار نے ان کھنڈرات کی بنیاد پر پری محل کی قدیم ہیئت اور صورت کو قائم رکھنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ البتہ ''باغ چشمہ شاہی'' آج بھی قائم و دائم ہے۔ جھیل ڈل کے کنارے کوہ سلیمان کے دامن میں شاہزادہ مراد بخش نے ''باغ چنار'' کے نام سے ایک باغ تعمیر کروایا تھا جس کے آثار اب موجود نہیں ہے لیکن چار چنار اب بھی موجود ہیں۔

افغان دور میں کچھ باغات باغ امیر آباد، باغ آغا حسین، اور باغ کفایت خان تعمیر کئے گئے تھے جو اب صرف کھنڈرات کی شکل میں موجود ہیں۔ اس طرح سکھ عہد کے باغات بسنت باغ، شیخ باغ اور منشی باغ وغیرہ جو آج باغ تو نہیں رہے ہیں مگر نام ابھی باقی ہے۔ ڈوگرہ عہد کے باغات میں ''حضوری باغ'' اقبال پارک کے نام سے موجود ہے۔ اس پارک کا ایک حصہ بچوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے جہاں بچوں کی نمایشی ریل گاڑی چلانے کا انتظام ہے۔ اس کے علاوہ نہرو پارک، شیرِ کشمیر پارک اور نشاط باغ (بانڈی پورہ) ان کے یادگار ہے۔

لباس:۔ لباس کا تعلق صرف ستر پوشی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے شعبوں کی طرح یہ بھی تہذیب وثقافت کی جڑیں دور دور تک اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔انسان کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں لباس کا بنیادی رول ہے۔ چونکہ کشمیر میں ابتداء سے ہی سوٹ،قمیض شلوار، پھرن اورٹوپی وغیرہ کا رواج عام تھا۔جن کولوگ مختلف وضع سے بنوا کر پہنتے ہیں۔عورتیں خاص طور سے پھرن پر مختلف ڈیزائن کی کڑائی کراتی ہیں۔قدیم زمانے سےلوگ سوتی اوراونی کپڑے پہنتے تھےاور خاص موقعوں پرلوگ ریشمی کپڑے کا استعمال بھی کرتے تھے۔مسلم عہد کے بعدکشمیریوں کا لباس ایرانی اور عربی طرز کا استعمال ہونے لگا۔شلوارقمیض کےساتھ ساتھ صدری پہننے کا رواج بھی کشمیر میں عام ہوا۔ کم وبیش آج بھی سر پرٹوپی ہوتی ہےاوراس کےاوپر پگڑی باندھنے کا رواج ہیں۔ پچاس سال قبل کشمیری عورتیں سر پر''کسابہ'' اُڑتی تھیں۔اس کےساتھ ایک ڈوپٹے کااوڑنالازمی تھا۔جس کو''پوژ'' کہاجاتا تھا۔''کسابہ'' کئی طرح کا ہوتا تھا۔عام طور سےمسلمان عورتیں سیدھا کسابہ پہنتی تھیں۔امیر گھرانوں کی عورتیں اونچا کسابہ پہنتی تھیں۔ پنڈت عورتوں کے کسابہ پرسفید رنگ کی دھجی لگی ہوتی تھی۔عورتیں لمبا پھرن پہنتی تھیں۔اس کے دامن اور گردن کے کناروں پرایک بوڑ رلگتا تھا جس کو ''ڈور'' کہتے تھے۔مسلمان خواتین اورمردوں کی جیب دائیں طرف ہوتی تھی اور پنڈتوں کی بائیں طرف ہوتی تھی۔ برقعے کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔امیرلوگ یہاں چمرے کا جوتا استعمال کرتے تھے۔جسے''پازار'' کہا جاتا ہے۔غریب لوگ گھاس کے پولے استعمال کرتے تھے جسے''پل ہورہ'' کہتے ہیں۔اورسردیوں میں لکڑی سے بنائی گئی''کھراؤں'' کا استعمال کیا جاتا تھا۔

اب تو بیرونی تہذیب کےاثر سےلوگ پتلون،کوٹ،ٹائی،شیروانی،بیل باٹم اورجینس وغیرہ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ پگڑی کا رواج اب دھیرے دھیرےختم ہورہا ہےجس سےطرح طرح کے کام لیے جاتے تھے۔ اس سے درخت پر چڑھنے کے لیے رسی کا کام لیاجاتا تھا اور گھوڑسواری کے وقت تیز رفتارگھوڑے کوروکا جاتا تھاوغیرہ وغیرہ۔دوسرے چیزوں کسابہ یعنی ترنگہ

وغیرہ کا ذکر تو اب کتابوں میں ہی ملتا ہے۔مگر سردی کے موسم میں پھرن اور کانگڑی اب بھی محبوب ہے۔کشمیر میں زیورات اور آرائش وزیبائش کی اہمیت بھی زمانہ قدیم سے تھیں۔ یہاں کے لوگ بڑی ذوق و شوق سے اپنی آرائش کا سامان کرتے تھے۔حتیٰ کہ طرح طرح کے زیورات کا استعمال کیا جاتا تھا۔خواتین کنگن ، بالیاں، کئی قسم کے ہار، انگوٹھیاں ، تالہ رز، حلقا بند اور باز وبند وغیرہ پہنتی تھیں۔ پنڈت عورتیں ''کمر بند'' کا استعمال کثرت سے کرتی تھیں۔'' ڈیجہور'' پنڈت عورتوں کی پہچان تھی خاص طور سے سہاگن عورتیں اس کا استعمال کرتی تھیں۔اس کے برعکس مسلمان عورتوں کے یہاں ''تالہ رز'' کا چکن عام تھا۔اب کشمیری لوگ زیورات پہننے کی طرف کم ہی دلچسپی لیتے ہیں اور زیادہ تر سادہ رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔

زبان:۔ کشمیری زبان کے تعلق سے کچھ ماہرین کا ماننا ہے کہ یہ زبان درد بولی کی رہین منت ہے جو چین موجودہ علاقے ترکستان (دردستان) میں بولی جاتی تھی۔اب یہ بولی کشمیر کے ایک سرحدی علاقے گریز میں بولی جاتی ہے اور کچھ محققین اس بات سے اختلاف کرتے ہوئے اس بات پر متفق ہے کہ کشمیری زبان سنسکرت سے نکلی ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ اس زبان کا ڈھانچہ پشاچی گروپ سے بنا ہے لیکن اسے رنگ وروپ اور ہیت سنسکرت اور فارسی سے حاصل ہوئی ہے۔ یہ زبان اُردو، ہندی، ڈوگری اور پنجابی وغیرہ زبانوں سے کافی پرانی سمجھی جاتی ہے۔ایم ایس ناز اس تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''کشمیری زبان اگر ایک سدا بہار خیاباں ہے تو اس کی رونق اور مہک ان مختلف رنگ کے پھولوں سے ہے، جو اس میں آراستہ و پیراستہ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ پھول وہ مختلف زبانیں ہیں، جن کا حالات زمانہ کے تحت کشمیری زبان پر اثر انداز ہونا یقینی تھا۔جس طرح غیر منقسم ہندوستان کی بہت سی بولیوں نے مل کر اُردو زبان کا عسکری قالب اختیار کیا، اسی طرح وادی کشمیر کے قریب، وجوار میں بولی جانے والی علاقائی بولیاں بھی

کشمیری زبان کو عالم وجود میں لانے اور اسے ایک خیاباں کا روپ عطا
کرنے میں مدومعاون ثابت ہوئیں۔''۱۸؎

کسی بھی زبان کے وجود میں آنے کے لئے یہ سب باتیں تو ضروری ہے تبھی تو ایک زبان وجود میں آتی ہے۔ بہرحال ابتداء میں اسے ''ملیچھ بھاشا'' کہا جاتا تھا۔اب عوامی زبان کے علاوہ یہ ادبی زبان بھی بن چکی ہے۔اس میں ہزاروں کی تعداد میں ادبی اور غیرادبی کتابیں لکھیں جا چکی ہیں۔ایک مضمون کے طوراس میں اعلیٰ تعلیم کا بندوبست بھی موجود ہے۔اسکولوں اور کالجوں میں بھی ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔مزیداس زبان کے کئی مسائل ہیں۔یہ زبان نہ ذریعہ تعلیم ہےاور نہ ذریعہ معاش، عام لوگ اس زبان میں خط وکتابت نہیں کرتے ہیں نہ یہ کاروباری اور نہ قانونی سطح پر بھی رائج ہوئی ہے۔ ریڈیو اور ٹی۔وی کچھ حد تک اس زبان کی نشریات کا کام کر رہے ہیں۔اس زبان میں بے شمار کہاوتیں اور محاورے وغیرہ موجود ہیں۔لل عارفہ اور شیخ العالم جیسے عظیم اوراولین کشمیری شاعروں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اسی زبان کو وسیلہ بنایا۔

موسم:۔ کشمیر کے حسن کو لازوال بنانے میں یہاں کے موسم بھی اہم کردارادا کرتے ہیں۔ یہاں کا موسم اتنے ہی رنگ بدلتا ہے جتنے قسم کے یہاں پھول کھلتے ہیں۔ عاشقانہ مزاج اور اصحاب دل رکھنے والے لوگ دور دراز کا سفر طے کر کے کشمیر کی پرفضا اور شبنمی ٹھنڈک سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے رہتے ہیں جو دنیا کے کسی اور خطہ میں ملنی محال ہے۔ بقول ایم۔ایس۔ناز:

''کشمیر کی آب وہوا از بس تر وتازہ،صحت افزا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جو
سیاح،مورخ ومحقق یہاں آتے رہے،ان سب نے شفق اللفظ اس کے
رنگیلے سہانے موسموں کی تعریف کی۔شعراء کرام نے ان موسموں پر
نظمیں کہہ ڈالیں۔کسی کو کشمیر کا موسم سرما من بھایا اور وہ اس خطہ دل پزیر
کی برف پوش وادیوں میں کھو گیا تو کسی کو اس کی خزاں کی رُت میں بھی
کیف آفریں بہار صدر نگ دکھائی دی۔شاہ ہوں کہ درویش انہیں کشمیر

جنت نظیر کے دلکش و دل آویز موسم جان سے بھی زیادہ عزیز رہے۔
سیاحوں کی آمد کا مقصد خطہ، کشمیر کی پھولوں سے اٹی پڑی وادیوں اور
یہاں کی نئی نویلی رتوں کی سحر انگیزیوں سے محظوظ ومسرور ہونا تھا۔ مورخ
تاریخ کے ان سازوں کو صریر خامہ میں سمونا چاہتے تھے، جو کشمیر کے
رنگیلے سہانے موسموں کی سرور آگیں لے میں بادشاہوں کی آمد کا
موجب ٹھیرے بیماروں کو یہاں کی رتوں میں شفا ملتی رہی اور اہلِ محبت
نے دلوں کی دولت پائی۔''[۱۹]

وادی کشمیر کے ہر پندرہ سے بیس میل کے فاصلے پر آب و ہوا بدل جاتی ہے۔ اگر وادی کے کسی خطہ میں گرمی نے شدت پکڑ لی تو صرف دس سے پندرہ میل کا فاصلہ طے کر کے آپ ایسی جگہ پہنچ جائے گے جہاں موسم نہایت خوشگوار اور دل آفریں ہوگا۔ مسلسل بارش نے پریشان کیا تو چند میل کا سفر کر کے خشک زمین اور نکھری ہوئی دھوپ منتظر پائے گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چٹانوں اور پانی کا اس انداز سے امتزاج آپ کو کسی اور پہاڑی مقام پر نہیں ملے گا۔ جو قدرت نے وادی کشمیر کو عطا کیا ہے۔ اس تعلق سے آفاق احمد لکھتے ہیں:

''موازنہ انسانی جبلتوں میں سے ایک ہے۔ اس لئے کشمیر کی آب وہوا
کا دوسرے خوبصورت مقامات کی آب و ہوا سے موازنہ کرنے کی
بارہا کوشش کی گئی ہے۔ مگر اس وسیع اور عریض دھڑکتی ہوئی چھاتی پر کوئی
ایک گوشہ یا خطہ ایسا نہیں ہے جس کی آب وہوا کو کشمیر کی آب وہوا سے
مکمل طور پر تعبیر کیا جا سکے،
بقول سر والٹر لارنس وادی کشمیر کی آب و ہوا کا موازنہ موسمِ بہار میں
سوسزرلینڈ سے اور جولائی اگست کے مہینہ میں جنوبی فرانس سے کیا جا سکتا
ہے۔ لیکن ایسا کوئی خطّہ اس کرّہ ارض پر نہیں ہے جس کے بارے میں
حتمی طور پر یہ کہا جا سکے کہ وہاں کی آب وہوا مکمل طور پر وادی کشمیر جیسی
ہے۔''[۲۰]

مورخین اور جغرافیہ دان نے کشمیر کے موسموں کو چار حصّوں میں تقسیم کیا ہیں۔ موسمِ بہار، جو مارچ کے ابتداء سے لیکر وسط مئی تک ہوتا ہے، موسمِ گرما، وسط مئی سے اگست تک، موسمِ خزاں، جو ستمبر سے اکتوبر کے آخر تک رہتا ہے اور موسمِ سرما جو نومبر سے فروری کے اختتام تک رہتا ہے۔

موسمِ بہار میں ہر طرف ہریالی ہوتی ہے پھولوں کے درخت پھولوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ اس موسم میں لوگ گھروں سے نکل کر کھیت کھلیانوں، پھل کے باغوں اور جھیلوں کی پرورش کرنے، پیڑ پودے لگانے اور فصل بونے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ آب و ہوا خوشگوار رہتی ہے۔ عام طور سے درجہ حرارت ۱۲ سے ۱۵ ڈگری سینٹی گریڈ تک رہتا ہے۔ یہاں سب سے زیادہ بارش موسمِ بہار میں ہی ہوتی ہے۔ اس موسم کو کشمیری عوام ''سونتھ'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ موسمِ بہار میں پہاڑوں پر اکثر و بیشتر برف گرتی رہتی ہے۔

اس کے بعد وسط مئی سے گرما کا موسم شروع ہو جاتا ہے اور ستمبر کے ابتداء تک اختتام کو پہنچتا ہے۔ گرما کے موسم میں جنوب مغرب سے آنے والے مانسوں پورے برصغیر میں بارش برساتے ہیں مگر یہ مانسوں کشمیر میں ہونے والی کل بارش کی زیادہ سے زیادہ ایک چوتھائی ورنہ چھٹے حصّہ کا سبب بنتی ہے۔ موسمِ گرما میں گرمی کی شدت جولائی اور اگست کو اپنے شباب پر پہنچتی ہے۔ اس وقت سرینگر میں کبھی کبھی درجہ حرارت نا قابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ ۳۰ سے ۳۲ ڈگری سینٹی گریڈ تک درجہ حرارت پہنچ جاتا ہے۔ سرینگر کے ارد گرد کچھ صحت افز مقامات خاصے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ اس موسم میں بارش کا تناسب پوری وادی میں یکساں نہیں رہتا ہے۔

خزاں کشمیر کا خوبصورت موسم ہوتا ہے۔ چناروں کے پتے زرد ہو کے موسمِ خزاں کا پیغام دیتے ہیں۔ ستمبر میں شروع ہو کر اکتوبر کے آخر تک موسم خزاں کا جنون رہتا ہے۔ لوگ کھیتوں اور پھل کے باغوں میں سیب، اخروٹ، بادام، سنگاڑے، دال، مکئی اور زعفران وغیرہ توڑنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ خزاں کے موسم میں ہر کلی پھول بن جاتی ہے۔ یہ موسم آب و ہوا کے اعتبار سے بھی نہایت خوشگوار نظر آتا ہے۔ نرم دھوپ کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی ٹھنڈک اپنا آغوش پھیلائے

کھڑی ہوجاتی ہے۔پھلوں کی کثرت اس موسم کواور بھی دلکش اور حسین بنادیتی ہے۔

کشمیر کا ہر موسم خوبصورتی کی ایک مثال قائم کرتا ہے۔موسمِ سرما میں بھی کشمیر کی خوبصورتی اعلیٰ درجے کو پہنچتی ہے۔اس موسم میں نہ کہیں پھول کھلتے نظر آتے ہیں نہ ہرے بھرے کھیت، نہ رسیلے اور میٹھے پھلوں سے بھرے درخت اور نہ ہی سرسبز وشاداب وادی کا دبدبہ رہتا ہے مگر اس موسم میں برف اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیتی ہے جو سیاحوں کو دور دراز سے اپنی طرف کھینچ لاتی ہیں۔یہ موسم نومبر سے فروری کے آخر تک رہتا ہے۔اس موسم کو کشمیری لوگ ''وند'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔اس دوران کشمیری لوگ روایتی طور پر کانگڑی، گرم ملبوسات، پھرن اور جسم کو حرارت پہنچانے والی دیگر چیزیں استعمال کرتے ہیں اور بیشتر وقت گھروں کے اندر ہی گزارتے ہیں۔اس موسم میں لوگ کشیدہ کاری اور قالین بافی وغیرہ جیسے کاموں کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح کے فن کو گھر کے چار دیواری کے اندر ہی انجام دیا جاتا ہے۔سردی کا موسم ہی تھکا دینے کے حد تک یکساں نظر آتا ہے۔

چلہ کلان:۔سرما میں جنوری کے مہینے کو کوشہ رگ کی حیثیت حاصل ہے۔جو''چلہ کلان'' کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔یہ چالیس روزہ ''چلہ کلان'' اکیس دسمبر سے شروع ہوکر جنوری کے آخر تک رہتا ہے۔اس درمیان وادی میں سردی کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔جھیلیں اور نل جم جاتے ہیں جس کی وجہ سے پانی کی سپلائی متاثر ہوجاتی ہے۔''چلہ کلان'' کے دوران سب سے کم درجہ حرارت ریکاڈ کیا جاتا ہے۔اس کے بعد''چلہ خورد'' کے بیس دن اور بعدازاں ''چلہ بچہ'' کے دس دن ہوتے ہیں۔یہ فروری کے آخر تک شدید سردی کے تین مرحلے ہوتے ہیں اوران میں ''چلہ کلان'' کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔جس میں سردی اپنے شباب پر پہنچتی ہے۔موسمیات کے مطابق دسمبر سے فروری تک کل ملا کر اوسطاً ایک سو بیس اعشاریہ دو پانچ سینٹی میٹر برف پڑتی ہے۔سرما میں برف کے ساتھ اکثر بارش اور اولے بھی پڑتے ہیں۔اس موسم میں وادی کے کھانے پینے میں بھی

تبدیلی آ جاتی ہے۔ جہاں گرم پانی کا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے وہاں ایسی سبزیاں، مچھلیاں اور دالیں بھی تیار کی جاتی ہیں جو گرمیوں کے دنوں میں سکھا کر اسی موسم کے لیے رکھی جاتی ہے۔ یہی صورتِ حال کشمیر کے موسموں کی ایک منفرد خصوصیت ہے۔ جو سیاحوں کی دلچسپی کو برقرار رکھی ہوئی ہیں۔

پہاڑ:۔ وادی کشمیر چاروں طرف سرسبز اُونچے اُونچے پہاڑوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ یہ پہاڑ طرح طرح کے سرسبز درختوں سے لدے ہیں اور ہر طرف سے بے شمار چشمے بہتے ہیں۔ ان پہاڑوں نے وادی کو اپنے آغوش میں لیکر اس کے حسن کو لازوال بنادیا ہے۔ یہ سر بہ فلک پہاڑ وادی گلپوش کے طاقت ور پہرے دار بن کر ہزاروں برس سے ایستادہ ہیں جن کی برف پوش پیشانیوں پر صدیوں کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ ان فلک بوس پہاڑوں نے کشمیر کے حسن کو ایک خاص قسم کی مردانہ وجاہت عطا کی ہے۔ گرمی سے تپتے ہوئے پنجاب کے میدانوں سے وادی کو پیر پنچال کا پہاڑی سلسلہ علحدہ کرتا ہے۔ اگر ہم ان تپتے ہوئے میدانوں میں کھڑے ہوکر پیر پنچال کو دیکھیں تو ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ اس کے اُس پار ایک ایسی خوبصورت وادی ہے جس کی فضا خوشگوار اور تروتازہ رنگوں کے آغوش میں اٹھکھیلیاں کرتی رہتی ہے۔ اس پہاڑی سلسلہ کے جنوب مشرقی سرے پر ایسی چوٹیاں ہیں جن کے وسیع کاندھوں پر تقریباً پورے سال برف رہتی ہیں اور ان کے قدموں میں یعنی تقریباً چار ہزار فٹ نیچے گلیشیر کے پانی سے تین میل جھیل ''کونسر ناگ'' کا وجود عمل میں آیا ہے۔ یہ پہاڑ کشتواڑ سے مظفر آباد تک دریائے چناب کے کنارے کنارے پھیلا ہوا ہے۔ اس کی لمبائی ایک سو اسی میل اور چوڑائی تیس میل بتائی جاتی ہے۔ یہ پہاڑ سرینگر سے چالیس میل کی دوری پر جنوب میں واقع ہے۔ اس کی بلندی گیارہ ہزار بیس فٹ تک کہا جاتا ہے۔ سردی کے موسم میں اس پہاڑی پر سے آنے والے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ''کوہ ہرمکھ'' سرینگر سے شمال کی طرف واقع ہے اس کی اونچائی سولہ ہزار نوسو اسی فٹ بتائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہاڑی کی چوٹی پر زمرد کی ایک کان ہے جس کی ایک خاصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ وادیٔ کشمیر کے جس علاقے سے بھی اس چوٹی کو

دیکھا جا سکتا ہے وہاں کے سانپ انسانوں کو کسی بھی طرح کا نقصان نہیں پہنچاتے ہیں۔ ''کوہ امرناتھ'' پہلگام میں سترہ ہزار آٹھ سو نوے فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اسی پہاڑی پر امرناتھ کی پویتر گپھا بھی موجود ہے۔ جہاں ہندوستان کے اطراف واکناف سے ہندو اور سادھو جوق در جوق اس گپھا کی درشن کرنے کے لئے آتے ہیں۔ ''کوہ ننگا پربت'' ساڑھے چھبیس ہزار فٹ اونچا گلگت میں واقع ہے۔ درختوں سے خالی ہونے کی وجہ سے اس کا نام ننگا پربت رکھا گیا ہے۔ دریائے سندھ اس کے اردگرد گھوم کر پاکستان میں داخل ہو جاتا ہے۔

وادی کے بیشتر پہاڑوں پر مساجد، مقبرے، منادر اور محلیں تعمیر کئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے لوگ ان پہاڑوں کو مقدس بھی مانتے ہیں۔ ایم۔ ایس۔ ناز اس کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''ہنود کے نزدیک ہاری پربت اس لئے مقدس ہے کہ اس پر شارکا دیوی کا مندر ہے۔ ہندو مرد و زن اکثر ہر روز اس مندر کے اردگرد ڈھائی کوس تک چکر لگاتے ہیں۔ مسلمان بھی اس پہاڑ کو متبرک گرنتے ہیں۔ کیونکہ اس کے مغرب میں شاہ حمزہؒ معروف بہ مخدوم صاحب کا مزار ہے۔ علاوہ ازیں ہاری پربت پر جہانگیر کے اتالیق اخون ملاّ شاہ کا مقبرہ ہے۔ ایک قعلہ کے آثار جانب جنوب نظر آتے ہیں۔ یہ قلعہ عطا محمد خان نے ۱۸۱۰ء میں تعمیر کرایا تھا۔ باغ وارث خان بھی اسی پہاڑ کے شمال مشرقی گوشہ میں ہے۔''[۲۱]

ریاست میں قبرستان یا کسی کے مقبرے کو استان کہتے ہیں خاص طور سے جہاں پر کوئی ولی خدائے مدفن ہو تو استان مراد لیتے ہیں۔ وادی کے لوگ اکثر و بیشتر ان استانوں پر دعائیں اور منتیں مانگنے آتے رہتے ہیں۔ اور یہاں آکر بکرے، مرغے، گائے اور بیل وغیرہ ذبح کر کے غریبوں، رشتے داروں اور ہمسایوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ بچوں کے بال پہلی بار کسی استان پر منڈائے جاتے ہیں۔ ان بالوں کو کشمیری زبان میں ''زر'' کہتے ہیں۔ اس طرح ان بزرگ ہستیوں نے اُونچے اُونچے پہاڑوں پر ہی جائے پناہ لی ہے۔ جہاں ہر ایک دیکھنے والے نے کشمیر کی سرزمین پر بلند قامت پہاڑوں، جھیلوں

اور خوبصورت درختوں کی تعریفیں کیں ہیں۔ کچھ غیر ملکی باشندوں نے اسے جنت بے نظیر سے بھی تعبیر کیا ہے۔ وہی یہ نظارے اور چٹانیں کشمیریوں کی بے کسی کا سبب بھی بن جاتی ہے جن کو کسی بھی ضروری وقت پر پار کرنا کشمیریوں کے لئے محال بن جاتا ہے۔ لارنس لکھتے ہیں:

> ''بہ الفاظ دیگر یہ وادی چٹانوں سے گھرے ہوئے ایک قید خانے کی طرح ہے۔ جہاں سے زمانہ قدیم سے فرار ہونا ناممکن تھا۔ بلند قامت پہاڑوں کا وجود کشمیریوں کے لیے بے کسی اور مجبوریوں کے سوا کچھ نہیں تھا کیونکہ ان کی موجودگی میں ظلم و جبر سے بھاگنا ناممکن تھا۔'' ۲۲

تاریخی کتابوں میں جموں و کشمیر کے مندرجہ ذیل پہاڑوں کا ذکر ملتا ہے۔ جن میں کوہ پیر پنچال، کوہ ہرمکھ، کوہ قراقرم، کوہ کاجی ناگ، کوہ بانہال، کوہ ننگا پربت، کوہ برار بال، کوہ ہوکھ سر، کوہ کرشو جھیل، کوہ گوشہ براری، کوہ مہادیو، کوہ امرناتھ، کوہ ماربل، کوہ شادی پورہ، کوہ پہلگام، کوہ گلمر گ اور کوہ ہاری پربت وغیرہ شامل ہیں۔ کوہ گلمر گ اور کوہ پہلگام زیادہ مشہور ہیں۔ یہاں سیاح دور دراز سے سیر و تفری اور سردیوں میں برف سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے پہاڑوں پر لوگ بھی آباد ہیں۔ پہاڑی لوگوں کی مالی حالت بے حد پسماندہ ہیں۔ مویشی پالنے کے سوا اور کوئی خاص ذریعہ روزگار ان کے پاس نہیں ہے۔ ان پہاڑی لوگوں کا رہن سہن صابر آفاق یوں بیان کرتے ہیں:

> ''پہاڑی لوگ بنیادی طور پر کھیتی باڑی کرنے اور مویشی پالنے والے لوگ ہیں۔ نوکری اور مزدوری کو یہ لوگ اپنی شان اور قومی روایت کے خلاف سمجھتے رہے ہیں۔ اپنی کٹیا کو شاہی محل اور مکئی کی روٹی کو پلاؤ سمجھنے والے یہ غیور لوگ صنعت و حرمت کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ دیہاتی مرد اور عورتیں گھریلو ضرورت کی چیزیں مثلاً لباس، ظروف اوزار وغیرہ اپنے ہاتھ سے بناتے اور ان کو استعمال میں لاتے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر اور پاکستان کے علاقے گلیات، کاغان،

بٹگرام، الائی، سوات وغیرہ کے لوگوں کی زبان، ثقافت اور تاریخ سانجھی اور یکرنگ ہے۔ قدرتی طور پر ان علاقوں کی گھریلو صنعتیں بھی ایک جیسی ہیں۔

پہاڑی لوگ افسوس ناک حد تک غریب ہیں۔ وہ بوٹ یا چپل خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے چنانچہ ان کی ضرورت پول کی ایجاد کی ماں بن گئی ہے۔ پول، پرالی یا بٹیر سے بنائی جاتی ہے۔ بھیس یا اخروٹ کی چھال کی رسّی بنا کر بھی پول بنائی جاتی ہے۔ پول (گھاس کی جوتی) اگر بٹیر یا پرالی کی ہو تو تین دن کام دے سکتی ہے۔ اخروٹ کی چھال کی پول ایک ہفتہ چلتی ہے۔ جب رات کو فرصت ملتی ہے تو گھر کا ہر آدمی پہلے رسی بٹتا ہے اور پھر پول بناتا ہے۔ پول میں کندڑا، نتھ، بدھر، لڑکی اہم حصّے ہوتے ہیں۔ سردیوں کے موسم میں یہ لوگ گرمیوں کے لئے رسیاں بٹ کر رکھ لیتے ہیں۔''۲۳

وادی کشمیر کی خوشگوار آب و ہوا کی تشکیل میں یہاں کے پہاڑوں کا بھی اہم رول ہے۔ یہی پہاڑ وادی کو شمال سے آنے والی یخ بستہ ہواؤں سے بچاتے ہیں اور جنوب سے آنے والی شدید گرم ہواؤں کا رُخ موڑ دیتے ہیں۔ پہاڑوں کا یہ مثبت کردار وادی کی آب و ہوا کو خوشگوار بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اگر فضائے بسیط سے وادی کو دیکھیں تو ایسا محسوس ہوگا جیسے فطرت کے آغوش میں لپٹی ہوئی سبز پری کی نگہداشت کے لئے قطار در قطار بلند قامت دیو کھڑے ہیں۔ جن کے سروں پر بڑی بڑی برفانی ٹوپیاں ہیں۔ ان پہاڑوں پر دلفریب مرغزار اور عجیب وغریب چشمے، نالے اور تالاب پائے جاتے ہیں۔ جو پوری وادی کو سراب کرتے ہیں۔ ان پر پائے جانے والے گلیشیرز کو دیکھنے والے دور دور سے آتے ہیں۔

چشمے ندی اور دریا:۔ کشمیر کے حسن کو لازوال بنانے میں میٹھے، نیلے اور سبز جھیلیں، مست و مدہوش جھرنے، آبشار، رقصاں ندیاں، چیختے چلّاتے نالے اور چشمے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

کشمیر میں سبززاروں کی ٹھنڈک اور گلزاروں کی مہک ان ہی کی بدولت ہے۔ یہ اگر نہ ہوتو کشمیر کے دریاؤں کا وجود ہی مٹ جائے گا۔اوران سب کا وجود بھی تب ممکن ہے جب کشمیر میں برف سے بھری بڑی بڑی پہاڑی چوٹیوں کا وجود ہیں۔ اکثر یہاں ان ندیوں ، نالوں اور دریاؤں کے کناروں پر یا ربل بنائے گئے ہیں جہاں لوگ نہانے اور دھونے کا کام کرتے ہیں۔رشید احمد صدیقی نے ار ہر کے کھیت کو گاؤں کی اسمبلی قرار دیا ہے۔اسی طرح کشمیر میں یاربل اسمبلی کے مانند گنائے جاسکتے ہیں۔ یہ ترسیل کا ایک اہم ذریعہ ہے۔عورتیں گھریلو اور پاس پڑوس کی باتیں ان یاربلوں پر ہی ایک دوسرے تک پہنچاتی ہیں۔والٹر لارنس بھی اس بات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا کہ حبہ کدل اور زینہ کدل کے پل اوران کے دائیں بائیں دکانوں کی قطاریں لندن کی یاد دلاتی تھیں مگران دکانوں کو ہٹادیا گیا ہے اور اب کھنڈرات میں تبدیل ہوئی خستہ سیڑھیوں کے ذریعے آدمی پانی تک جاسکتا ہے۔ ان ہی سیڑھیوں کا استعمال کر کے لوگ دریا میں نہاتے ہیں، اپنے کپڑے دھوتے ہیں اور پینے کا پانی حاصل کر لیتے ہیں۔مقامی بولی میں ان گھاٹوں کو بارہ بل یعنی دوستوں کی ملاقات کی جگہیں کہا جاتا ہے۔''۲۴

چناچہ ان ان گنت چشموں ، ندیوں اور آبشاروں کا ذکر تو ایک لمبا کام ہے اس لئے اختصار کے ساتھ چند اہم دریاؤں کا ذکر کرنا مقصود ہیں۔

دریائے سندھ:۔ یہ دریا چین کے علاقہ تبت میں جھیل مانسرور کے قریب سے نکلتا ہے۔اس کی لمبائی اٹھارہ سو میل بتائی جاتی ہے۔لداخ اور گلگت میں بہتا ہوا یہ ننگا پربت پہاڑ کے گرد گھوم کر پاکستان میں داخل ہوجاتا ہے۔اس دریا کے آس پاس بڑی بڑی برفانی چوٹیاں ہے۔ جہاں گلیشیر پھسل کر اس کے پانی کو روک دیتے ہیں۔بعض دفعہ یہ گلیشیر طغیانی بھی لاتے ہیں اور سیلاب برپا ہوجاتا ہے۔

دریائے توی:۔ یہ دریا بھدرواں سے کچھ دور سیوج پہاڑ میں چشمہ کیلاش کنڈ سے نکلتا ہے۔جموں کا شہر اسی دریا کے کنارے واقع ہے۔

نالہ سندھ:۔ یہ دریا کوہ ہمالیہ کی اندورنی پہاڑیوں سے نکل کر دراس کے علاقہ سے ہوتا ہوا وادی کشمیر میں داخل ہوجاتا ہے اور شادی پور کے مقام پر دریائے جہلم سے مل جاتا ہے۔سونہ مرگ اور گاندربل کا علاقہ اسی کے کناروں پر واقعہ ہیں۔

دریائے جہلم:۔ یہ دریا جنوب مشرق میں پیرپنچال کے دامن میں واقع ایک چشمہ سے شروع ہوتا ہے۔ جو چشمہ ''ویری ناگ'' کہلاتا ہے۔منبع کے قریب یہ دریا ایک چھوٹے سے نالے کی شکل میں بہتا ہے۔اس دریا کا سنسکرت نام ''وتستا'' اور فارسی نام ''ویتھ'' ہے۔اس کا بیشتر پانی اس کے معاون ندیوں ، نالوں اور جھیلوں سے حاصل ہوتا ہے۔ان معاون ندی نالوں میں رود برنگی، رود ساندرن، رود آرہ پتی، نالہ لدر، تولہ برین، رود گنگا، کانہامہ، ننگلی، ہارون، امراوتی، ادنی، سندھ، مدھ متی، پیرو، وجی، جھیل ڈل اور جھیل ولر قابل ذکر ہے۔

ویرناگ سے لے کر بارہمولہ تک یہ ایک بہت بڑے دریا کی شکل اختیار کرتا ہے اور پھر مظفرآباد میں اس کے ساتھ دریائے کشن گنگا ملتا ہے اور پاکستان کے میدانی علاقوں سے گزر کر بحرۂ عرب جاتا ہے۔ یہ دریا اسلام آباد کشمیر سے لیکر ضلع بارہمولہ تک تقریباً ۲۳کلومیٹر کے علاقے پر پھیلا ہوا ہے۔اس کے آس پاس والے علاقے نہایت زرخیز ہے کیونکہ جب پانی کی مقدار کافی بڑھ جاتی ہے۔تو اس کے معاون ندی نالے اپنے ساتھ زرخیز مٹی لا کر اس پر بچھا دیتے ہیں۔جس سے زراعت اُگنے میں وسعت آتی ہے۔میدانی علاقوں سے یہ دریا بل کھاتے ناگن کی طرح ٹیڑھے میڑھے انداز میں گزرتا ہے۔اس کے کنارے غیر مساوی پائے جاتے ہیں۔اکثر پانی کی سطح کناروں کی اونچائی سے تین میٹر کم ہوتی ہے۔لیکن جب پانی کی وجہ سے دریا میں طغیانی آتی ہے تو پانی کناروں کو پار کرکے پورے میدانی علاقوں میں داخل ہوجاتی ہے اور کبھی کبھی سیلاب کی صورت اختیار کرکے

پورے زراعت اور مال و جاں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

یہ دریا ابتداء سے ہی کشتی رانی کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ پرانا شہر سرینگر اس کے دونوں کناروں پر صدیوں سے آباد ہے۔اس دریا کے ذریعے زندگی کا ساز و سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جاتا ہے۔ یہ دریا کشمیری لوگوں کو ذریعہ روزگار بھی فراہم کرتا ہے۔ زراعت کو پانی پہنچانے کے لئے اس سے نہریں نکالی گئیں ہیں اور بیشتر علاقوں کی بجلی اسی کے پانی سے پیدا کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ اور بھی یہاں کئی دریائیں ہیں جن میں دریائے چناب، دریائے راوی اور دریائے کشن گنگا قابلِ ذکر ہیں۔

جھیلیں:۔ کشمیر کی صاف وشفاف جھیلیں خوبصورتی میں لاجواب ہیں۔ان جھیلوں کی حُسن سے متاثر ہو کر شعرا نے کئی نظمیں اور ادیبوں نے کئی افسانے اور ناول تحریر کئے ہیں۔ چونکہ کشمیر تھا ہی ''ستی سر'' نامی ایک گہری جھیل، اس لئے یہاں جھیلوں کا پایا جانا لازم ہے۔بعض لوگوں نے اسے جھیلوں کی وادی بھی کہا ہیں۔ کشمیر کی بیشتر جھیلیں سطح سمندر سے کوئی دس ہزار فٹ کی بلندی سے بھکر پندرہ ہزار فٹ کی بلندی تک پائی جاتی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

جھیل ولر: ۔جھیل ولر کشمیر کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ ریاض رباعی نے کشمیری جھیلوں پر ''جھیلیں'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے ان کے مطابق اس جھیل کی لمبائی ۱۲ میل اور چوڑائی ۶ میل ہے۔ اس جھیل کے وسط میں سلطان زین العابدین نے ایک جزیرہ اور اس جزیرہ پر ایک عالیشان مسجد، ایک باغ اور ایک عمارت تعمیر کرائی تھی جس کے کھنڈرات آج بھی اُس زمانے کی اعلیٰ فنِ تعمیری کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ اس جھیل کے آس پاس بانڈی پورہ ، حاجن ،سوپور اور وٹلب علاقے آباد ہیں۔ اس جھیل کے شمال کی جانب وٹلب علاقے میں ایک پہاڑی پر بابا شکر دین کی مزار واقع ہے جہاں سے اس جھیل کا دلکش منظر اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔جھیل ولر چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھیری ہوئی ہے۔ ہرموکھ پہاڑ کے گلیشیر سے دو دریا ''مدھومتی'' اور ''ارِن'' نکلتے ہیں جو

اس جھیل میں ضم ہوجاتے ہیں اس کے علاوہ دریائے جہلم اور ننگل کا پانی بھی اس میں داخل ہوجاتا ہے۔اس جھیل کے تعلق سے ایم۔ایس۔ناز لکھتے ہیں:

''جھیل ولر کی پہلی نظر میں دیکھتے ہی، یکا ایکی کئی طلسماتی گوشے اُبھر کر سامنے آنے لگتے ہیں۔اس کا تابناک تاریخی ماضی، اس کے تہذیبی پہلو، اس کے ثقافتی انداز اور مناظر فطرت کی حسین تصویریں، جھیل کے وسط میں سلطان زین العابدین بڈشاہ کا تعمیر کردہ جزیرہ اپنی کہانی سناتا ہے۔جزیرے کی پرانی عمارت کے کھنڈرات اس دور کے اعلیٰ فنِ تعمیر کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔آثارِ قدیمہ کی بہاریں دکھانے والے محل کے چاروں طرف پھولوں کی کیاریاں آج بھی مہک رہی ہیں۔ ماضی میں ان کیاریوں کو دیدہ زیب بنانے کی خاطر مختلف طبقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔شاید یہیں پہنچ کر اقبال نے جھیل ولر کا نظارہ کیا اوران کے لبوں پر بے اختیار یہ الفاظ مچل اُٹھے تھے۔

ہمالہ کے چشمے اُبلتے ہیں کب تک

خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' ۲۵

جھیل ڈل:۔کشمیر کی سب سے خوبصورت جھیل ہے۔جھیل کے گردونواہ کے حسین مناظر اس کے حُسن اور دلکشی کو دوبلا کرتے ہیں ۔جن میں مغل باغات ، پری محل اور گوپادری مندروغیرہ جیسے اہم اور خوبصورت تاریخی مقامات واقع ہیں۔سیاحوں کے لئے یہ جھیل دلکشی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں یہاں سیاحوں کی آمدرفت رہتی ہیں۔ریاض رباعی کے مطابق اس جھیل کی لمبائی جنوب سے لیکر شمال تک چار میل، چوڑائی مشرق سے مغرب تک ڈھائی میل اور گہرائی دس فٹ سے چوبیس فٹ تک پائی جاتی ہیں۔

جھیل مانسبل :۔ مانسبل سرینگر سے تقریباً بارہ میل کی دوری پر واقع ہے اس کی لمبائی تقریباً دومیل اور چوڑائی دیڑھ میل بتائی جاتی ہے۔ مانسبل جھیل کی صورت انڈے کی مانند ہے۔اس

کی گہرائی آج تک کوئی نہیں ناپ سکا۔ یعنی اس کی گہرائی لاتعداد ہے۔ ریاض رباعی کے مطابق جہانگیر نے اس جھیل کے شمال میں نور جہاں کی یاد میں ''بادشاہ باغ'' کے نام سے ایک باغ بنوایا تھا اور اس باغ میں ایک محل کی بنیاد رکھی تھی جو مکمل نہ ہوسکا اور اس کے کھنڈرات آج بھی اس جھیل کے ساحل پر موجود ہیں۔ جھیل مانسبل کا پانی نہایت صاف وشفاف ہے۔ لارنس لکھتے ہیں:

''سرینگر کے لوگ اگر اس جھیل کی سیر بھی کرتے ہیں مگر ان کے لیے ڈل اور ولر جھیل کے مقابلے میں مانسبل کی زیادہ قدر و قیمت نہیں ہے کیونکہ ان جھیلوں میں قدرتی پیداوار کی بہتات ہے جبکہ جھیل مانسبل کے اندر گرم پانی کے چند ایسے چشمے ہیں جن سے یہ موسمِ سرما کے دوران بھی جمتی نہیں ہے۔''۲۶

کشمیر میں ان جھیلوں کے علاوہ اور بھی سینکڑوں چھوٹی چھوٹی جھیلیں پائی جاتی ہیں۔ جیسے آنچار سر، گنگہ بل، تارسر، گنسو ناگ، دمام سر، ویشن سر، رتن سر، ژہُو ناگ، نندہ کول، کونسر ناگ، زامتو ناگ، نندن سر، برارِسر اور نالہ دودھ گنگا وغیرہ۔ ان کا پانی نہایت صاف وشفاف اور یخ بستہ رہتا ہے۔ بڑی تعداد میں آبی پرندے مرغاباں، بطخ اور کئی سبزیاں ندرو، سنگھاڑے اور مچھلیاں وغیرہ۔ ان میں پائے جاتے ہیں کئی علاقوں کے لوگوں کا روزگار ان ہی جھیلوں پر منحصر ہے۔ اب ہر طرف گندگی اور ناجائز قبضے کی وجہ سے یہ جھیلیں سمٹتی جا رہی ہیں۔ کچھ جھیلیں ایسی بھی ہیں جن کو ہندو پوتر مانتے ہیں اور ان کی پوجا کرتے ہیں۔

آمد و رفت:۔ وادی کشمیر کو خدا نے ندی، نالوں، جھیلوں اور دریاؤں سے نوازا ہے۔ اور ضروریاتِ زندگی کا سامان لوگوں تک پہنچانے کا یہی آسان اور سستا ذریعہ رہا ہے۔ لوگ بستیاں اور آبادیاں بسانے کے لئے ان ہی دریاؤں اور ندی نالوں کے کناروں کو ترجیح دیتے تھے۔ وادی کے اطراف واکناف آنے جانے کے لئے دریائے جہلم اور اس سے معاون ندی نالے آسان ترین ذریعہ ہیں۔ اس ضمن میں کشتیوں کا اہم رول رہا ہے۔ قدیم زمانے سے کشمیر میں ایک جگہ سے دوسری

جگہ آنے جانے کا وسیلہ کشتیاں رہیں ہیں اور آج تک ان کا چلن یہاں بڑے پیانے پر موجود ہے۔ ان کے ذریعے اناج ،لکڑی اور پتھر وغیرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگوں کے کہیں آنے جانے کے لئے بھی کشتیوں نے اہم کردار نبھایا ہے۔ سیر وتفریح کے لئے بھی کشتیاں بے حد مشہور ہیں۔جھیلوں اور دریاؤں میں کشتیوں اور ہاوس بوٹوں کا منظر بڑا ہی دلکش نظر آتا ہے۔

کشمیر میں کشتیوں کی کئی قسمیں پائی جاتی ہیں۔سب سے بڑی کشتی ڈونگہ (ہاوس بوٹ) کہلاتی ہے۔ جو اکثر و بیشتر جھیل ڈل کے کنارے پائی جاتی ہیں۔ڈونگہ اچھا خاصہ لمبا چوڑا چھت کے ساتھ بنا ہوتا ہے۔ یہ ایک چھوٹے مکان کی مانند ہوتا ہے اور یہی کشمیری ہانجی طبقے کا آشیانہ ہوتا ہے۔ جہاں وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ سیاح اس میں ذوق وشوق سے رہتے ہیں۔اس کے دو چار کمرے ہوتے ہیں ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بھی ہوتا ہے۔''بہڑ'' عام طور سے شالی اور دوسرے طرح کا سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔اس کی چھت ڈھلوان دار ہوتی ہے۔ یہ دوسری چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے بڑی ہوتی ہے اس لئے بعض دفعہ دریا میں پانی کم ہونے کی وجہ سے یہ تیر نہیں پاتی ہے۔اسی طرح سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے چھت کے بغیر ایک لمبی اور چوڑی کشتی ''کھوج'' کہلاتی ہے۔سیاحوں کے لئے خاص طور سے ''لرناؤ'' ہوتی ہے جسے ہاوس بوٹ بھی کہتے ہیں۔ یہ بہت بڑی ہوتی ہے بعض اوقات دو منزلہ بھی ہوتی ہے۔ یہ کشتی عام طور سے سطح پانی پر ایک ہی جگہ ساکن رہتی ہے۔'' پرندہ'' میں کوئی خاص آدمی ہی سواری کرتا ہے۔ یہ ایک ہلکی اور لمبی شاہی سواری ہے۔اس کے علاوہ اور بھی کشتیاں ہیں جن میں شکارہ، ڈبمیہ اور ٹاسہ واُر شامل ہے۔کشتی کو کشمیری زبان میں ''ناوَ'' کہتے ہیں۔ان کشتیوں کے تعلق سے ایم۔ایس۔ناز لکھتے ہیں:

> ''دریائے بتستا اور اس سے ملحق چھوٹے بڑے دریاؤں اور ندی نالوں میں ہر وقت کشتیاں رواں دواں نظر آتی ہیں۔ ان کشتیوں کی متعدد

اقسام اور کئی نام ہیں۔ایک قسم اعلیٰ کشتیوں کی ہے اور ذی حیثیت لوگ ہی انہیں استعمال میں لاتے ہیں۔مثلاً پرندہ ایک طویل کشتی،جس کے سر پر ایک چھوٹا سا بنگلہ بنا ہوتا ہے۔باقی جگہ کشادہ ہوتی ہے اور یہاں ہانجی (ملّاح) بیٹھے رہے ہیں۔امراء اور نواب ہی زیادہ تر پرندہ کو پسند کرتے ہیں اور بقول بعض یہ الٰہی کے لئے خاص ہوتی ہیں۔پرندہ سے قدرے کم قیمتی اور مہنگی کشتیاں چاکہ واری اور لڑی ناؤ ہیں اول الذکر بھی بنگلہ نما ہوتی ہے،مگر اس میں صرف ایک ہی کمرہ ہوتا ہے۔جبکہ پرندہ ایک مکمل بنگلہ جس میں کئی کمرے ہوتے ہیں۔لڑی ناؤ پر بنے ہوئے مکان کا نقشہ مثل دیوان خانہ ہوتا ہے۔آج کل یہ تینوں قسم کی کشتیاں بہت کم نظر آتی ہیں۔''[۲۷]

اس طرح یہ کشتیاں کشمیر کے جھیلوں اور دریاؤں کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہیں۔کشتیوں کے علاوہ آمدورفت کے لئے گھوڑا سواری کا فقدان تھا۔اس کے لئے ''ٹانگہ'' اور ''ریڑا'' مشہور ہے۔اب زمانے کی ترقی نے نئی نئی ایجادات کی ہے جس نے ان کی جگہ لی۔تاہم کشمیر میں سیر وسیاحت وغیرہ کے لئے آج بھی یہاں گھوڑا سواری اور کشتیوں کا رواج برقرار ہے۔موٹر گاڑی کی ایجادات تو مال مویشی اور دیگر ساز وسامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے میں معاون ثابت ہوئی ہے۔لیکن کشمیر میں عام لوگوں کی سواری یعنی آمدورفت کے لئے سرکار کی طرف سے کوئی خاص انتظام نہیں کیا گیا ہے۔یہاں صرف چھوٹی چھوٹی ذاتی بسیں ہی کچھوے کی رفتار سے چل کر اس کام کو انجام دے رہی ہیں اور ان میں بھی اور لوڑ اتنا ہوجاتا ہے کہ ہلنے کی جگہ تک نہیں ملتی ہے۔حال ہی میں اب کچھ محدود پیمانے پر ریل سروس جاری کی گئی ہے۔جس سے عوام کی مشکلیں کچھ حد تک حل ہوئی ہیں۔

مکان:۔ کشمیر میں زمانۂ قدیم سے ہی شاندار عمارتوں کا رواج رہا ہیں۔آج بھی اگر غریب سے غریب آدمی کے پاس کچھ نہیں ہے لیکن رہنے کے لئے ایک مکان یعنی گھر ضرور ہوتا ہے۔کیونکہ کشمیر کے موسم ایسے ہے کہ مکان کے بغیر رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔چونکہ کشمیر میں اعلیٰ قسم

کی لکڑی آسانی سے ملتی ہے اس لئے مکانات تعمیر کرنے میں لکڑی کا زیادہ استعمال ہوتا ہے۔لکڑی سے بنے روشن دان، کھڑکیاں، دروازے اور چھت یہاں کی اعلیٰ فن کاری اور خوبصورتی کے بے مثال نمونے ہیں۔ابتدائی دور میں تو مکان خاص طور سے لکڑی کے ہی بنائے جاتے تھے۔یہاں مکان دو، تین منزلہ سے بھی زائد تعمیر کئے جاتے ہیں۔چھتیں جھکی ڈھلوان ہوتی ہے تا کہ برف باری کے موسم میں برف آسانی سے پھسل کر گر جائے۔پرانے زمانے میں مکانوں کی چھتیں گھاس پھوس کی ہوتی تھی۔اب اس کی جگہ رنگ برنگے ٹین استعمال کئے جاتے ہیں۔مکانات عام طور سے دریا کے کنارے تعمیر کئے جاتے تھے۔کیونکہ کہیں آنے جانے کے لئے کشتیاں استعمال کی جاتی تھی۔اب تو بستیاں دور دور تک پھیل گئیں ہیں اور مکانات تعمیر کرنے میں وسعت آئی ہے۔لوگ مکان کو سجانے سنوارنے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔

لوگ:۔ کشمیری لوگوں کا رنگ عموماً گورا ہوتا ہے لیکن گندمی رنگ کے لوگ بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔قد درمیانہ، چہرہ لمبا اور آنکھیں مختلف جیسے نیلی، کالی، پیلی، شکل وصورت اچھی ہوتی ہے۔بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ فطین، نفاست پسند اور بہت ضدی بھی ہوتے ہیں۔ان میں مختلف تہذیبی اثرات کو اپنے اندر سمونے کی قوت موجود ہوتی ہے۔ان کا ذہن اور دماغ نئی تبدیلیوں کو محسوس کرتا ہے۔ارجن دیو مجبور کے مطابق یہ لوگ عرصہ دراز تک بیرونی حملہ آوروں اور بے رحم بادشاہوں اور جاگیردارانہ نظام کے بوجھ تلے دبے رہنے کی وجہ سے کچھ شکی مزاج اور انفرادیت پسند بن گئے ہیں۔کشمیر کے بیشتر لوگ سیدھے سادھے اور سنجیدہ ہوتے ہیں اور آپس میں کوئی درار پیدا ہونے پر ایک دوسرے سے کنارہ کشی کرتے ہیں نہ کہ کوئی خطرناک انتقام لیتے ہیں۔برج پریمی کشمیری لوگوں کے تعلق سے فرانس برنیر کی یہ صراحت لکھتے ہیں:

> ''کشمیری اپنی ذکارت کے لئے مشہور ہیں۔یہ لوگ ہندوستانیوں سے زیادہ ذہین سمجھے جاتے ہیں۔شعر و شاعری اور سائنسی علوم میں یہ ایرانیوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔یہ بڑے ہوشیار اور محنتی لوگ ہیں۔ان کی

کاریگری کا احساس ان پالکیوں، پلنگوں، قلمدانوں، چمچوں اور دوسری ایسی چیزوں سے ہوتا ہے جو یہ لوگ اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں۔ یہ بڑی شاندار چیزیں ہیں اور ہندوستان کے طول وعرض میں ان کا استعمال ہوتا ہے۔"۲۸

مہمان نوازی میں کشمیری سب سے آگے ہیں۔ یہ لوگ گھر آئے ہوئے مہمان کی بہت خاطر داری کرتے ہیں۔ بغیر کچھ کھلائے پلائے مہمان کو جانے نہیں دیتے ہیں۔ کشمیری لوگ ایک دوسرے کے یہاں اکثر آتے جاتے ہیں۔ رشتہ دار، دوست احباب کی خیر خبر ہمیشہ لیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر بھی ایک دوسرے کے یہاں مبارکباد دینے جاتے ہیں۔ تیمارداری میں بھی ان کا اہم کردار ہے۔ خوشی خوشی گھر آئے ہوئے مہمان کا استقبال کرتے ہیں۔ اسی لئے چکبست نے کہا ہے:

ذرہ ذرہ ہے میرے کشمیر کا مہمان نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

یہی پیار ومحبت ان کی شناخت اور گہنا ہے۔ کسی بھی مصیبت یا آفت کے وقت آپس میں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ کشمیر کے غریب سے غریب لوگ بھی غم اور خوشی کے موقع پر تحفے دینے میں حصّہ لیتے ہیں۔ ان کے پے در پے آنے والے حملہ آوروں نے ان کے قومی کردار پر تاثر نہیں چھوڑا ہے۔ سر والٹر روبرٹ لارنس لکھتے ہیں:

"کشمیر کے باشندے ایشیا میں سب سے زیادہ ذہین اور زندہ دل لوگ تصور کئے جاتے ہیں اور اس بات کے وہ مستحق بھی ہیں۔ ایک دریا دل اور دانشمند حکومت کے ساتھ وہ اعلیٰ پایہ کے ذہین اور بااخلاق لوگ ہوتے ہیں۔

لیور کے مطابق بہت سارے پہلوؤں سے کشمیری کاشتکار آئرلینڈ کے ایک باشندے سے مطابقت رکھتا ہے۔ یقینی طور پر وہ حاضر جوابی کا مالک ہے جو آئرلینڈ کے باشندے کا خاصا ہے اور کرایہ دینے میں اسے بھاری

اعتراض ہوتا ہے۔آئر لینڈ اور کشمیر کی بابت بہت سارے معاملات میں
یکسانیت ہے۔''۲۹

کشمیری لوگ آپس میں ہی رشتے ناتے جوڑتے ہیں۔ بلکہ کشمیریوں میں بھی شادی بیاہ کے معاملے میں ذات پات کی تھوڑی بہت تمیز پائی جاتی ہے۔شادی بیاہ اپنی ہی برادری میں کرتے ہیں اور دوردراز رشتے جوڑنے میں گریز کرتے ہیں۔شاید ہی کوئی کشمیری کشمیر سے باہر شادی بیاہ کرنے میں دلچسپی لیتا ہو۔حالانکہ کاروباری یا پڑھنے لکھنے کے سلسلے میں یہ کشمیر سے باہر بھی رہتے ہیں مگر اپنی وادی کو کبھی فراموش نہیں کرتے ہیں۔تاریخ گواہ ہے کہ یہ لوگ کسی بھی بیرونی ملک کے فرد کو اندر آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔جب ان کا ایک الگ تھلگ ملک ہوا کرتا تھا۔ماسوائے ان پر یہودیوں کے تاثرات ظاہر ہوتے ہیں۔جس کے تعلق سے رشید نازکی لکھتے ہیں:

''کشمیر میں یہودیوں کی آمد اور قبیلے کے آثار کے بارے میں کئی مورخوں نے نشاندہی کی ہے۔یہ خاص قبیلہ مورخوں کی نظر میں کلدانی تھا۔عجیب بات یہ ہے کہ کلہن سے قبل البرونی بھی اس بات کا قائل نظر آرہا ہے کہ کشمیر کے لوگ اپنی سرزمین میں یہودیوں کے بغیر کسی اور قوم کو قدم دھرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور پھر البرونی کے سینکڑوں سال بعد بُرنیر کشمیر میں داخل ہوتے ہی اس بات کا قائل ہوجاتا ہے کہ اس دیش کے لوگوں کے رنگ وخون اور چال وچلن میں یہودی فطرت کا بڑا عمل دخل ہے۔اس کی تصدیق بعد میں سرفرانس بینگ ہسبنڈ اور والٹر لارنس کے اُن بیانات سے بھی ہوتی ہے جوانھوں نے کشمیریوں کے کردار اور رنگ کی بناء پر اور علم بشریات کے عین مطابق قرار دیتے ہیں۔''۳۰

یوں اگر کشمیری لوگوں پر یہودیوں کے اثرات ہیں بھی،تب بھی یہ ملک بھر میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔سارے ملک میں ایک کشمیری کی شناخت دور سے ہوتی ہے۔کشمیری

مزاجاً تیز ہوتے ہیں اور وسعی دل بھی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہر دور میں ظلم وستم کا شکار ہوتے آئے ہیں۔ جس نے ان کے دلوں میں ڈر اور خوف پیدا کیا ہے۔ عاشقانہ مزاج ایک کشمیری کا اساسہ ہے۔ اس میں ظلم وستم، غربت، بے بسی اور بے کسی سے جدوجہد کرنے کی ہمت موجود ہے۔ جس کی باقیات آج تک ان کے دامن کے ساتھ جڑی ہیں۔

درخت:۔ کشمیر کا حسن نکھارنے میں سایہ دار چنار، گھیرے اخروٹ کے درخت، بید کے درختوں کی نہ ختم ہونی والی قطار، آسمان کو چھوتے سفید، مہکتے دیودار، صنوبر (کائر)، سیب اور ناشپاتی وغیرہ کے بے شمار درخت اہم کردار نبھاتے ہیں۔ ولٹر روبرٹ لارنس لکھتے ہیں:

> ’’کشمیر کے درختوں کے بارے میں کسی اور جگہ بحث کی جائے گی مگر یہاں پر صرف اتنا کہوں گا کہ وادی کے درخت وادی کے لیے بہت کشش رکھتے ہیں۔ ہموار سطح پر خوش نما درخت، عمدہ اخروٹ اور بے شمار بید، سفیدے اور سیب، ناشپاتی اور خوبانیوں کے باغات وادی کے ایک بھرپور جنگلی پارک کی صورت عطا کرتے ہیں۔ یہاں پر مشرق اور مغرب کا امتزاج ہے۔ فصلیں بلا شک مشرقی ہیں۔ گول شکل کے درخت، دریا، ندی نالے اور سرسبز گھاس کے کنارے اور بید سبھی مغرب کی یاد دلاتے ہیں۔ بے شمار میوہ دار درختوں سے بھرا ہوا لولاب اور اس کے دیہات جن کے راستوں پر ایلم کے سایہ دار دیوار کے درختوں سے بھرپور پہاڑ ہیں ایک ایسا نظارہ پیش کرتے ہیں جس میں کچھ بھی مشرقی نہیں۔‘‘[۳۱]

چنار کشمیر کا شاہی درخت گردانہ جاتا ہے اس کی شاخیں دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ اس کا سایہ بے مثال ہے۔ اکثر لوگ اس کے سایہ میں بیٹھ کر باتیں کرتے اور کھیل کھیلتے ہیں۔ اس کے پتّے نومبر کے مہینے میں سرخ رنگ کے ہوکر گرتے ہیں کئی سال گزرنے کے بعد اس میں بہت بڑا کھوکھلا پن آجاتا ہے جس کے اندر ایک ساتھ دس افراد سمو سکتے ہیں۔ بارش کے موسم میں اکثر یہ کھوکھلا

کام آتا ہے۔سفیدے کے درخت کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں ۔ یہ آسانی سے کہیں بھی اُ گائے جاسکتے ہیں۔اس کی لکڑی خاص اہمیت نہیں رکھتی ہے تاہم غریب لوگ مکان بنانے میں اسی لکڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ بہت اونچائی تک اُ گتا ہے اس کی کئی قسمیں یہاں پائی جاتی ہیں۔اس کی ایک قسم ایسی ہے جس کی شاخوں سے مئی کے مہینے میں کافی بڑی تعداد میں ایک طرح کی روئی گرتی ہے جو بہت ہی ملائم ہوتی ہے لیکن اس میں پٹرول کی سی طاقت موجود ہے۔اس پر ذرا سی چنگاری چھٹر کنے پر آگ دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ اس طرح سے یہاں کئی واقعات و حادثات پیش آئے ہیں۔ سفیدے کے درختوں کی لکڑی سے عام طور پر سیب کی پیکنگ کے لئے ڈبّے تیار کئے جاتے ہیں۔

ریاست کا سب سے بہترین درخت دیودار مانا جاتا ہے۔ اس کی لکڑی سے مکان، کشتیاں اور پل بنائے جاتے ہیں۔اس کی لکڑی نہایت مضبوط ہوتی ہے۔ پانی اس پر اثر نہیں کرتی ہے۔قدیم عہد کے زیارتیں اسی لکڑی سے تعمیر کین گئیں ہیں۔سرینگر کی اعلیٰ فنِ تعمیری کی مثال جامع مسجد کے اونچے ستون بھی دیودار کی لکڑی سے تیار کئے گئے ہیں۔اس طرح صنوبر کے درختوں کی بھی بہت قدر و قیمت ہے جسے کشمیری زبان میں ''کائر'' کہتے ہیں۔صنوبر کے مقابلے میں ایک اور جنگلی درخت بدھل پر صنعتی کام کرنا آسان ہوتا ہے۔کیونکہ اس میں گانٹھیں نہیں ہوتی ہیں جبکہ صنوبر میں بہت ساری گانٹھیں ہوتی ہیں۔ بید کے درخت کشمیر میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں جو کئی طرح سے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔لارنس لکھتے ہیں:

> ''وِیریا بید کا درخت وادی کے ہر گاؤں میں اگتا ہے جہاں کہیں پانی یا پانی کی نمی موجود ہے وہاں اس کا اگنا بے حد آسان ہوتا ہے۔ اس درخت کی لچکدار شاخوں کی ہر سال بربادی ہوجاتی ہے کیونکہ گھاس چارے کے لئے ان کی چھوٹی چھوٹی چھڑیاں (مورہ) کاٹ دی جاتی ہیں اور کاٹنے کے بعد ان کے پتے ایندھن کے طور پر جلائے جاتے ہیں۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ ایک کشمیری کو انگلینڈ بھیجا جانا چاہئے تاکہ وہ

ٹوکریاں تیار کرنے کی صنعت میں تربیت حاصل کرے۔ کشمیر میں
ٹوکریاں اور کرسیاں بنانے کے لیے اتنا مواد موجود ہے کہ یہاں سے یہ
چیزیں سارے ہندوستان کو برآمد کی جاسکتی ہیں۔'' ۳۲

دیگر درختوں کے پتے اور شاخیں مویشیوں کو چارے اور چولا جلانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور ان کی لکڑی سے پائیدار اور خوبصورت فرنیچر، کھیل اور آرائش کا سامان بھی بنایا جاتا ہے۔ اس طرح یہاں مختلف درختوں کی اپنی اپنی اہمیت ہے جو وادی کی انفرادیت کے سرچشمہ ہے۔

میوے:۔ کشمیر کے میوے دلفریب، لزیذ ولطیف اور دلکش ہیں۔ ملک بھر میں ان رسیلے اور میٹھے میوؤں کی اہمیت ہیں۔ ہر کوئی یہاں کے میوؤں کو شوق سے کھاتا ہے۔ وادی کشمیر میں تقریباً ہر قسم کے میوے پائے جاتے ہیں صرف کچھ ہی ایسے میوے ہونگے جو یہاں نہیں اُگتے ہیں۔ یہاں کے میوؤں میں سیب، آڑو، اخروٹ، خربوز، تربوز، انار، خوبانی، انگور، گلاس، آلوچہ، توت، بادام، امرود، ناشپاتی، چہارمغز اور بستہ مغز وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میوؤں کی برآمد کرنے کی ایک باضابطہ صنعت ہے جس پر لاکھوں گھرانے پلتے ہیں۔ یہ میوے ملک بھر کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی فروخت ہوتے ہیں۔ جام اور جلی کی صورت میں بھی باہر بھیج دیئے جاتے ہیں۔ جہانگیر اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں:

'' کابل کے باغ شہرآرا میں میرزائی کا نام خوبانی کا ایک درخت تھا۔
میں نے اس کی خوبانی سے بہتر خوبانی نہیں کھائی تھی لیکن کشمیر کے باغوں
میں اس جیسے کتنے ہی درخت ہیں۔ یہاں کی ناشپاتی عمدہ اور اعلیٰ قسم کی
ہوتی ہے۔ کابل اور بدخشاں سے بہتر، تقریباً سمرقند کی ناشپاتی کے برابر
ہے۔ یہاں کا سیب اپنی خوبی میں مشہور ہے انگور کثرت سے ہوتے
ہیں، تربوز اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے خربوزے نہایت شیریں اور نقش دار ملائم
ہوتے ہیں'' ۳۳

آج ریاست کی آمدنی میوؤں کی وجہ سے کافی بڑھ گئی ہے اور دن بدن فروغ پا رہی ہے۔ کشمیر عوام کھیتی باڑی سے زیادہ میوؤں کی پیداوار کو بڑھاوا دیتے ہیں اور طرح طرح کے درخت دور دراز سے منگوا کر لگائے جاتے ہیں۔ اس طرح روز بروز میوے کے باغوں میں وسعت آجاتی ہے۔ کیوں کہ اس کی پیداوار سے خاطر خواہ آمدنی ہوتی ہے۔ مگر اب ان کی بیماریوں میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ جسے مالکانِ باغات کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں ایک یا دو اسپریے دوا سے کام چل جاتا تھا وہاں آج کئی سپرے کرنے پڑتے ہیں۔ تاہم اس صبر آزما کام میں اچھا خاصہ منافعہ ہوتا ہے۔

سیب: ۔سیب کو کشمیر کے میوؤں میں سب سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسے میوؤں کا بادشاہ کہنا بے جا نہیں ہوگا۔ انسانی صحت کے لئے بھی بے حد فائدہ مند ہے۔ اس میں فولاد کا جز بھی موجود ہے۔ جو خون صاف کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کشمیر میں کئی قسم کے سیب پائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے پکنے والے سیب کو ''سورِ'' کہتے ہیں جو جولائی کے پہلے ہفتے میں پک جاتے ہیں۔ اس کے ذائقے میں ہلکا سا کھٹا پن ہوتا ہے۔ اس کا رنگ گلابی ہوتا ہے لیکن یہ کافی دیر پا نہیں رہ سکتا ہے اس لئے چند دنوں تک اس کا دبدبہ رہتا ہے۔ اس کے بعد پکنے والے سیب کو ''حضراب بلی'' کہتے ہیں جو بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اگر چہ اس کی عمر کم ہوتی ہے لیکن یہ ریاست سے باہر دور دور تک فروخت ہوتا ہے۔ اور بہت پسند بھی کیا جاتا ہے۔ اس کا ذائقہ شرنی اور رنگت سرخ ہوتی ہے دوسرے سیبوں کے مقابلے میں اس کا سائز چھوٹا ہوتا ہے۔ حضرت بلی کے اختتام تک کئی قسم کے سیب ترشی، عشق پہچان، کنڈ کشن، کسر، رزاق وار، امبُر اور فو کھلہ وغیرہ پک جاتے ہیں۔ ان میں کچھ میٹھے ہوتے ہیں اور کچھ ترش۔ یہ بھی زیادہ دیر تک نہیں رہتے ہیں اس لئے ساتھ ساتھ یہ فروخت بھی ہو جاتے ہیں۔

کشمیر میں جن سیبوں کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور کافی دیر تک بھی رہ سکتے ہیں۔ ان کے پکنے کا موسم وسط ستمبر سے شروع ہو کر اکتوبر کے اختتام تک رہتا ہے۔ ان سیبوں کی ایک قسم

''امریکن'' کہلاتی ہے۔ جونہایت ہی سرخ رنگ کا ہوتا ہے مٹھاس اور شیرینی میں لاثانی ہونے کے ساتھ رس دار بھی ہوتا ہے اس قسم کے سیب کئی دنوں تک رہ سکتے ہیں۔ اس کے مشابہ ایک قسم ''مہاراجی'' کہلاتا ہے جومہک اور رنگت کے لحاظ سے امریکن کے مانند ہے البتہ شکل میں قدرے اس سے بڑا اور لذت میں بے حد ترش ہے یہ قسم تمام سیبوں کے آخر میں پک جاتی ہے۔ سب سے اعلیٰ قسم کا سیب ''ڈیلیشن'' کہلاتا ہے۔ جسے ملک اور بیرون ممالک کے علاوہ مقامی لوگ بھی بے حد پسند کرتے ہیں۔ لذت، رنگت اور سائز میں لاجواب ہے اس میں کافی لطافت اور دلکشی ہوتی ہے۔ اطبا نے دل وجگر کے لئے مفید قرار دیا ہے۔ سب سے زیادہ پیداوار اسی قسم کی ہوتی ہے اور بازاروں میں مانگ بھی اسی کی زیادہ ہے مگر بدقسمتی سے چند سالوں سے یہ میوے درختوں پر کم لگتے ہیں جبکہ باغوں میں اکثریت اسی کے درختوں کی ہے۔ یوں تو ہر قسم کے سیبوں سے جام تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن ڈیلیشن کے جام کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔

ناشپاتی:۔ کشمیر میں سیب کی طرح کئی قسم کے ناشپاتی بھی پائے جاتے ہیں۔ جس کو کشمیر زبان میں ''ٹنگ'' کہا جاتا ہے۔ اس کی خوب تجارت ہوتی ہے۔ یہاں کے ناشپاتی بھی بے حد لذیز اور رس دار ہوتے ہیں۔ ناشپاتیوں میں ''سورِٹنگ'' پہلے پک جاتے ہیں جو شریں اور کافی رس دار ہوتے ہیں جب یہ درخت سے کبھی گر جاتا ہے تو اس کے کئی ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ اس لئے اس کو توڑتے اور پیک کرتے وقت نہایت احتیاط برتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح ناشپاتی کی اور بھی کئی قسمیں ہیں۔ جیسے ناک اور فراش وغیرہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ جو بہت ہی شیریں اور توڑنے کے بعد ان میں اور زیادہ ذائقہ، رس اور رنگ آجاتا ہے۔ جب تک یہ درخت پر رہتے ہیں ان کا رنگ سبز رہتا ہے توڑنے کے کچھ دنوں بعد ان کا رنگ زرد ہوتا ہے کئی مقامات پر لوگ انھیں سکھا کر بھی رکھتے ہیں اور پھر بیچتے ہیں۔ جس کو کشمیری میں ''ٹانجہ'' کہتے ہیں۔

توت:۔ کشمیر میں توت کے درخت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جن کو یہاں کے

لوگ ذوق وشوق سے کھاتے ہیں۔اس کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔لیکن دو قسمیں بہت مشہور ہے۔ اس کی ایک قسم ''شہتوت'' کہلاتی ہے۔جو بہت میٹھے ہوتے ہیں اور عام طور پر سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔اس طرح دوسری قسم ''بٹ توت'' کہلاتی ہے۔جو تھوڑے بہت کھٹے ہوتے ہیں۔ان کا رنگ سرخ اور کالا ہوتا ہے۔توت کے پتے ریشم کے کیڑے پالنے کے کام آتے ہیں۔اس لئے توت کے درخت کی پرورش سرکار کو بڑی حفاظت سے کرنی ہوتی ہے۔مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور تک صنعت ابریشم آزاد تھی تو لوگ جب چاہتے تھے تخم خود بناتے تھے یا کہیں سے وصول کر کے کرم کشی کرتے تھے۔اور ریشم کے کیڑے اپنی مرضی سے پالتے تھے۔ان کے لئے توت کے پیڑ لگاتے تھے اور ضرورت پڑھنے پر یہ درخت کاٹ بھی دیتے تھے۔جس پر مہاراجہ رنبیر سنگھ نے پابندی لگادی۔توت کے درخت کاٹنے والے کو سخت سے سخت سزا دی جانے لگی۔جس کی وجہ سے لوگ توت کے درخت لگانے سے پرہیز کرنے لگے۔کیونکہ کہیں یہ درخت ان کے لئے مصیبت نہ بن جائے۔اسی زمانے سے ایک محاورہ کشمیر میں مشہور ہوا ہے۔جو آج بھی ہر کشمیری کی زبان پر ہوتا ہے اور موقعہ و محل کے مطابق اس محاورے کو استعمال کرتے ہیں۔غلام حسن بیگ عارف اس تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''کرم کشوں کو مہاراجہ کے حکم سے بہت سی مراعات دی گئیں۔بیگار سے ان کو متشنیٰ قرار دیا گیا۔ان کو دیہاتوں کے مکانات پر کرم کشی کے لئے قبضہ کرنے کا اختیار دیا گیا۔توت کے درختوں کو نقصان کرنے والوں کی مخبری کا کام بھی ان کو ہی سونپ دیا گیا۔ان لوگوں نے دیہاتیوں کا قافیہ تنگ کر دیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ کرم کشی کے نام سے نفرت کرنے لگے۔ اور توت کے درخت وبالِ جان سمجھے جانے لگے۔کرم کشوں کے ظلم و ستم سے کشمیری زبان کو ایک محاورہ ملا۔''الہ کُلِس ٹلہ کُل کرُن۔'' یعنی کدو کے پودے کو توت کا درخت بنا کر پیش کرنا (اور کسی کو مصیبت میں ڈالدینا) دوسرے لفظوں میں کسی سے انتقام لینے کے لئے''قانونِ تحفظِ ابریشم'' اور تحفظِ درختِ توت'' کی زد میں پھنسانا۔''۳۴؎

انگور:۔ کشمیر میں انگور کے باغات کی بہتات رہی ہے۔سلاطینِ کشمیر نے انگور کے باغات لگوانے میں کافی دلچسپی لی ہے۔مغلوں نے اپنے دورِحکومت میں انگور کی بہترین قسمیں منگوا کر اس پھل کوخوب وسعت دی۔افغانوں کے دور میں یہاں انگور کے باغ جوبن پر تھے۔ڈوگردوں نے زین العابدین کے لگائے گئے باغ کا نام مہاراج باغ رکھا۔اور کئی نئے باغات لگوائے۔کشمیر کے انگور دور دور تک مشہور ہیں۔

گلاس:۔ کشمیر میں گلاس میوے کی بھی کئی قسمیں پائی جاتی ہیں۔نہایت نرم ونازک میوہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی لزیز بھی ہے۔یہ میوہ زیادہ دیر پا نہیں رہ سکتا ہے۔اس سے جام تیار کیا جاتا ہے جو بہت پسند کیا جاتا ہے۔''اُلوچہ'' ایک قسم کا میوہ گلاس کے ہی مترادف ہے البتہ سائز میں اسے ذرا چھوٹا اور ذائقے میں گلاس سے تراش ہے۔

اشطابر:۔ اشطابر کی کاشت کشمیر میں کافی ہوتی ہیں۔اس کی ایک قسم جنگلی اشطابر کہلاتی ہے۔جوجنگلوں میں خود بخود اُگتے ہیں اوراس کے پودے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔دوسری قسم کی اشطابر کولوگ ذاتی طور پر خود کے باغوں میں اُگاتے ہیں جو بہت ہی ذائقے دار ہوتی ہےاور صحت کے لئے بھی فائدہ مند ہوتی ہے۔

خوبانی:۔ اس کو کشمیری میں ''ژیر'' کہتے ہیں۔یہ میوہ درختوں پر کثرت سے لگتا ہے۔یہ زرد رنگ کی ہوتی ہیں اور ہلکا سا سرخ رنگ بھی اس کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔پہاڑی علاقوں میں اس کی کافی کاشت ہوتی ہے۔اس کی کچھ ایسی قسمیں بھی ہیں جن کو سکھایا جاتا ہے۔اس کے بعد استعمال میں لائی جاتی ہے۔ان کا مغز اکثر میٹھا ہوتا ہے اور بعض ایسی ہے جن کا مغز کڑوا ہوتا ہے۔

انار:۔ کشمیر میں انار کے درخت بہت موجود ہیں۔یہاں کے انار مٹھاس اور شرینی کے لئے بہت مشہور ہیں۔انار صحت کے لئے بھی کافی مفید قرار پایا ہے۔اس کی بعض قسمیں یہاں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو ترش ہوتی ہیں۔

بادام:۔ کشمیر کی تجارت پر اس کا خاصا اثر پڑتا ہے۔ ہر سال سینکڑوں من بادام کی پیداوار ہوتی ہے اور کئی لوگوں کا پیشہ اسی کے ساتھ جڑا ہے۔اس کی کئی قسمیں پائی جاتی ہیں۔سب سے اعلیٰ قسم کاغذی بادام کہلاتی ہے۔جس کا چھلکا بہت ہی نرم ہوتا ہے۔کشمیر کے بادام دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔اس کے درخت اکثر پہاڑ کے دامنوں میں اُگائے جاتے ہیں۔

اخروٹ:۔ کشمیر میں اخروٹ کی کاشت بھی بڑے پیانے پر ہوتی ہے۔سیب کے بعد دوسرے نمبر پر اخروٹ کی پیداوار ہوتی ہے۔یہ کشمیر کے ہر گھر کے صحن میں پائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ باضابطہ اس کے باغ بھی لگائے گئے ہیں۔وادی لولاب میں بڑی تعداد میں اخروٹ پائے جاتے ہیں۔اس کو ادویات کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔کولسٹرال اور دماغ کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔اخروٹوں سے تیل بھی نکالا جاتا ہے اور کھانے کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ان سب میوؤں کے علاوہ اور بھی کئی میوے یہاں پائے جاتے ہیں۔جو بہت ہی لزیز اور فائدہ مند ہوتے ہیں۔جن میں آڑو، آلو بکھارا، تربوز، خربوز وغیرہ شامل ہے۔

پکوان:۔ کشمیر میں چاول کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جو ہر گھر میں ہمیشہ دو وقت پکتا ہے۔زمانہ قدیم میں چاول کی جگہ گیہوں اور مکئی کا راوج بھی رہا ہے۔کیونکہ اُس زمانے میں یہاں چاول کی کاشت نا ہونے کے برابر ہوتی تھی۔چاول کے ساتھ کئی طرح کی سبزیاں کھائی جاتی ہیں۔کشمیر کی ایک قدیم اور عام سبزی ساگ (ہاکھ) ہے جو بے حد مقبول ہے۔یہ کشمیر کے ہر گھر میں بنتی ہے اور اسے لوگ کثرت سے کھاتے ہیں۔میٹھے میں نشاسط، حلوا اور فیرنی عام طور پر بنائی جاتی ہے۔نمکین چائے اور قہوہ کا رواج عام ہے جس کے ساتھ کئی قسم کی روٹیاں بکرخانی، لواسہ، تیل ور، قلچہ، گردہ، شرمال اور گیہوں اور چاول کی روٹیاں کھائی جاتی ہیں۔چائے پینے کے لئے خاص طور سے بغیر دستی والے پیالے استعمال کئے جاتے ہیں۔مچھلی اور کدو پکانے کا اپنا ایک الگ طریقہ ہے۔کدو کو سبزی کے طور پر پکانے کے علاوہ کدو میں چینی ملا کر تلہ جاتا ہے جس کو ''کھنڈال'' کہتے ہیں اور دوسرا

طریقہ کدو میں نمک دہی اور زیرہ ڈال کر تیار کیا جاتا ہے۔اس کو''ددھ ال'' کہتے ہیں۔کشمیری دودھ پینے کے بہت عادی ہوتے ہیں۔اس لئے دودھ میں کئی طرح کے گوشت اور سبزیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔نشے کے طور پرنسوار اور تبا کو کا استعمال کیا جاتا ہے۔جس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی برابر کا ساتھ نبھاتی تھی۔لیکن موجودہ دور بہت کم عورتیں نشا کرتی ہیں۔

وازہ وان:۔ کشمیر کے لوگ گوشت کھانا بہت پسند کرتے ہیں۔یہاں پر ہر مذہب اور فرقے کے لوگ تقریباً گوشت کھاتے ہیں۔پالتو جانوروں کے علاوہ پرندوں کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔اس لئے یہاں کے لوگ شکار کرنے کا بھی بہت شوق رکھتے ہیں اور اس کام کو کئی طرح بندوق، ٹوکری اور والواش (گھوڑے کے دم کے بالوں اور دھگا سے تیار کیا جاتا ہے) وغیرہ سے انجام دیا جاتا ہے۔گوشت کو کئی طرح سے پکایا جاتا ہے۔اس سے تیار کئے گئے پکوان بہت ہی لزیز اور دیکھنے میں خوبصورت ہوتے ہیں۔ان مختلف پکوانوں کے نام اس طرح ہے۔رستہ، کباب، گوشتاب، روغن جوش، قورمہ، میتھی ماز، طبخ ماز، ٹیٹھ، آب گوش اور یخنی وغیرہ۔ان کئی پکوان کا مجموعہ''وازہ وان'' کہلاتا ہے۔جس کا اہتمام ہر خوشی کے موقع پر کیا جاتا ہے۔اس''وازہ وان'' کے بیشتر پکوان ایران کے توسط سے کشمیر پہنچے ہے۔وازہ وان دولفظوں پر مشتمل ہیں۔''وازہ'' کشمیری زبان میں ضیافتیں پکانے میں مہارت رکھنے والے کو کہتے ہیں۔''وان'' دکان کو کہا جاتا ہے کیونکہ وازہ جب کئی طرح کے پکوان ایک ہی جگہ بہت سارے برتنوں میں ایک ساتھ تیار کرتا ہے۔تب وہ ایک بہت بڑے دکان کی طرح لگتا ہے۔شاید اسی لئے اس کا نام''وازہ وان'' دیا گیا ہے۔وازہ وان پکانے کے ساتھ ایک مخصوص طبقہ جڑا رہتا تھا جس کو یہ فن ورثے میں ملا ہوا تھا۔اس پیشہ کے لوگ سرینگر میں ایک جگہ آباد ہے جو وازہ پور کے نام سے پکارا جاتا ہے۔آج اس فن میں ہر پیشے کے نوجوان دلچسپی لیتے ہیں اور اس میں مزید پکوانوں کا اضافہ کیا جارہا ہے۔

وازہ وان کے لئے فن کے ساتھ ساتھ صبر وتحمّل اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔''میتھی

ماز''کو میتھی اور گوشت دونوں کو ریزہ ریزہ کر کے تیار کیا جاتا ہے یہ بہت ہی عمدہ ذائقے دار ہوتا ہے۔ کباب کو بھی ریزہ ریزہ کر کے پہلے سیخ میں لگا کر بھونا جاتا ہے اور پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تھوڑا سالن کے ساتھ پکایا جاتا ہے۔ رستہ اور گشتابہ وازہ وان کے دو اہم پکوان ہیں۔ ان ہی سے وازہ وان کی رونق ہے۔ جانور کو ذبح کرنے کے فوراً بعد اس کے کچھ بغیر ہڈیوں والے گوشت کو پتھر کی سل پر لکڑی کے ہتھوڑے سے کوٹا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ مصالے، نمک اور تھوڑی سی چربی ملائی جاتی ہے۔ اس کے بعد رستہ کے لئے چھوٹے چھوٹے گولے بنائے جاتے ہیں اور ہلدی، مرچ اور دیگر مصالے ڈال کر پکایا جاتا ہے اسی طرح گشتابہ کے لئے بڑے بڑے گولے بنائے جاتے ہیں۔ مگر گشتابہ میں کچھ مخصوص مصالے ڈالے جاتے ہیں اور خاص طور سے یہ دہی میں تیار کیا جاتا ہے۔ وازہ وان کے دیگر پکوان بھی مختلف طریقوں سے پکائے جاتے ہیں اور ان کی کٹائی کرنا بھی ایک فن ہے جو کسی ماہر وازہ کو ہی آتا ہے۔ طبخ ماز خاص طور سے گھی میں تیار کیا جاتا ہے۔ آب گوش دودھ میں پکایا جاتا ہے اور دوسرے پکوان جیسے ٹیٹھ، روغن جوش اور سرخ ناٹ وغیرہ پکانے میں تقریباً ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں رہتے ہیں۔ البتہ ''یخنی'' دہی میں بنائی جاتی ہے۔ کشمیر میں وازہ وان کو پیش کرنے کا بھی اپنا ایک منفرد انداز ہے۔ کسی تقریب میں جب وازہ وان پیش کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے مہمانوں کے ہاتھ دھلائے جاتے ہیں۔ اس کے لئے سیلاب چی اور آفتابہ (تاشا اور ناری) کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دسترخوان بچھائے جاتے ہیں۔ پھر ایک بڑی سینی (ترامی) میں چاول پروسا جاتا ہے۔ اس کے اوپر مختلف ضیافتیں میتھی ماز، کباب، طبخ ماز، سرخ ناٹ، نل، پیاز کا اچار اور تلا ہوا مرغا وغیرہ سلیقے سے رکھے جاتے ہیں۔ پھر ''سرپوس'' ایک خوبصورت برتن سے اسے ڈھک کر مہمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ہر ایک سینی میں چار افراد مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد وازہ دیگر پکوان دیگچی میں یکے بعد دیگرے لاتا ہے اور ترتیب سے سینی میں ڈال دیتا ہے۔ گشتابہ سب سے آخر میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وازہ وان جیسی دعوتوں میں مختلف چٹنیاں، پلاؤ، دہی، پانی اور کول ڈرک وغیرہ الگ سے ایک ٹوکری میں پیش کئے جاتے ہیں۔ کھانے سے

فارغ ہوکرایک بزرگ مہمان خدا تعالیٰ کاشکرادا کرنے کی رہنمائی کرتا ہے۔اس طرح شکرادا کرنے کے بعد دسترخوان بڑھایاجاتا ہے۔مہمانوں کے ہاتھ دھلائے جاتے ہیں اور پھرآخرمیں فیرنی یاحلوا پیش کیاجاتا ہے۔

پیداوار:۔ وادی کشمیر میں مختلف جگہوں کی آب وہوااورجغرافیہ بھی ایک دوسرے سے مختلف پائے جاتے ہیں۔کوئی علاقہ پہاڑی اورکوئی میدانی ہے۔اورکوئی ڈھلوان دار ہے کسی علاقے کی زمین بنجراورکسی کی زرخیز۔جس کے اثرات پیداوار پربھی پڑتے ہیں۔اس لئے ریاست کے مختلف حصّوں میں پیداواربھی مختلف ہوتی ہے۔

چاول کشمیر کی اہم پیداوار میں سے ایک ہے۔اس کی کاشت زرخیز زمین میں ہوتی ہے۔اس کے لئے گرم آب وہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کی کاشت زیادہ تر میدانی علاقوں میں ہوتی ہے۔ چونکہ کشمیر میں پانی زیادہ ہونے کی وجہ سے کچھ پہاڑی علاقوں میں بھی چاول اُگائے جاتے ہیں۔چاول یہاں اپریل میں بوئے جاتے ہیں اورستمبر میں کاٹے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ میدانی علاقوں میں مٹر، چنااورگیہوں کی کاشت بھی کافی مقدار میں ہوتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ ان کے لئے بونے کے وقت سردی اور پختہ ہونے کے وقت گرمی کی ضرورت ہوتی ہےاس لئےنومبر میں ان کا بیج بویاجاتا ہےاورجون کے مہینے میں کاٹاجاتا ہے۔

مکئی کی کئی قسمیں کشمیر میں پائی جاتی ہیں۔یہ تقریباً ہرجگہ بوئی جاتی ہے۔اب یہ ہے کہ کچھ علاقوں میں زیادہ بنتی ہےاورکہیں کم۔اس لئے میدانی علاقے اس کے لئے بھی بہتر ہیں۔پہاڑی لوگ اس کی زیادہ کاشت کرتے ہیں۔کیونکہ ان کا یہی ایک خاص پیداوار ہے جوآرام سے وہاں اُگتا ہے۔پہاڑی لوگ مکئی کی روٹیاں زیادہ پسند کرتے ہیں اور کثرت سے کھاتے ہیں۔دالیں بھی کشمیر کی مشہورخوراک ہیں۔جوسخت سردی میں کافی کام آتی ہے۔اس کی کاشت بھی کشمیر میں بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔دالوں کی کئی قسمیں مونگ،مسور، ماش اورراجماش تقریباً وادی کے ہرخطے میں بوئی جاتی

ہے۔

زعفران کی خرید وفروخت ابتداء سے ہی عروج پر تھی۔ یہ خاص دوائی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور پکوان کو مزید لذیز بنانے کے لئے مفید ہے۔اس کی کاشت کے لئے خاص آب وہوا اور مٹی درکار ہوتی ہے۔کشمیر میں پانپور، کھریواوراونتی پورہ کے علاقے اس کی کاشت کے لئے مشہور ہے۔لیکن اب کم وبیش کشمیر کے دوسرے علاقوں چرارشریف اور بارہمولہ کے کچھ حصّوں میں اس کی کاشت کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ سبزیوں کی کاشت بھی کشمیر میں بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔آلو، پیاز، گوبی، ساگ، ٹماٹر، بیگن اور کدو وغیرہ کشمیر کی خاص سبزیاں ہیں چند ہی ایسی سبزیاں ہوں گی جو یہاں نہیں اگتی ہیں۔کشمیر کے لوگ ان سبزیوں کو بھی موسم سرما کے لئے سوکھا کے رکھتے ہیں۔کیونکہ سردیوں میں کشمیر میں کوئی بھی چیز بننی محال ہے۔

کشمیر میں چراگاہوں کی کمی بھی نہیں ہے جہاں لوگ مویشیوں کو چرنے لے جاتے ہیں۔جیسے گلبرگ، سونہ مرگ، ناگ مرگ، یوس مرگ، بڈ مرگ اور توسہ مرگ وغیرہ۔ریاست کے بہت سارے علاقوں کے لوگ دور دور سے آکر مویشیوں کو لاکر ان میں چراتے ہیں۔خاص کر گجر بکروال اور چوبان پیشے کے لوگ ساری وادی کے کسانوں کے مویشیوں کو ان چراگاہوں میں چرانے لے جاتے ہیں اور پھر وہاں سردی شروع ہوتے ہی واپس اپنے گھروں کی طرف رخ کرتے ہیں۔مگر سردیوں میں مویشیوں کے چارے کے لئے کئی اقسام کے گھاس یہاں اُگائے جاتے ہیں۔ایسے چارے بھی وادی میں لائے گئے ہیں۔جو ایک بار بوئے جاتے ہیں اور کئی مرتبہ کاٹے جاتے ہیں۔ ریڈ کلور، لوسرن، اوٹس، برسیم وغیرہ یہاں کے چارے ہیں۔ان میں پروٹین کی اچھی مقدار پائی جاتی ہے اور گائے دودھ بھی اس سے زیادہ دیتی ہے۔باجرہ، گندم، سنگھاڑے اور سرسوں وغیرہ بھی یہاں کی خاص پیداوار میں شامل ہے۔

چرند وپرند:۔ وادیٔ کشمیر میں مختلف اقسام کے چرند وپرند پائے جاتے ہیں۔جن میں

کچھ تو پالتو ہیں اور دوسرے قسم کے جانور سرسبز جنگلات کی زینت بنتے ہیں۔ چرندے بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں جو یہاں کے موسموں کی طرح اپنی شناخت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ہر موسم میں طرح طرح کے جانور دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان تمام چرند و پرندوں پر انفرادی طور پر روشنی ڈالی جائے گی جو درجِ ذیل ہیں۔

گائے:۔ کشمیر میں اکثر لوگ گائے کو ذوق وشوق سے پالتے ہیں۔ گاؤں دیہات کے علاوہ شہروں اور قصبوں میں بھی گائے پالی جاتی ہے۔ اس کا دودھ صحت کے لئے بے حد مفید ہے۔ کشمیری لوگ گائے کا دودھ ہی کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ابتداء سے کشمیر میں چھوٹے قد کی گائیں پائی جاتی ہیں لیکن اب یہاں مختلف قسم کی نئی نسلوں کی گائیں بھی لائیں گئی ہیں۔ جو بڑے قد کی ہوتی ہیں۔ اور دودھ بھی کافی تعداد سے دیتی ہے۔ کشمیری لوگ گائے کے دودھ سے ہی دہی، گھی، مکھن اور پنیر وغیرہ تیار کرتے ہیں۔ گائے کی تیمارداری اور نسل کشی وغیرہ کے لئے ہر جگہ ویٹانریز کا انتظام کیا گیا ہے۔ گائے کا دودھ ساری وادی میں سپلائی ہو جاتا ہے۔ چونکہ گائے بھینس کے مقابلے میں پالنا زیادہ آسان ہے اس لئے گائے اکثر پالی جاتی ہے۔ گائے جب بچہ دیتی ہے تب اس کے دودھ سے پنیر تیار کی جاتی ہے اور پھر اس کو ہمسائے گھروں اور رشتہ داروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور پنیر والے برتن کو واپس کرتے وقت لوگ اس میں پنیر کے بدلے پیسہ، چینی، نمک اور انڈے وغیرہ ڈال کر دیتے ہیں جو یہاں کی ایک قدیم رسم ہے۔

بیل:۔ بیل کو حل چلانے کے لئے پالا جاتا تھا۔ اور پھر اس کے بعد مئی کے آخر میں جب کھیتی باڑی اور فصل وغیرہ بونے کا کام ختم ہو جاتا تھا تو اسے کئی مہینوں کے لئے چراگاہوں میں چرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ جس کے ساتھ خاص گوجر پیشہ جڑ تھا جو ان کو چرنے لے جاتے تھے۔ مگر اب اس کی جگہ دوسرے ذرائع ٹریکٹر وغیرہ آئے ہیں جس نے ان کی جگہ لے لی ہے اور اس وجہ سے یہاں بیل کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ اب تو بیل کو گوشت اور نسل کشی کے لئے ہی پالا جاتا ہے۔ آج سے یہی بیس سال پہلے بیل کو ہر گھر میں عزت واحترام سے پالا جاتا تھا۔ لوگ اس کی قسمیں کھاتے تھے اور

اپنی بات کو یقین میں بدل دیتے تھے۔کسی بھی گھر میں بیل کے جوڑے کا پایا جانا ایک شان سمجھی جاتی تھی۔جبکہ اکثر چھوٹے زمین داروں کے پاس ایک ہی بیل ہوتا تھا اور وہ اپنی ہی برادری میں کسی دوسرے گھر کے بیل کے ساتھ جوڑا بنا کر کھیتی باڑی کرتے تھے۔

گھوڑا:۔ کشمیر میں گھوڑا سواری مشہور ہے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی اس میں برابر کا حصّہ لیتی تھیں۔گھوڑا آمد و رفت کے لئے بے حد مفید مانا جاتا تھا۔لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے آنے کے لئے گھوڑا سواری عام تھی یہاں تک کہ شادی وغیرہ جیسی تقریبوں میں بھی گھوڑا سواری عمل میں لائی جاتی تھی۔جس کو ''ٹانگہ'' کہتے ہیں اس کا رواج کشمیر میں برسوں سے چلا آرہا تھا اور کم وبیش آج بھی کہیں کہیں پر برقرار ہے۔لوگوں کے سواری کے علاوہ ساز وسامان بھی گھوڑا سواری سے ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا تھا۔اسے کشمیری زبان میں ''ریڈا'' کہا جاتا ہے۔ گھوڑے کی خرید وفروخت کا کاروبار بھی بڑے پیمانے پر ہوتا تھا مگر اب چند سال سے اسے بھی غیر ضروری تصور کیا جاتا ہے۔کیونکہ سائنسی ایجادات نے گھوڑے کی جگہ دوسرے ایجادات کھڑے کئے جو کم وقت اور بڑی تعداد میں اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ایک زمانے میں گھوڑے کی قیمت تیس ہزار سے لیکر چالیس ہزار تک جاتی تھی اب وہی گھوڑے پانچ ،آٹھ ہزار میں آرام سے دستیاب ہوتے ہیں۔لیکن صحت افزا مقامات گلمرگ، کھیلن مرگ، سون مرگ اور پہلگام وغیرہ پر آج بھی گھوڑا سواری کے ساتھ ایک پیشہ وارانہ طبقہ جڑا ہے جو سیاحوں کو گھوڑوں پر بیٹھا کر ان مقامات کی سیر کراتے ہیں۔

بکری اور بھیڑ:۔ کشمیر میں بکری شوقین لوگ زیادہ پالتے ہیں۔اس کی کئی قسمیں مختلف رنگوں کی یہاں پائی جاتی ہے۔اس کا دودھ میٹھا اور موٹا ہوتا ہے۔ یہاں ایک بکری کی قسم ہندو کہلاتی ہے۔اس بکری کا دم نہیں ہوتا ہے۔کچھ بکری ایک ساتھ تین یا چار بچوں کو جنم دیتی ہے۔بکریوں کے ساتھ ساتھ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ بھیڑ بھی پالتے ہیں۔یہ بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔کچھ دیسی اور کچھ جرسی وغیرہ کہلاتے ہیں۔چونکہ کشمیری لوگ گوشت کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔اس لئے ان کی خرید

وفروخت بھی بڑے پیمانے پر ہوتی ہے اوران بھیڑ اور بکری کے گوشت کو گائے اور بیل وغیرہ کے مقابلے میں زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔اور بھیڑوں سے کافی تعداد میں اون حاصل کیا جاتا ہے۔جس سے گرم کپڑے تیار کئے جاتے ہیں۔

پالتو پرندے:۔ پالتو پرندوں میں مرغے، ہنس اور بطخ وغیرہ آتے ہیں۔مرغے اکثر لوگ پالتے ہیں جوشکل صورت اور رنگ روپ میں مختلف ہوتے ہیں۔ان مرغیوں کے ساتھ ایک بڑا مرغا بانگ دینے کے لئے پالا جاتا تھا۔مگراب ترقی یافتہ دور میں ان کی ضرورت بھی دھیرے دھیرے ختم ہوتی جارہی ہے اورالارام دینے کے لئے گھڑیاں اور موبائل وغیرہ آ گئے ہیں۔ہنس دو رنگ کے یہاں سفید اور بھورے ہوتے ہیں۔ہانجی لوگ ہنس زیادہ پالتے ہیں۔کیونکہ یہ لوگ دریا کے آس پاس ہی آباد ہوتے ہیں۔نر ہنس بہت ہی خطرناک ہوتا ہے جو کبھی کبھی کاٹتا بھی ہے۔بطخ مختلف رنگوں اور مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔کچھ بطخ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک ساتھ دو انڈے دیتے ہیں۔ان کا گوشت بہت ہی گرم اور لذیز ہوتا ہے۔ان کو کھانے کا موسم ''ہرد''یعنی اکتوبر سے جنوری تک ہوتا ہے کیونکہ اس وقت یہ ہر اعتبار سے پک گئے ہوتے ہیں۔اور یہی موسم ان کو کھانے کے لئے بہتر سمجھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ کبوتر، چکور اور طوطا وغیرہ بھی پالے جاتے ہیں۔

کستورا:۔ یہ ایک اعلیٰ قسم کا جانور ہوتا ہے۔جو سنہرے اور بھورے رنگ کے ہوتے ہیں۔اس کے جسم پر کالے دھبے ہوتے ہیں۔اس کی پوست موٹی اور بال کُھردرے ہوتے ہیں۔کان بڑے اور گول ہوتے ہیں۔کستور کے نر کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کا ایک اعضاء ایسا ہوتا ہے جس میں بے پناہ خوشبو پنہاں ہوتی ہے۔اس کی خوشبو دور دور تک پھیل جاتی ہے۔

مارخور:۔ اس کے ٹھوڑی پر لمبی داڑھی ہوتی ہے اور دو لمبے مضبوط سینگ ہوتے ہیں۔یہ صرف صبح اور شام کو ہی چرنے نکلتے ہیں۔جہاں اچھی گھاس اور وافر مقدار میں پانی ہو۔طلوع آفتاب ہونے کے ساتھ ہی یہ دور چٹانوں اور دشوار گزار پناہ گاہوں کی طرف ہجرت کرتے ہیں اور اپنی

مخصوص پناہ گاہوں میں سوجاتے ہیں۔ جہاں یہ سب سوجاتے ہیں وہاں پہاڑی ڈھلوان پر ایک مارحوار چوکیدار کے فرائض انجام دیتا ہے اور اگر خطرہ درپیش آئے تو وہ فوراً اپنے تمام ساتھیوں کو بیدار کر دیتا ہے۔

چیتا:۔ یہ جانور زیادہ تر پہلگام اور نیشنل پارک داچھی گام میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سنگلاخ پہاڑوں کی غاروں میں رہنا پسند کرتا ہے۔ یہ جنگلی جانوروں کا شکار کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے۔ سردی کے موسم میں جب کافی برف گر جاتی ہے تو تمام جانور اپنی پناہ گاہوں میں چھپ جاتے ہیں اس وقت یہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے ویران اور سنسان گاؤں میں حملہ کر کے مویشیوں کا شکار کرتا ہے اور کئی دنوں تک شکار کو غار میں چھپا کر کھاتا ہے۔

ریچھ:۔ ریچھ اُجلے سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اس کے بال کھردرے ہوتے ہیں۔ اور اس کا وزن اکثر دو کوئٹل تک تجاوز ہوتا ہے۔ یہ غاروں یا پرانے درختوں کے تنے کی کھوکھلی جگہوں میں رہتا ہے۔ یہ نہایت ہی خطرناک جانور ہوتا ہے۔ زخمی حالت میں یہ اور بھی خونخوار بن جاتا ہے۔ یہ جس علاقے میں پایا جاتا ہے وہاں کی فصل برباد کر دیتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں گاؤں کی طرف رخ کر کے جان و مال کا بہت نقصان کر دیتا ہے۔ ریچھ کی یہاں دو قسمیں پائی جاتی ہے یعنی سیاہ ریچھ کے علاوہ دوسرا سرخ رنگ کا ہوتا ہے جو کشمیر میں ''کنہ ہاپت'' کہلاتا ہے۔ لیکن سیاہ ریچھ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

ان جانوروں کے علاوہ اور بھی کئی موذی جانور یہاں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً شیر، سیاہ گوش، بھیڑیا، جنگلی سُور اور بندر وغیرہ پرندوں میں چڑیا، کوا، بلبل، گرسل، برفیلی چڑیا (شینہ پی پی) کوئل، پوشنول، چمگادڑ، اُلو، گل، جنگلی مرغی (ون کوکر) گدھ، گنجی مرغابی (کولر) آبی مرغابی (ٹیچ) اور غوطہ خور پرندہ (پند) وغیرہ شامل ہے۔

مچھلی:۔ مچھلی کشمیریوں کی پسندیدہ غذا میں سے ایک ہے۔ اسے کشمیری میں ''گاڈ'' کہتے ہیں۔ کشتی رانوں کی آبادی کا انحصار ان ہی پر ہے۔ یہاں ذاتی طور پر بھی کئی لوگوں نے ''فیش

بانڈ'' بنائے ہیں۔ کشمیر میں پانی کی بھی کمی نہیں ہے اس لئے آسانی سے انھیں پالا جاسکتا ہے۔ جھیلوں، دریاؤں، ندی نالوں اور چشموں میں بھی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جنھیں پکڑنے کے لئے جال، کانٹے، ٹوکری اور پنزری کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مچھلیوں کی یہاں کئی قسمیں پائی جاتی ہے جن میں کچھ کا وزن ۵۷ پونڈ تک بڑھ جاتا ہے۔ ولٹر روبرٹ لارنس نے کتاب ''کشمیر کی وادی'' میں ان کے کئی نام گنائے ہیں۔ جن میں چری گاڈ، ستر گاڈ، کروٹ گاڈ، پکور گاڈ، چاش گاڈ، برج، رمہ گارڈ، نیور گاڈ، ٹیٹ گارڈ، دراس اور ایت گارڈ شامل ہے۔

کھیل:۔ دوسرے شعبوں کی طرح ہر ملک کھیل کود کے اعتبار سے بھی اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔ کھیل کود ہی وقت گزاری اور تندرست رہنے میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر ملک یا ریاست میں اپنے اپنے ماحول، فضا اور سماجی حالات کے مطابق مختلف کھیل رائج رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ارتقائی منزلیں طے کرتے جاچکے ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں کھیل کود میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے اور نئے نئے کھیل وجود پا رہے ہیں۔ پرانے کچھ کھیل تو ارتقاء پذیر ہوتے جارہے ہیں اور کچھ کھیل بالکل متروک ہوجاتے ہیں جن کی اہمیت و افادیت ہمیشہ تاریخ کے اوراق میں برقرار رہتی ہے۔ کھیل کود کے اعتبار سے کشمیر بھی ایک اہم درجہ رکھتا ہے۔ یہاں بھی مختلف کھیلوں کا رواج رہا ہے جو درج ذیل ہیں۔

گلی ڈنڈا:۔ اس کو کشمیری زبان میں ''لٹھی کجہ لوٹھ'' کہا جاتا ہے۔ اس کو عام طور سے دو ہی آدمی کھلتے ہیں۔ اس کھیل میں ایک بڑا ڈنڈا ''لوٹھ'' ایک چھوٹا ڈنڈا ''لٹھی کجہ'' کہلاتا ہے۔ پہلے ایک چھوٹا سا گڑھا کھودا جاتا ہے۔ جہاں ''لوٹھ'' سے ''لٹھی کجہ'' کو دور پھینکا جاتا ہے اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ جب کھیل شروع کیا جاتا ہے تو ایک طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور اس کے بعد پھر کئی بار دوسرا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ غرض ہر بار کھیلاڑی ''لٹھی کجہ'' کو ''لوٹھ'' سے دور پھینکنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر ''لوٹھ'' کو گڑے کے اُوپر رکھ دیتا ہے۔ دوسرا کھیلاڑی وہاں سے ''لٹھی کجہ'' کو واپس

پھینکتا ہے اور اس کا نشانہ یہی ''لوٹھ'' ہوتا ہے اگر اسے ذرا بھی ''لٹھی کجہ'' چھو گیا تو بازی وہی جیت جاتا ہے اور پھر وہ کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔اس کے علاوہ اس کو کھیلنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔دو یا دو سے زیادہ کھیلاڑی گروہوں کی صورت میں بھی کھیلتے ہیں۔

ژپل ژاجن (چھپا چھپی):۔ یہ کھیل آنکھ مچولی سے مطابقت رکھتا ہے۔ جسے عموماً چھوٹے بچے کھیلتے ہیں۔کسی ایک گروپ کے بچوں کو خاص کسی جگہ پر دیوار یا پیڑ کے ساتھ چہرہ اس طرح ڈھکنا ہوتا ہے کہ اُنھیں کچھ دیکھائی نہ دے اُس جگہ کو کشمیری زبان میں ''مانتھ'' کہا جاتا ہے۔ ان بچوں کو تب تک اُسی جگہ پر چہرہ ڈھکے رہنا پڑتا ہے جب تک اس کہ دوسرے گروپ کے کھلاڑی آس پاس کہیں چھپ نہ جائے۔ پھر ان میں سے ایک بچہ ''ای کو'' کہہ کر آواز دیتا ہے اور وہ ''مانتھ'' سے ہٹ کر اُدھر اِدھر ان کو ڈھونڈنا شروع کرتے ہیں۔اس دوران انھیں ''مانتھ'' کی طرف بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کیونکہ چھپے بچوں میں ان کی غیر موجودگی میں ''مانتھ'' کے پاس آکر کوئی تھوکنے کی آواز کر کے بازی مار لیتا ہے۔ یہاں پر ضروری ہوتا ہے کہ ''مانتھ'' تک پہنچنے سے پہلے اُس بچے کی نظر اُس پر پڑنی چاہئے جو وہاں پر چہرہ ڈھکے بیٹھے تھے۔اس طرح اگر کوئی کامیاب ہوا تو پھر سے بازی اُن ہی کی ہوتی ہے۔اگر کوئی نہیں ''مانتھ'' تک پہنچ سکا تو پھر انھیں چہرہ ڈھکنا ہوتا ہے۔اسی طرح اس کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

رکنہ (پھسلن):۔ یہ ایک پرانا کھیل ہے جب ندی نالوں میں بچے نہاتے تھے اور کسی اُونچی ڈھلوان جگہ کو مٹی مل کر بہت چکنا بناتے ہیں جو جگہ ندی نالے کے کنارے پر واقع ہوتی ہے پھر ٹانگیں آگے کی طرف سیدھی رکھ کر پھسل جاتے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس طرح پھسل کر اپنی بہادری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ ڈھلوان جگہ بیس سے تیس فٹ لمبی ہوتی ہے۔

وٹہ:۔کشمیری زبان میں چھلانگوں کو ''وٹہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کھیل کی ایک صورت ہے۔اس کھیل میں عموماً چار کھلاڑی حصہ لیتے ہیں۔ دو کھلاڑی بیٹھ کر کئی طرح کی صورتیں اختیار کرتے ہیں جن کے اُوپر سے مخالف والے گروپ کو چھلانگیں لگانی پڑتی ہے۔ یہ صورتیں یوں ہے۔

(۱) تلوے ملا کران کے اوپر چھلانگ لگانا۔ (۲) پیروں کی انگلیوں کے اوپر ہاتھوں کی مٹھی بھاندنا۔ (۳) ایک مٹھی کے اوپر دوسری مٹھی بھاندنا۔ (۴) پیروں کی انگلیوں کے اُوپر ایک ہاتھ پھیلا کر رکھنا۔ (۵) ایک ہاتھ کے اوپر دوسرا ہاتھ پھیلا کر رکھنا۔ (۶) ایک کھلاڑی ہاتھ شیشے کی طرح اوپر کرتا ہے اور دوسرا اسے پکڑتا ہے۔ (۷) سروں کو ملانا۔ (۸) دونوں کھلاڑیوں کے کمر ملانا۔ اس طرح ان آٹھ صورتوں کے اوپر چھلانگ مارنے میں اگر کامیاب ہوئے تو بازی جیت گئے۔ ورنا دوسرے گروپ کو موقعہ دیا جاتا ہے۔

ٹیچن گینڈن:۔ یہ کھیل کنکروں سے کھلا جاتا ہے۔ اس کھیل کو زیادہ تر لڑکیاں کھیلنا پسند کرتی ہیں۔ اس کے کھیلنے کے بھی کئی طریقے ہیں۔ اس میں پانچ یا تین چھوٹے چھوٹے پتھروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر پانچ پتھروں سے کھیلا جاتا ہے۔ پانچوں پتھروں کو نیچے پھینک کر ایک اٹھایا جاتا ہے جس کو اُوپر کی طرف پھینکا جاتا ہے اور جب تک وہ اُوپر رہے تب تک نیچے سے ایک پتھر اٹھانا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک ایک کر کے چاروں پتھر اُٹھائے جاتے ہیں۔ پھر دو دو پتھر اُٹھائے جاتے ہیں اس کے بعد تین اور ایک۔ پھر ایک اُوپر پھینک کر چاروں ایک ساتھ اُٹھانے ہوتے ہیں۔ پھر پانچوں پتھروں کو اُوپر پھینک کر اُلٹے ہاتھ پر پکڑنا۔ اس کی پہلے سے شرط رکھی جاتی ہے کہ پانچ میں سے اُلٹے ہاتھ پر کتنی پکڑنی ضروری ہے۔ آخر میں بائیں ہاتھ کو دائرے کی صورت میں رکھنا ہوتا ہے اور اس کے آگے پانچوں پتھروں کو پھینک کر مخالف والا گروپ کسی ایک پتھر کو آخر میں اس دائرے میں نکالنے کو کہتے ہیں۔ چاہیئے وہ دائرے والے ہاتھ کے قریب ہی کیوں نہ ہو اس طرح ایک پتھر اُوپر پھینک کر چاروں پتھروں کو ایک ایک کر کے دائرے میں سے نکالنا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک باری کا اختتام ہوتا ہے اور پھر سے ابتداء سے دوسری بازی شروع کی جاتی ہے۔

تلے لونگن:۔ یہ بھی لڑکیوں کا ایک کھیل ہے جس میں دو لڑکیاں کھڑی ہو کر اپنی پیٹھ ملاتی ہیں اور پھر پیچھے کی طرف ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈال کر جھک کر ایک دوسرے کو اپنی پیٹھ پر اُٹھاتی ہیں۔ یہ عمل اُسی طرح جاری رہتا ہے اور آہستہ آہستہ اس عمل کی رفتار میں تیزی آجاتی ہے اور

دونوں کا الگ الگ وجود مشکل سے ہی نظر آتا ہے۔اس کھیل کے دوران وہ ''تلے لوگن تلان چھیس'' گاتی رہتی ہیں۔

سزلونگ:۔ یہ چھوٹے بچوں کا کھیل ہے جس میں زمین پر کھود کر لکیریں کھینچی جاتی ہے۔ اس طرح سات خانے تیار کیئے جاتے ہیں۔ چھ برابر ایک دوسرے کے مدمقابل اور ایک آخر میں درمیاں میں ایک اور خانہ بنایا جاتا ہے۔ ہر ایک خانہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ جس میں ایک آدمی آرام سے کھڑا رہ سکے۔ پھر چپل یا لکڑی کا چھوٹا سا ٹکڑا ''سز'' لایا جاتا ہے۔ جس پر ایک طرف تھوکا جاتا ہے اور اس طرح تاس کیا جاتا ہے۔ ایک گروپ دوسرے گروپ سے پوچھتا ہے کہ آپ کو پانی چاہئے یا دھوپ۔ پانی جس طرف تھوکا ہوا ہوتا ہے اور دھوپ بغیر تھوکے والا سائیڈ ہوتا ہے۔ پھر جو تاس جیتتا ہے۔ وہ کھیلنا شروع کرتا ہے اور ایک ایک کر کے سبھی خانوں میں سے ''سز'' ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر نکالنا ہوتا ہے۔ پھر دوسرے خانہ سے نکالنا شروع کیا جاتا ہے پھر تیسرے، پھر چوتھے، پھر پانچوں اور پھر چھٹے خانے سے نکالنا ہوتا ہے، اس طرح چھ راونڑ پورے کئے جاتے ہیں۔ پھر آخر میں ساتویں خانے میں ''سز'' پھینکا جاتا ہے اور پھر وہاں سے سر کے اوپر سے پیچھے کی طرف ''سز'' پھینکا جاتا ہے اگر سر کے پیچھے کسی ایک خانے میں گیا تو وہ خانہ جیتا جاتا ہے اور اس پر صرف اُسی گروپ کا حق ہوتا ہے وہ اس میں دم بھی لے سکتا ہے۔ دوسرے گروپ کو اس خانے کی ایک ٹانگ پر چھلانگ لگانی پڑتی ہے۔ ورنا کبھی کبھی تھوڑی سی جگہ بھی دوسرے گروپ کی طرف سے دی جاتی ہے جہاں وہ صرف ایک پیر پر کھڑا رکھ سکے۔اس کے علاوہ اس کھیل کے دوسرے طریقے بھی ہیں۔دیگر کھیلوں میں تیرنا، دوڑ، شینہ جنگ (برف کے تودوں سے کھیلا جاتا ہے) کبڈی، رسہ کشی، پتنگ بازی اور غوطہ زنی وغیرہ شامل ہے۔ان تمام کھیلوں میں کچھ کھیلوں کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوچکی ہے۔آج جن کھیلوں کا یہاں زیادہ رواج ہیں۔ان میں سے بیشتر بین الاقوامی سطح پر کھیلی جاتی ہے۔مثلاً فٹ بال، کرکٹ، ہاکی، دوڑ، بیڈمنٹن، والی بال اور شطرنج وغیرہ۔

گاؤں:۔ کشمیر کے بیشتر حصّے میں گاؤں آباد ہیں۔ جن میں کچھ گاؤں پہاڑوں پر اور کچھ میدانی علاقوں میں آباد ہیں۔ گاؤں میں ہر ایک کے پاس رہنے کے لیے ایک مکان ہے۔ مکانوں کے سامنے بڑے بڑے صحن ہوتے ہیں۔ ان صحنوں میں اعلیٰ قسم کی گھاس اور مختلف قسم کے پھول اُگائے جاتے ہیں۔ ہر گاؤں والے کے پاس سبزیاں اُگانے کے لئے ایک باغیچہ ہوتا ہے۔ گاؤں میں شہر کی طرح مکانوں کی بھر مار نہیں ہوتی ہے۔ مکان کے آس پاس کافی کھلی جگہ ہوتی ہے۔ گاؤں والے اکثر مکان کے ارد گرد صحن کو پتھروں ،اینٹوں یا بانسوں سے باندھ دیتے ہیں۔ گاؤں والے آپس میں ملنسار ہوتے ہیں۔ ندیاں، نالے اور چشمے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جن کا پانی لوگ استعمال میں لاتے ہیں۔ گاؤں کے ارد گرد ہرے بھرے سیب، دال، گیہوں، دھان اور زعفران وغیرہ کے کھیت ہوتے ہیں۔ گاؤں کی بستیاں اُونچے اُونچے درختوں کے درمیان آباد ہے۔ لارنس کشمیری گاؤں کے حسن کو یوں سراہاتے ہیں:

> ''کشمیر کا گاؤں بے حد خوبصورتی کا حامل ہے۔ اخروٹ، سیب اور خوبانی کے درختوں کی چھاؤں ، صاف شفاف چمکدار گھاس سے بھرے کناروں پر بید کی مونگیاں، سرخ جڑوں کے ارد گرد چاول کے پودوں کا گھیرا یا نرگس کے سیاہ خوبصورت کھیت یا سیاہ پتوں والے دھان کی دوسری قسمیں ان تمام کو ملا کر کشمیری گاؤں بے حد قدرتی حسن اور کشش کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دھان کی لہلہاتی بالیاں ایک پٹری کی مانند دکھائی دیتی ہیں جن کا رنگ بادامی سے تانبے کا ہوجاتا ہے۔''۳۵

گاؤں میں سیب اور اخروٹ کے باغات کی بھر مار ہوتی ہے۔ جس کی کاشت یہاں بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ ان کی حفاظت کسان ہر اعتبار سے جفا کشی اور محنت کر کے خود کرتے ہیں۔ اس میں سرکار کی طرف سے کوئی تحفظ نہیں ہے۔ جبکہ آج تکنیکی اور طبی اعتبار سے بھی کئی سہولیات میسر

ہے۔گاؤں والوں کا پیشہ زیادہ تر مزدوری پر مشتمل ہے۔گاؤں میں پانی بہت زیادہ میسر ہے لیکن پھر بھی لوگوں کے پاس ایسی کوئی سہولت نہیں ہے کہ انہیں پانی صحیح انداز میں دستیاب ہو۔بجلی کی سپلائی اتنی مضبوط ہے کہ ذرا سا ہوا، بارش یا برف باری ہونے سے کئی ہفتوں تک بجلی غائب ہوجاتی ہے۔ کشمیر میں ہی بجلی پیدا کی جاتی ہے مگر وہاں کی عوام اس سے محروم ہے۔کیونکہ اسے دوسری ریاستوں میں بھیجا جاتا ہے۔بڑے بڑے گاؤں میں چھوٹی چھوٹی کچی سڑکیں اکثر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ٹرانسپورٹ میں چھوٹی چھوٹی ذاتی بسیں ہیں جو کچھوے کی رفتار سے چلتی ہے۔منٹو کا سفر گھنٹوں میں طے کراتی ہے۔دوسری طرح کی سہولیات کا تو تصور ہی نہیں ہے۔

شہر کے بارے میں اتنا کہوں گا کہ سرینگر پہاڑوں کے درمیان بہت ہی خوبصورت شہر آباد ہے جس کے وسط میں بل کھاتی جھیل ڈل اور دریا جہلم کا گزر ہیں۔کشمیر کے شہروں،قصبوں اور گاؤں میں زیادہ فرق نہیں پایا جاتا ہے تاہم شہر کی خوصیات تو پھر بھی الگ ہوتی ہیں۔لیکن شہر سرینگر میں دوسری ریاستوں کے شہروں کے مقابلے میں ساری سہولیات دستیاب نہیں ہیں۔مثلاً ٹرنسپورٹ ،سڑکیں، بجلی،انڈسٹریز، فلکٹریز اور روزگار وغیرہ کی سہولیات نا کے برابر ہے۔

رسومات:۔کشمیر کے سرسبز پہاڑوں ،عمدہ چراگاہوں ،سربہ فلک درختوں،لہلہاتے کھیتوں ،ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشموں ،رسیلے پھلوں ،رنگ برنگے پھولوں،شور مچاتے ندی نالوں، خوش گوار آب وہوا، خاموش جھیلوں اوراعلیٰ فن تعمیری کے نمونوں کی طرح یہاں کے رسم ورواج بھی امتیازی خصوصیت کے حامل ہے۔ جو تہذیب و ثقافت کے اٹوٹ حصّہ ہوتے ہیں۔ بقول ایم۔ ایس۔ناز:

> ”کشمیر کا خطۂ مینوسواد ہر رنگ میں لاثانی اور نادر ہے۔انفرادیت ندرت اور لطف وکیف کا یہ عالم ہے کہ اہل کشمیر علامہ اقبال کے الفاظ میں چرب دست بھی ہیں، اور تر دماغ بھی، ہرکار اور ذہین وفطین کشمیریوں کے آداب ورسوم شستہ اور من موہنے ہیں۔ان کی وضع قطع میں حسن وزیبائی

ہے۔شعر و ادب میں بھی وہ انوکھے اور سربلند ہیں۔تہذیب و ثقافت
میں شاید ہی کوئی دوسری قوم اس قدر متنوع کوائف کی حامل ہو‘‘۳۶؎

بچہ پیدا ہونے کی رسمیں:۔عورت جب حاملہ ہو جاتی ہے تو گھر میں خوشی کی لہر اُٹھتی ہے۔ گھر والے اسے کھانے پینے، کام کاج کرنے اور کہیں آنے جانے سے منع کرتے ہیں ساتھ ہی طرح طرح کے دیگر مشورے دیتے رہتے ہیں۔گھر سے باہر زیادہ پھرنے سے اعتراض کرتے ہیں۔رات کے وقت اگر گھر سے باہر جانے کی ضرورت پڑی تو اس کے ہاتھ میں چاقو تھما دیتے ہیں تا کہ کوئی بھوت کا سایہ نہ پڑے جائے۔اس کے کھانے پینے کی طرف خاص دھیان دیا جاتا ہے۔یہ سلسلہ اسی طرح نو مہینے تک چلتا ہیں۔جب بچہ پیدا ہونے کا وقت نزدیک آتا ہے تو میکے والے اسے دھوم دھام کے ساتھ میکے لے جاتے ہیں۔سسرال کے کئی افراد اس کے ساتھ جاتے ہیں۔اس دن میکے والے ان کے لئے خاص طور سے وازہ وان کا اہتمام کرتے ہیں۔نو مہینے پورے ہونے کے بعد جب حاملہ عورت کو دردزہ شروع ہوتا ہے تو دائی کو بلایا جاتا ہے اور پاس پڑوس کی عورتیں آکر درد سے آزاد ہونے کی دعائیں مانگتی ہیں۔یہ تو خیر آج کے ترقی یافتہ دور سے قبل کی بات ہے۔موجودہ دور میں تو بچہ اسپتال کی مہک سونگے بغیر جنم لیتا ہی نہیں ہے۔جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو سب سے پہلے اسے نہلاتے ہیں پھر بچے کے کانوں میں اذان دی جاتی ہے۔تب تک بچے کو دودھ نہیں پلایا جاتا ہے جب تک نہ اس کے کان میں اذان دی جائے۔دائی کو انعام و اکرام سے نوازہ جاتا ہے۔اگر لڑکا پیدا ہوتا ہے تو کچھ زیادہ ہی خوشی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔جبکہ لڑکی پیدا ہونے پر ایک طرح کا ملال ظاہر ہو جاتا ہے اور بزرگ عورتیں شکر ادا کر کے مبارک باد دیتی ہیں اور یہ کہہ کر تسلی دیتی ہے کہ جان بچ گئی لڑکا بھی خدا دے گا۔پھر عورت کو گھاس پھوس کے بستر پر سلایا جاتا تھا۔جبکہ آج اس کی جگہ پلنگ کا استعمال کیا جاتا ہے۔عورت کے سرہانے کوئی لوہے کا ہتھیار چاقو یا چھری وغیرہ رکھا جاتا ہے۔تا کہ کہیں بھوت کا سایہ اس پر اثر انداز نہ ہو۔چالیس دن تک عورت اسی جگہ دن رات آرام سے رہتی ہے۔اس درمیان تین دفعہ اسے نہلایا جاتا ہے۔پندرواں، مہینہ اور چالیسواں کے نام سے

ان کو پکارا جاتا ہے۔نہانے والے پانی میں مختلف قسم کی جڑ بیوٹیاں ڈال کر اسے خوب ابالا جاتا ہے۔ چالیس دن کے بعد ایک رسم ''مس نیتھر'' ادا کی جاتی تھی جواب ختم ہوگئی ہے۔اس دن راجماش اور مکئی کو ملا کر ایک طرح کی کھچڑی تیار کی جاتی تھی اور آس پاس کے ہمسایوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔

زافل:۔ بچہ جس گھر میں پیدا ہوجاتا ہے جو اکثر میکے میں ہی ہوتا ہے۔ میکے والے اپنی طرف سے لڑکی کے سسرال والوں کو زافل بھیجتے ہیں۔ جیسے ایک یا دو قسم کی روٹیاں، مٹھائی، سوکھا پھل وغیرہ۔جس کو سسرال والے رشتہ داروں اور ہمسایوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

مبارک باد:۔ سسرال والے تحفے ،مٹھائی لے کر لڑکی کے پاس مبارک باد دینے جاتے ہیں۔خوشی کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے۔مبارک باد دے کر مٹھائیں بانٹ دی جاتی ہے۔ بچے کو گود میں لے کر سب لوگ اسے روپے دیتے ہیں۔ بچہ ہونے کے بعد تمام رشتہ دار بھی تحفے کے ساتھ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔جس میں زیادہ تر عورتوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔مبارکباد کا یہ سلسلہ کئی مہینوں تک چلتا رہتا ہے۔

پاؤ:۔ پاؤ سسرال والے لڑکی کے لئے لاتے ہیں۔جس میں کھانے پینے اور بچے کے لیے پہننے دھونے کا سارا سامان ہوتا ہے۔مثلاً مختلف قسم کی روٹیاں، سکھا پھل، مرغے، انڈے، گھی، مکھن، چینی، تیل، کپڑا، زر زیور، روپے پیسہ وغیرہ۔اس دن میکے والے'واز ہ وان'' کا اہتمام کرتے ہیں اوراس طرح پاؤ کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

عقیقہ:۔ اسے کشمیری میں ''سندر'' کہتے ہیں جو رسم نہیں بلکہ ایک شرعی حکم ہے، یہ بچے کی طرف سے ایک طرح کا صدقہ دیا جاتا ہے۔اس تعلق سے یہاں یہ عقیدہ ہے کہ اس رسم کو ادا کرنے کے بعد بچہ بھوکا نہیں بن جاتا ہے۔اس دن بکرے ذبح کر کے واز ہ وان تیار کیا جاتا ہے اور رشتہ داروں اور ہمسایوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔اس تعلق سے سید احمد دہلوی لکھتے ہیں:

''بیٹے کے دو بکرے اور بیٹی کی ایک بکری ہوتی ہے۔ یہ رسم نہیں بلکہ

ایک شرعی حکم ہے، جسے بچے کا صدقہ کہنا چاہئے۔عقیقے کا گوشت ماں، باپ، نانا، نانی، دادا، دادی نہیں کھاتے، اورلوگ کھا سکتے ہیں۔'' ۳۷ے

کشمیر کے لوگ اسے شرعی حکم مان کر ادا کرتے ہیں۔لیکن اس کا گوشت کھانے سے تقریباً کوئی بھی گریز نہیں کرتا ہے۔وہ بھی جب واز ہ وان کی صورت میں ادا کیا جائے۔پھر چار یا چھ مہینے گزرنے کے بعد لڑکی کو سسرال جانا ہوتا ہے۔اس کو بھی ایک رسم کے طور پر نبھایا جاتا ہے۔باپ لڑکی کو سینکڑوں کی تعداد میں روٹیاں دیتا ہے۔جو سسرال والوں کو رشتہ داروں اور ہمسایوں میں تقسیم کرنی ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ زیور، کپڑے اور دوسری طرح کا سامان بھی دیا جاتا ہے۔اس دن لڑکی کے ساتھ کئی افراد ساتھ جاتے ہیں۔

منڈن:۔کشمیر میں بہت سارے خانقاہیں اور زیارت گاہیں ہیں جن کو بے حد مقدس مانا جاتا ہے۔پہلی بار بچے کا منڈن کسی ایسی ہی مقدس جگہ کیا جاتا ہے۔اس رسم میں خوشی کا اظہار ہوتا ہے اور بچے کی سلامتی کا عقیدہ بھی موجود ہوتا ہے۔ان بالوں کو کشمیری میں ''زر'' کہا جاتا ہے۔یہ بھی پہلے سے ہی طے شدہ ہوتا ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کا منڈن فلاں جگہ کیا جائے گا، یا بچے کا جنم ہونے کے بعد بھی یہ طے کیا جاتا ہے۔اس دن رشتہ داروں اور ہمسایوں کو دعوت دی جاتی ہے۔اور پھر منڈن کے لئے روانہ ہوجاتے ہیں۔وہاں کھانے پینے اور گھومنے پھرنے سے فارغ ہوکر بچے کے بال منڈانے شروع کئے جاتے ہیں۔پھر نائی کو سب لوگ بخشیش دیتے ہیں۔اس وقت عورتیں ''ون وون'' کا اہتمام بھی کرتی ہے۔جس کے چند گیت ملاحظہ ہو:

بسم اللہ کرِتھ زر کاسہ یو	اللہ کا نام لیکر منڈن شروع کرے گے
اسمِ اعظم پر ایو	آپ کے نام کا اسم اعظم پڑھیں گے
زر کاسہ ہایو بال تھز رے	آپ کا منڈن پہاڑوں کے اونچائی پر کرے گے
دستگیر صاۓ بن نظرے	پیر دستگیر (شاہ جیلان) کی نظر عنایت بھی شامل ہے
زر کاسہ ہایو یِنو گل نٹہ نے	منڈن کے وقت آپ کے ہاتھ نہ کانپ جائیں

پیر ہور ٹنۓ اتھ نے کیتھ　　　پیر دستگیر آپ کو ہاتھوں میں لیں گے

ختنہ:۔یہ بھی ایک اہم شرعی حکم ہے۔ جو ہر مسلمان پر واجب ہے اور ہر ایک مسلمان اس شرعی حکم کو نبھاتا ہے۔اس موقعہ پر چند رسموں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ابتداء میں اس رسم کو نائی انجام دیتا تھا۔اب آج کے ترقی یافتہ دور میں یہ کام بھی ڈاکٹروں کو سونپا گیا ہے۔اس رسم کو بھی دھوم دھام سے نبھایا جاتا ہے۔''وازہ وان'' اور ''ون وون (گیت)'' کا اہتمام کیا جاتا ہے گیت ملاحظہ ہو:

پچہ تل کوکر طۓ اَتھس کیتھ واجی　　ٹوکری کے نیچے مرغا اور ہاتھ میں انگوٹھی

ختن نأ جی مبارک　　آپ کو ختنہ مبارک ہو

واستہ چُھ آمتہ دلدلس کھاستہ　　استاد گھوڑے پر سوار ہوکر آیا ہے

بلبلس ختنہ کأ رتھ دراوٗ　　بلبل کو ختنہ کر کے نکل گیا

ختنہ سے فارغ ہوکر بچے کو پلنگ پر بٹھایا جاتا ہے۔ بچے کے اوپر بادام، مٹھائی، سکے وغیرہ پھیک کر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے اور کئی دن تک بچے کو ایک جگہ احتیاط سے رکھا جاتا ہے جب تک اس کا ختنہ ٹھیک ہو جائے۔اس موقع پر بھی عورتیں مبارک باد پیش کرتی ہے اور بچے کے لئے جوس، پھل، مٹھائی، روٹیاں، نقدی وغیرہ لایا کرتی ہیں۔

بات:۔لڑکا ہو خواہ لڑکی جب بلیغ ہو جاتے ہیں تو ان کے تعلق سے شادی بیاہ کی باتیں شروع ہو جاتی ہے اور رشتے آجاتے ہیں۔ چونکہ اکثر و بیشتر رشتہ لڑکے والوں کی طرف سے بھیجا جاتا ہے۔ پھر اس آنے والے رشتے کے تعلق سے معلومات دریافت کرنی شروع ہو جاتی ہے۔ جب سب کچھ معلوم کرنے کے بعد مطمین ہوتے ہیں تو پھر جواب بھیج دیا جاتا ہے۔جب دونوں طرف سے رشتے کے لئے راضی ہو جاتے ہیں تو لڑکے والے چند بزرگ جن میں خاص طور سے لڑکے کے ماموں اور چچا ہوتے ہیں لڑکی کے گھر جاتے ہیں۔لڑکی والے بھی لڑکی کے ماموں اور چچا کو انھیں اقرار دینے کے لئے بلاتے ہیں۔اس طرح رشتے کی بات طے ہو جاتی ہے اور لڑکے والے ایک رسم کو

پوری کرتے ہیں جس کو کشمیری میں ''پیالس ترون'' کہتے ہیں۔یعنی وہاں پر وہ جس پیالے میں چائے پیتے ہیں اُسی میں کچھ روپے ڈال کر اس رسم کی ادائیگی کرتے ہیں اور وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔اس کے بعد اسی طرح لڑکی والے بھی اس رسم کو پورا کرتے ہیں۔

منگنی:۔ بات ہو جانے کے بعد منگنی کی رسم مقرر کی جاتی ہے۔جس میں لڑکے والے لڑکی والوں کے یہاں جاتے ہیں۔اس کے لئے ایک دن مقرر کیا جاتا ہے۔عموماً دس سے پچاس افراد منگنی پر جاتے ہیں۔لیکن لڑکا اور لڑکی شادی تک ایک دوسرے سے ملتے نہیں ہیں اور شادی سے پہلے ایک دوسرے کے یہاں جاتے بھی نہیں ہیں۔لڑکے والوں کی طرف سے جو بھی مہمان ہوتے ہیں ان کا نہایت ادب وخلوص سے استقبال کیا جاتا ہے۔دلہن کو ان کے پاس سج سنور کر بٹھایا جاتا ہے اور اسے یہ تمام مہمان زیور پہناتے اور نقدی دیتے ہیں۔مزید لڑکے والے دلہن کے لئے کپڑے، ساز وسامان، سنگھاردان، ٹوکریوں میں مختلف قسم کی مٹھائیں وغیرہ لاتے ہیں۔اس دن لڑکی والوں نے وازہ وان کا اہتمام کیا ہوتا ہے جس میں سے وہ دلہے کے لئے الگ سے تمام قسم کے پکوان دلہے کے گھر بھیج دیتے ہیں۔کیونکہ لڑکا اس دن اپنے ہی گھر میں رہتا ہے۔اس رسم میں سب سے پہلے ہر مہمان کے سامنے سبند جلائے جاتے ہیں۔تا کہ کوئی بھی برائی ان کی خوشی پر اثر نہ کرے۔پھر مختلف قسم کی ضیافت سکھا پھل، مٹھائی، شربت، قہوہ اور قلچہ پیش کئے جاتے ہیں۔اور کھانے میں وازہ وان پیش کیا جاتا ہے۔آخر میں نمکین چائے کے ساتھ مختلف اعلیٰ قسم کی روٹیاں پیش کی جاتی ہیں۔اس کے بعد تمام مہمان رخصت ہو جاتے ہیں۔یہ رسم ادا ہونے کے بعد لڑکی والے اسی طرح سے لڑکے والوں کے یہاں جاتے ہیں۔اور اس طرح کا ماحول پھر سے پیدا ہو جاتا ہے۔منگنی ہونے کے بعد سمدھنوں کو ایک دوسرے کے یہاں دعوت پر بلایا جاتا ہے پھر اس کے بعد سمدھنوں کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔قدیم زمانے میں اس رسم کو خاص طور سے الگ سے نبھایا جاتا تھا۔لیکن اب اکثر لوگ اس رسم کو بھی منگنی کے ساتھ ہی مکمل کرتے ہیں۔منگنی کے بعد ہر تہوار پر لینے

دینے کی رسمیں جاری ہوجاتی ہیں۔ مثلاً شب برات (روز کن شب) کے موقع پر روٹیاں، مٹھائیاں، تلے مرغے اور حلوہ وغیرہ ایک دوسرے کے یہاں لے جاتے ہیں۔ عیدی کے طور پر زیور اور نقدی دی جاتی ہے۔ موسم سرما کے لئے سردی کا پورا لباس دلہن اور دلہے کے لیے ایک دوسرے کے یہاں لے جاتے ہیں۔

شادی کا دن مقرر کرنا (دھ گنڈنِ):۔ شادی کی تاریخ لڑکی والوں کے یہاں مقرر کی جاتی ہے۔ جس میں تین یا چار افراد لڑکے والوں کی طرف سے جاتے ہیں اور کچھ لڑکی والوں کے بڑے بزرگ مل کر شادی کی تاریخ طے کرتے ہیں۔ پھر اس درمیان دلہن کو رشتہ دار اور دوست احباب دعوت پر لے جاتے ہیں جسے کشمیری میں ''لگنہ سال'' کہا جاتا ہے۔ اس طرح دلہے کو بھی رشتے دار اور دوست احباب دعوت دیتے ہیں۔ رشتہ دار اور خاص دوست احباب کئی دن پہلے آ جاتے ہیں اور مل جل کر شادی کی تیاریاں کرتے ہیں۔ ہر تیاری کو رسموں کے طور پر نبھایا جاتا ہے۔ چاول چننے میں کئی ساری عورتیں حصّہ لیکر خوشیاں بانٹتی ہیں۔ دعوت کارڈ تقسیم کئے جاتے ہیں۔ قریبی رشتہ داروں کے یہاں کئی عورتیں مل کر دعوت دینے جاتی ہیں۔ اس رسم کو کشمیری میں ''دپنہ'' کہا جاتا ہے۔ تمام رشتہ داران کو تحفے کے طور پر میٹھائیں، بادام اور نقدی دیتے ہیں۔

بال کھولنے کی رسم:۔ شادی سے تین چار دن پہلے دلہن کے بال کھول دیئے جاتے ہیں۔ یہ رسم اکثر شام میں انجام دی جاتی ہے۔ سہیلیاں دلہن کا بناؤ سنگار کرتی ہیں۔ اسے زیور پہناتے اور اس کے بالوں میں بہت ساری چھوٹی چھوٹی چوٹیاں بنا دیتی ہیں۔ قریبی رشتہ دار اور پڑوسی کی عورتیں دلہن کے گھر میں جمع ہوجاتی ہے۔ دلہن کے بال کھولے جاتے ہیں اور اسے گھی سے ملتے ہیں۔ دلہن کا پہنا ہوا زیور عورتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ دلہن کے کندھوں پر بال بکھیر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد دلہن شادی کے دن تک کوئی بناؤ سنگار نہیں کرتی اور نہ گھر کے باہر جاتی ہے۔ خوشی کا اظہار کرنے کے لئے تمام عورتیں دلہن پر خوبانی، سکے، میٹھائی، بادام اور اخروٹ پھینکتی ہیں۔ مہمانوں کو

قہوہ اور قلچہ پیش کیا جا تا ہے۔اس دن چند گھنٹے خوب ناچ گانا ہوتا ہے۔''ون وون'' کے گیت گائے جاتے ہیں۔اس تعلق سے چند گیت ملاحظہ ہو:

بسم اللہ کرِتھہ ہیوتے وَن وونے	اللہ کا نام لیکر گیت گانے شروع کیے
صائبن انجام اونہ یے	اللہ نے کام کو انجام تک پہنچایا
مسؔ ترا وٗ یئے راجہ سندا ئندرے	آپ کے بال شہزادی کی طرح کھولیں گے
ژندرے واوٗ جے واو کریے	پنکھے سے آپ کو ٹھنڈی ہوا دیں گے
پانپرک گیو ہائے ووت اسبند بائے ڈالے	پانپور کا مشہور گھی سمدھن کو نظرانے کے طور پر آیا ہے
مُلی تومأ رمنز ہیمالے	اس گھی کو دلہن کو ملیئے

مہندی کی رسم:۔مہندی کی رسم عموماً رات میں منائی جاتی ہے۔اس رات کے بعد صبح شادی ہوتی ہے۔مہندی کے روز دلہے والوں کی طرف سے مہندی آتی ہے جو دلہن کو لگائی جاتی ہے۔ مہندی کے ساتھ ایک بڑی ٹوکری میں قرینے سے سوکھا پھل، میٹھائی، اگربتی،شمعیں، اسبند ، ماچس اور سونے کے زیور رکھے جاتے ہیں۔مہندی کی رات سے مہمان ، رشتہ دار اور دوست احباب آنے شروع ہوجاتے ہیں۔عورتیں اس رات کو ناچ گانے میں ذوق شوق سے حصّہ لیتی ہیں۔اس رات میں جشن دونوں گھروں یعنی لڑکے والوں اور لڑکی والوں کے یہاں ہوتا ہے۔آس پاس کی پڑوسی عورتوں کو ناچ گانے میں حصّہ لینے کے لئے دعوت دی جاتی ہے۔کہیں کہیں پر ناچ گانا کرنے کے لئے گانے والے بلائے جاتے ہے جو اسی پیشے سے جڑے ہوتے ہیں اور اس میں مہارت بھی رکھتے ہیں۔اس جماعت کا سردار''بچ کوٹ'' کہلاتا ہے۔جن میں مقصود بچ،من بچ،ہملی بلبل وغیرہ بہت مشہور ہیں۔اس طرح رات بھر ناچ گانا ہوتا ہے قہوہ، قلچے ،نمکین چائے اور بکرخانی رات بھر کھانے کو دیئے جاتے ہیں۔دلہے کو سجانے سنوارنے میں دوستوں کے ساتھ ساتھ نائی کا بھی اہم رول ہوتا ہے۔رسمی طور پر دلہے کے ناخون کاٹنا، ہاتھ پیر دھونے اور مہندی لگانے کی زمہ داریاں نائی کی ہی

ہوتی ہیں۔ دلہے کے صرف چھوٹی انگلی میں مہندی لگائی جاتی ہے پھر اس میں روپے باندھے جاتے ہیں۔ اس رسم میں لڑکے کے گھر والے، رشتہ دار اور دوست احباب بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں دلہے کی انگلی میں پیسے لگائے جاتے ہیں۔ جن کو بعد میں بہن، دوست اور نائی لے جاتے ہیں۔ عورتیں روایتی انداز میں ''ون وون'' کے گیت گاتی ہیں۔ جو ہلکی موسیقی سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ بیس سال قبل مہندی ایک بڑے برتن میں ملائی جاتی تھیں۔ اس برتن کو کشمیر میں ''ڈُل'' کہتے ہیں۔ اس برتن میں اخروٹ، بادام اور سکوں کے ساتھ مہندی ملائی جاتی تھی۔ اب یہ رسم نہیں رہی، سوکھی مہندی ہی عورتوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ لیکن ''ون وون'' کے گیتوں میں اس '' ڈُل'' کا ذکر ملتا ہے۔

مائنزِ ڈلیسے دیت میوزالی	مہندی کے برتن (ڈُل) میں مہندی ملائی
مائنز منزدرائے بٹہ خالِ یے	مہندی میں خوبانی کی گریاں نکلیں
مانزے رائژے عام سمویو	مہندی کی رات لوگوں کا جمغفیر جمع ہو گیا
نام لیکھو یو کاغازاس	اور آپ کا نام کاغذ پر تحریر کیا گیا

شادی:۔ شادی کے دن دھوم دھام سے مہمانوں کا استقبال کیا جاتا ہے۔ شادی کا اہتمام گھر میں رکھا جاتا ہے اس کے لئے ''شادی خانے'' کا رواج کشمیر میں نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت پڑھتی ہے۔ کھانے پینے میں وازہ وان کا انتظام رکھا جاتا ہے۔ گھر کے صحن میں بڑے بڑے اعلیٰ قسم کے سایہ بان لگائے جاتے ہیں۔ جہاں مہمان تشریف رکھتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ دولہے اور دلہن کے لئے سایہ بان میں خاص طور سے ایک جگہ سجائی جاتی ہے۔ دونوں گھروں میں شادی کے دن دھوم دھام ہوتی ہے۔ دولہے والے کے یہاں بھی یہ سب رسمیں ہوتی ہے اور دلہن والوں کے یہاں بھی الگ سے یہ سب رسمیں ادا ہو جاتی ہیں۔ کشمیر میں ہر خوشی کے موقع پر خاص طور سے شادی بیاہ کے موقع پر خوشی کا اظہار کرنے کے لئے دلہے اور دلہن کے اوپر ڈھیروں کی تعداد میں چاکلیٹس، اخروٹ،

بادام، خوبانی، کھجور، پھول اور سکے پھینکے جاتے ہیں اور اسبند جلایا جاتا ہے۔ تاکہ چشمہ بد دور رہے۔ کشمیری میں دلہن کو ''مہارن'' اور دولہے کو ''مہارزا'' کہا جاتا ہے۔ دلہن کو اس دن خوب سجایا سنوارا جاتا ہے۔ اعلیٰ قسم کے کپڑے اور زیورات زیب تن کئے جاتے ہیں۔ اب تو اس پر بھی آفاقی اثرات نظر آتے ہیں۔ لیکن کشمیری دلہن کا جو ایک مخصوص لباس تھا اسے سروری صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

''دلہن کو زرق برق پوشاک پہنائی جاتی تھی، پھرن اعلیٰ پایہ کا ہوتا تھا۔ اس پر زردوزی کا کام ہوتا اور سر پر قصابہ رکھ دیا جاتا۔ اس کی شکل مندر کے کلس سے ملتی جلتی ہے یہ ایک خاص باریک کپڑے سے تیار کیا جاتا تھا۔ شکل گول ہوتی تھی اور اس پر قسم قسم کے زیورات سوئیوں سے چسپاں کئے جاتے تھے۔ ان زیورات کے اوپر ایک سونے کی زنجیر رکھی جاتی تھی۔ اور یہ زنجیر کانوں کی بالیوں سے جنہیں کشمیری میں ''بالہ ہور'' کہا جاتا تھا باندھ دی جاتی تھی۔ قصابے کے اوپر بنارسی ڈوپٹہ یا گلکاری کیا ہوا ڈوپٹہ بذریعہ سوئیوں کے سر پر اڑھا دیا جاتا۔ سر کے بالوں کو تجربہ کار عورتیں بہت دنوں تک یاف کرتی تھیں۔ اکثر دلہن کو کسی کے گھٹنے پر دیر تک سر رکھے رہنے سے نیند بھی آتی تھی۔ اس کے بعد بالوں کی چوٹیوں کو گوندھ کر اس میں چاندی کا گیند نما خوبصورت زیور باندھ دیا جاتا تھا۔ اس کو کشمیری میں ''وانکہ پن'' کہا جاتا ہے۔ چلنے میں اس سے آواز نکلتی اور دور تک سُنائی دیتی تھی۔ گلے میں سونے یا چاندی کا گلوبند باندھ دیا جاتا جس کے ساتھ کھڑی کے پنڈلم سونے یا چاندی کا زیور لٹکتا رہتا۔ اس کا نام جگنی تھا، اس سے بھی گھونگروں کی سی آواز نکلتی تھی۔ شُرفا کی عورتیں ''قراباں'' کا استعمال کرتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پھرن میں ضرورت سے زیادہ آستین لگا دی جاتی تھی، یہ سوئیوں کے ذریعے بند رہتی تھیں۔ انگلیوں میں سونے یا چاندی کی انگوٹھیاں پہنائی جاتی۔ جسے کشمیری میں ''اُنہ واَج'' کہتے ہیں۔ بازوں پر سونے یا چاندی کے

کڑے پہنائے جاتے۔انہیں کشمیری میں ''وَسی بنگر'' کہتے ہیں۔پاؤں
میں جھانج جیسی آواز پیدا کرنے والے کڑے پہناتے، جوسونے یا
چاندی کے ہوتے۔پھرن پر چاندی کا دانت خلال لگا دیا جاتا تھا۔''۳۸

آج کشمیر کی دلہن ان سب چیزوں سے محروم رہتی ہے۔اب دلہن کوسوٹ یا لہنگا پہنایا جاتا ہے۔اس پر پورے طور سے ہندوستان کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔لیکن دلہن کے لباس کے لیے کوئی خاص رنگ مخصوص نہیں ہے۔یعنی وہ کسی بھی رنگ کا لباس پہن سکتی ہے۔زیورات میں بھی کافی تبدیلی آئی ہے۔رخصتی کے وقت برقعہ یا شال گھوگھٹ کے طور پر پہنایا جاتا ہے۔کشمیری برقعہ عام برقعوں سے کچھ مختلف ہوتا ہے۔یہاں کے برقعے کے ساتھ چہرہ ڈھکنے کے لئے ایک پٹی جوڑ دی جاتی ہے۔جس سے پورے چہرے پر پردہ ہوجاتا ہے۔اس میں آنکھوں کی جگہ فنکارانہ انداز میں آنکھیں بنائی جاتی ہے اور ان میں چھوٹے چھوٹے سراخ کئے جاتے ہیں۔شادی کے دن دلہن کو جب نہلایا جاتا ہے۔اس تعلق سے خاص طور پر ''ون وون'' کے گیت گائے جاتے ہیں:

آب شیراے روے روے	آپ کا انگ انگ نہلائیں گے
چھکھے معصومے کھونہ لل وتھ	آپ معصوم ہو گود میں جلائیں گے

اس طرح دولہے کو کرتہ پاجامہ، شیروانی، پگڑی اور جوتی پہنائی جاتی ہے۔سہرا کا رواج کشمیر میں نہیں ہے۔ جب کہ تقریباً سارے ہندوستان میں دلہے کو سہرا پہنایا جاتا ہے۔لیکن یہاں دلہے کو صرف پگڑی پہنائی جاتی ہے جس کو کشمیری زبان میں ''دستار'' کہتے ہیں۔یہ سب چیزیں اُسے برات میں جانے کے وقت پہنائی جاتی ہے۔اس سے پہلے نہانے کے بعد دن میں افغانی سوٹ اور قراقلی پہنائی جاتی ہے۔شادی کے دن رشتہ دار اور دوست احباب انھیں مبارک باد اور تحفے پیش کرتے ہیں۔تحفے میں اکثر نقدی اور زیور وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

فاتحہ خوانی:۔شادی کے دن دولہا دوست واحباب کے ساتھ جا کر اپنے آب وجداد اور آس پاس کے قبرستانوں پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہے۔

قہوہ دعوت:۔ یہ رسم دولہے والوں کے یہاں ہوتی ہے۔ دولہے کو دوست اور قریب میں رہنے والے رشتہ دار، جیسے بہنیں، پھوپھیاں خالہ، ماموں اور چچا وغیرہ قہوہ پینے کی دعوت دیتے ہیں۔ جہاں دولہا دوست احباب کے ساتھ جا کر اس رسم کو پورا کرتا ہے۔ وہاں دولہے کو دودھ پلایا جاتا ہے اور روپیوں کی ہار پہنائی جاتی ہے۔ اس کے بعد دولہے اور اس کے ساتھیوں کو قہوہ پیش کیا جاتا ہے۔لیکن اب اس کی جگہ جوش اور چائے دے کر بھی اس رسم کو مکمل کیا جاتا ہے۔

نکاح خوانی:۔ برات جانے سے پہلے تین یا چار افراد نکاح خوانی کی رسم کو پورا کرنے دلہن والوں کے یہاں جاتے ہیں۔ یہ لوگ ساتھ میں شیرنی اور کھجور لے جاتے ہیں اور نکاح ہونے کے بعد تقسیم کرتے ہیں۔ نکاح کے لئے دلہن اور دولہے سے اجازت طلب کیا جاتا ہے۔ پھر خطبہ پڑھ کر یہ دونوں ایک پاک رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔اس کے بعد دولہا برات لے کر سسرال جاسکتا ہے۔ کچھ لوگ منگنی پر بھی اس رسم کو اسی طرح نبھاتے ہیں۔لیکن اس کے برعکس چند لوگ دلہے کے سسرال پہنچنے کے بعد نکاح کا خطبہ دلہے کے سامنے ساری محفل میں پڑھتے ہیں جو صحیح طریقہ ہے۔ کیونکہ دلہن سے اجازت طلب کر کے دلہے کو نکاح قبول کرنا ہوتا ہے۔اس لیے نکاح کے خطبہ میں دلہے کا شامل ہونا ضروری ہے۔

برات:۔ دولہا براتیوں کے ساتھ دلہن کے ہاں جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں دولہا گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا تھا۔لیکن اب گاڑی میں دولہا برات لے کر جاتا ہے۔ برات میں پچاس سے سو افراد تک جاتے ہیں۔ وہاں دلہن کے گھر والے رشتہ دار اور دوست احباب دو قطاروں میں استادہ ہو کر دولہے کا استقبال کرتے ہیں۔ دولہے کو روپیوں اور پھولوں کے ہار پہنائے جاتے ہیں۔ پھول اور سوکھا پھل وغیرہ دولہے پر پھینکے جاتے ہیں اور گلدستے پیش کئے جاتے ہیں۔ ساسو ماں دولہے کو دودھ پلاتی ہے اور کچھ تحفے سونے کی انگوٹھی یا چین پیش کرتی ہے۔ پھر دولہے کو پلنگ پر بیٹھا یا جاتا ہے اور اس کے آس پاس ایک بڑے ہال یا سایہ بان میں براتیوں کو بھی بٹھایا جاتا ہے۔

براتیوں کو سکھے میوے، مٹھائی، شربت اور وازہ وان پیش کیا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق ہر براتی اپنے حصّے کی چیزیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کیونکہ وہاں بہت بڑی تعداد میں یہ سب چیزیں پیش کی جاتی ہے۔ اس کو پیک کرنے کا سامان بھی ہر براتی کو دیا جاتا ہے۔ برات آتے وقت عورتیں گیت گانے شروع کرتیں ہیں۔ چند گیت ملاحظہ ہو۔

اعظمند بائے پھیرڑاالانس	دلہن کی ماں برآمدے پرنکل آ
نیر جانانس پوش چھکہ نے	دولہے راجہ کا پھولوں سے استقبال کرو
ڈیکس پیٹھ چھے سونہ سوند بادم	آپ کے ماتھے پہ سونے کا بادام ہے
نظرِ آدم دور گژھِ نئے	چشمِ بددور ہو جائے
سٹرکن وتھرے مُشق کافورو	آپ کی راہوں میں خوشبو بچھائیں گے
عَشق بمبور ولاَلہِ آکھو	عشق زادے لیلہ کو لینے آئے ہو
ہارِ کور دارِ کن ویسن اعلانئے	دلہن نے سہیلیوں کو کھڑکی سے آواز دی
میون جانانئے وارِوُ چھزہون	میرے دولہے کو غور سے دیکھ لینا
سَبہِ شوب یہہ نئے نبہ دور کرنے	اللہ کرے آپ کی بیٹی کی شادی میں بارش نہ آئے
کورِ مالِ او برے یہہ نئے	لڑکی کے باپ آپ کی عزت برقرار رہے۔

چونکہ اب تو کچھ رسمیں ختم ہو گئیں ہیں۔ قدیم زمانے میں شادی بیاہ کے موقع پر ناٹک کرنے کے لئے ایک پیشہ ورانہ طبقہ ''بھانڈ'' بلائے جاتے تھے۔ لوگ ذوق شوق سے اس کو دیکھتے اور حض اُٹھاتے تھے۔ مزید دلہن کے گھر میں آٹھ یا دس سال کے بچے کو دولہے کی طرح سجا کر سایہ بان میں رکھا جاتا تھا۔ جس کو کشمیری میں ''سنس مہاراز'' کہتے ہیں۔

رخصت :۔ رخصتی کے وقت دلہن، دلہن کے سہیلیوں اور دلہن کے گھر والوں کی آنکھوں میں آنسوں کی برسات جاری ہو جاتی ہیں۔ سب دلہن کو گلے لگا کر زار زار روتے ہیں۔ اس

روز اکثر لوگ دولہے اور دلہن سے دعائیں کراتے ہیں۔اس تعلق سے یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں اس وقت صاف شفاف دل کے ہوتے ہیں اوران کی ہر دعا قبول ہوجاتی ہے۔ڈولی کی جگہ اب گاڑی میں دلہن کو لایا جاتا ہے۔جس میں آگے صرف ڈرائیور اور پیچھے دولہا اور دلہن کو بیٹھایا جاتا ہے۔ باقی براتی دوسری گاڑیوں میں جاتے ہیں۔دلہن کے ساتھ جہیز بھی دیا جاتا ہے یہ ہر والد اپنی مقدار کے موافق دیتا ہے۔تا کہ سسرال میں بیٹی عزت سے رہے۔دلہن تمام نئے گھر والوں کے لئے تحفے لے جاتی ہے اور دیگر گھریلو سامان بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ان تمام رسموں کے تعلق سے عورتیں ’’ون وون‘‘ کے گیت گاتی ہیں۔چند گیت نمونے کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

کیاز چکھ کھٹ پت کٹھ پھیرائی	کیوں کمرے سے کمرے کے پھیرے لگا رہی ہو
رخصت چھے نہ میلأ نی یے	کیا آپ کو رخصت نہیں مل رہی ہے
مالنچ کنز کرِ ماجہ حوالئے	میکے کی چابیاں ماں کے حوالے کردو
نیر کو رِوأرو کی سوالئے	نکلو اب سسرال والوں کے کہنے پر
برونہہ نیر گبرو تتہِ ون ماجے	بیٹا(دولہے) آپ پہلے نکل کر ماں کو خبر کردے
کورِ چھے راجے مالین ستہ	بیٹی(دلہن) کے ساتھ اس کا راجہ میکہ آیا ہے۔

زوم راند:۔رخصت ہونے کے بعد جب دولہا گھر پہنچتا ہے۔وہاں دولہے کی بہن دروازہ بند کرتی ہے اور دولہے کو تب تک اندر آنے نہیں دیتی ہے جب تک نہ ’’زوم راند‘‘ کے طور پر کوئی اعلیٰ تحفہ لیتی ہے۔دولہے اپنی طرف سے کچھ دیتا ہے لیکن بہن اپنی فرمائش کی مانگ کرتی ہے اور پھر کوئی تحفہ دینا طے پاتا ہے اس کے بعد بہن دروازہ کھول کر دولہے کو اندر آنے کی اجازت دیتی ہے۔ اس تعلق سے گیت ملاحظہ ہو:

بھأے لالواوم دودھ چیتہ مو	بھائی جان لو دودھ پیلو
ہوم گاؤ دیتہٕ موز وم راندس	بھورا رنگ کی گائے نند کو نذرانہ کرو

بھأ ئے لالوٚ ہیل موتو ہتہ مو — بھائی جان کوئی بہانہ مت کرو
نل گاوٚ دیتہٕ موزوم راندس — سفید رنگ کی گائے نند کو نذرانہ کرو

گھونگھٹ:۔ سسرال پہنچ کر دلہن کو پلنگ پر بیٹھایا جاتا ہے۔ دلہن گھونگھٹ میں ہوتی ہے۔ تو سب سے پہلے گھونگھٹ اُٹھا کر ساس اس کا چہرہ دیکھتی ہے۔ اسے گلے لگاتی اور بوسہ لیتی ہے۔ اس رسم کو اکثر و بیشتر ساس انجام دیتی ہے۔ کہیں کہیں پر ساس اپنی بڑی نند کو بھی عزتاً اس رسم کو پورا کرنے کے لئے اصرار کرتی ہے۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ گھونگٹ اُٹھانے والے سدا سہاگن ہونی چاہئے۔ اسے دلہن بھی ہمیشہ سدا سہاگن رہتی ہے۔ اگر ساس بیوہ ہو تو اس رسم کو لازماً رشتہ کی کوئی دوسری عورت پورا کرتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں پر ساس کے گھونگھٹ نہ اُٹھانے سے اُس کی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے۔ گھونگھٹ اُٹھانے میں جب دیر ہوجاتی ہے تو عورتیں اس تعلق سے گیت گانے شروع کرتی ہیں۔ گیت ملاحظہ فرمائیں:

اسبند بأ ئے تأ رکیا زِلجہ یے — ساس آپ نے دیر کیوں کردی
نوشہِ ہچھ کأ رتۓ مہر تل سے — بہو کی گردن تھک گئی اس کا گھونگھٹ اُٹھائے

ہش کأ ٹ (ساس کا تحفہ):۔ ساس کے لئے لازماً دلہن کو کوئی تحفہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ جسے کشمیری میں ''ہش کأ ٹ'' کہتے ہیں۔ اسے دلہن اپنے مقدار کے موافق لاتی ہے۔ اگر دلہن یہ اپنے مقدار کی حیثیت سے کمتر لاتی ہے تب اسے کئی طرح کی باتوں کا سامنا کرنا پڑھتا ہے۔ اس وقت بھی خواتین ''ون وون'' کے گیتوں کا اہتمام کرتی ہیں۔ جس میں ہلکا طنز بھی شامل ہوتا ہے:

اُس وچھو میرن ہند کارکیاہ آسے — ہم دیکھیں گے میروں (ذات) کا کارنامہ کیا ہوگا
ہش کأ ٹ سون سُند ہار آسے — ساس کے لیے سونے کا ہار لایا ہوگا

قہوہ خبر:۔ شادی کے تیسرے دن دلہن کے میکے سے چند افراد دولہے والوں کے یہاں ''قہوہ خبر'' کے لئے آتے ہیں۔ دلہن کا حال چال پتہ کرتے ہیں اور ساتھ میں قہوہ تیار کرنے کا پورا سامان

لاتے ہیں۔مثلاً سماوار، پیالے،چینی ،دالچینی ،الائچی ،زعفران اور روٹیاں وغیرہ۔

پھر سال:۔شادی کے بعد سات دن تک دلہن سسرال میں رہتی ہے۔اس درمیان دولہے کے رشتہ دار اور دوست احباب دولہا اور دلہن کو دعوت دے کر گھر لے جاتے ہیں۔اس طرح نئے رشتہ داروں سے دلہن کا تعارف کیا جاتا ہے۔سات دن ہونے کے بعد میکے والے دعوت دے کر دولہا اور دلہن کو لے جاتے ہیں۔سسرال والے اسے ٹوکریوں میں بھر کے میٹھائی اور روٹیاں ساتھ دیتے ہیں اور اپنی طرف سے بنایا ہوا لباس پہناتے ہیں۔پھر دلہن اکثر سات دن تک میکے میں رہتی ہے اس کے بعد سسرال والے پھر دعوت دے کر واپس بلاتے ہیں۔ میکے میں بھی دلہن کے رشتہ دار اور دوست احباب انھیں دعوت دیتے ہیں۔ ہر دعوت پر ان کے ساتھ گھر کے دیگر افراد بھی جاتے ہیں۔ یہ دعوت یعنی ''پھر سال'' کی دعوتیں بہت مشہور ہوتی ہیں۔ان میں بڑے خلوص پیار ومحبت سے ان کا استقبال کیا جاتا ہے۔وازہ وان کے ساتھ کئی طرح کی ضیافتیں پیش کی جاتی ہیں۔اس طرح شادی بیاہ کے رسومات اختتام کو پہنچتے ہیں۔اس کے بعد تہواروں پر بیٹی اور داماد کو دعوت دی جاتی ہے۔

رسوم میت:۔اس سے ہر ایک واقف ہے کہ انسان کی موت برحق ہے اس کی ادائیگی میں ہر مذہب کے رسومات مختلف ہیں۔ چونکہ کشمیر میں مسلم کی اکثریت کافی زیادہ ہے اس لئے ان کا ہی ذکر کرنا مناسب ہوگا۔کشمیر میں جب کسی مسلمان کی موت ہوتی ہے تو ہر جگہ کی طرح یہاں بھی رشتہ دار اور دوست احباب آخری دفعہ میت کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ میت کو غسل دیکر دو گز کفن پہنایا جاتا ہے۔اس کے بعد تابوت میں بھر کر نمازِ جنازہ ادا کیا جاتا ہے۔اس سے فارغ ہو کر مٹی دینے یعنی دفنانے لے جایا جاتا ہے۔قبر تک اسے رشتہ دار ہمسائے اور دوست احباب لے جاتے ہیں۔ باقی لوگ نمازِ جنازہ سے فارغ ہو کر اپنی اپنی راہ چلتے ہیں۔کنوارے میت پر زیادہ ہی رنج وغم کا اظہار کیا جاتا ہے۔اسے مہندی لگائی جاتی ہے اور اس پر میٹھائی (کینڑی) پھینکی جاتی ہیں۔عورتیں زور زور سے بین کرتی ہیں۔میت کے اوصاف بیان کرتی ہیں۔اس سے بچھڑنے کا اظہار کرتی ہیں۔ بین کے

چنداشعار ملاحظہ فرمائیں:

چان مرنے آیا بھرنے مرگزار — آپ کے مرنے سے قبرستان بھر گئے
چان مرنے گیا آسمان خون بخوار — آپ کے مرنے سے آسمان خون خوار ہوگئی
چان مرنے گیا زمین چاک بہ چاک — آپ کے مرنے سے زمین چاک چاک ہوگئی
میے ودلیلے سونروان ہے آسے — مت رولیلیٰ سونے کی دکان پر ہوگا
میے ودلیلے بزازوان ہے آسے — مت رولیلیٰ بزاز کی دکان پر ہوگا

میت کے گھر میں آس پاس بیٹھے لوگ گھر والوں کو دلاسہ دے کر چپ کراتے ہیں۔اس طرح تین دن تک گھر میں ماتم جاری رہتا ہے۔لوگ چار دن تک تعزیت کے لئے آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس درمیان ہمسائے انھیں کھلاتے پلاتے ہیں۔

چوتھا: ۔چوتھے دن میت کے نام کا صدقہ دیا جاتا ہے۔اور قرآن خوانی کی جاتی ہے۔صدقے کے طور پر وازہ وان، چائے، روٹی اور قہوہ قلچہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔چوتھے کو ''فاتحہ'' کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔اس دن رشتہ دار اور دوست احباب لین دین بھی کرتے ہیں۔جس میں روٹیاں، جوس، انڈے، زیور، پھل اور نقدی وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ بندراواں، چالیسواں اور ایک سال ہونے پر ختم شریف پڑھایا جاتا ہے۔غریب غربات کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔فاتحہ خوانی کے لئے یہ دن خاص طور سے مخصوص ہے۔مزید مردہ کبھی خواب میں آیا تو مولوی صاحب کو دعوت دیکر میت کو فاتحہ بھیجا جاتا ہے۔جو لوگ شہید ہو جاتے ہیں۔ان کی رسم ادائیگی کچھ مختلف ہوتی ہیں۔بقول دہلوی صاحب:

> ''ان مردوں سے مراد ہے جو امر حق پر یا راہ خدا میں مارے گئے ہوں یا انھیں ناحق باغیوں، حربیوں، رہزنوں خواہ کافروں نے ازراہِ تعصب بے گناہ قتل کر دیا ہو اور ان میں کوئی قتل کی نشانی مثلاً ناک، کان، آنکھ وغیرہ سے خون کا جاری ہونا بھی پایا جاتا ہو۔ایسے مردے کو بغیر نہلائے

بغیر کفنائے ان ہی خون آلودہ کپڑوں سے دفن کر دیتے ہیں۔ مگر نمازِ
جنازہ ضرور پڑھتے ہیں۔''۳۹؎

ماہ رمضان:۔ ماہ رمضان سب سے متبرک اور عبادت کا مہینہ ہوتا ہے۔ اس مہینہ میں مسلمان خدا کی رضا کے لئے پورا مہینہ روزہ کا اہتمام کرتے ہیں۔ رمضان کی پہلی تاریخ کو لوگ بہت ہی بے صبری سے چاند طلوع ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ جس کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی رمضان کا مہینہ شروع ہو جاتا ہے۔ تمام مسلمان رات میں سحری کھاتے ہیں اور دن بھر کوئی بھی چیز کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ پانچوں نمازوں کے پابند رہتے اور کوئی بھی برا کام کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ نماز تراویح بھاری اجتماعات میں ادا کی جاتی ہے۔ مغرب کے وقت مختلف ضیافتوں سے روزہ کھولتے ہیں۔ دل کھول کر لوگ صدقہ دیتے ہیں۔ کھجور، فیرنی، حلوہ اور پھل وغیرہ غریبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس مہینہ کے آخری عشر کی طاق راتوں میں ''شب قدر'' منایا جاتا ہے۔ لیکن ان میں خصوصیت کے ساتھ ستائیسویں رات ''شب قدر'' کے نام سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس رات کی فضیلت ہزار ہا سالوں کی عبادت پر فوقیت رکھتی ہے۔ دن بھر روزہ ہوتا ہے اور رات شب بیداری میں صرف ہوتی ہے۔ قرآن کریم کا نزول اسی شب کے دوران ہوا ہے۔ مسجدوں اور خانقاہوں میں واعظ اس رات کی فضیلت بیان کرتے ہیں۔ عورتیں گھر میں رہ کر پوری رات عبادت میں مصروف رہتی ہیں۔ اس دن سے لوگ عید کی تیاریوں میں لگ جاتے ہیں۔ عورتیں گھر کی صفائی اور کپڑے دھونا شروع کر دیتی ہیں۔ کشمیر میں اس مہینہ کے آخری دن کو بھی ''عرفہ'' کہا جاتا ہے جبکہ ذی الحجہ کی نو تاریخ کو ''عرفہ'' کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ جس کے دوسرے دن سے عیدالاضحی شروع ہوتی ہے۔ اس دن کو بھی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ بازاروں میں ہر طرف لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ بازار چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سواری میں چلنا محال ہو جاتا ہے۔ اس دن لوگ عید کے لئے نئے نئے کپڑے، ترکاریاں، گوشت اور بچوں کے لئے کھلونے وغیرہ خریدتے ہیں۔ خاص طور سے میکے والے بیٹیوں اور دامادوں کو دعوت دیتے ہیں۔

عیدالفطر:۔ عید مسلمانوں کا سب سے بڑا تہوار ہے۔شوال کی پہلی تاریخ مسلمانوں کے لئے ابدی مسرتوں کا پیغام لاتی ہے۔اس عید کی خاص بات یہ ہے کہ عید نماز سے پہلے صدقہ فطر تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ اس صدقے کے حق دار لوگ بھی عید کی خوشیوں میں شامل ہو جائیں۔دو رکعت نماز عید ہر مسلمان پر واجب ہے جس کو لوگ بڑے بڑے عید گاہوں میں اجتماعات کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔اس موقعہ پر مسلمان نئے کپڑے زیب تن کرتے اور خاص خاص ضیافتوں کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔بڑے چھوٹوں کو عیدی سے نوازتے ہیں۔لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔کسی خانہ میں اگر کسی کی وفات ہوئی ہو تو پہلی عید کو ہمسائے اور رشتہ دار وہاں تعزیت کے لئے جاتے ہیں۔لڑکیاں سسرال سے میکے آجاتی ہیں۔عید روف گیتوں سے کئی دنوں تک فضا میں روح پرور نغمگی چھائی رہتی ہے۔اس تعلق سے چند گیت ملاحظہ ہو:

عید آئی رس رس
عید گاہ وسوئے عید گاہ وسوے
یوم عند نبی صاحب تمی عند وسوے تمی عند وسوے
قرآن پرتھ واپس خسوئے واپس خسوئے

عیدالاضحیٰ:۔ یہ عید ہر سال ذی الحجہ کی دس تاریخ کو منائی جاتی ہے۔اس تقریب پر مسلمان اللہ کی رضا کے لئے شرعاً حلال جانوروں کی قربانیاں دیتے ہیں اور ذبح کئے گئے جانوروں کا گوشت اپنے ہمسایوں، دوست احبابوں اور رشتہ داروں میں تبرکاً تقسیم کرتے ہیں۔جانوروں کی قربانیوں کا یہ سلسلہ تین دن تک جاری رہتا ہے۔اس عید کی تقریب پر ہی مسلمان مکہ معظّمہ جا کر لاکھوں کی تعداد میں حج کا مقدس فریضہ انجام دیتے ہیں جو اسلام کے بنیادی ارکان میں شامل ہے یہی کچھ ارکان ہے جو دونوں عیدوں (عیدالفطر اور بقرعید) میں فرق کرتے ہیں۔اس کے علاوہ باقی فرائض دونوں عیدوں میں یکساں ہیں۔بقرعید کے دن پہلے دو رکعت نماز عید واجب ہے اس کے بعد

جانوروں کی قربانیاں شروع ہوجاتی ہیں۔اس عید پر بھی مسلمان عورتیں کشمیر میں روف گیتوں سے مسرتوں میں اضافہ کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ پیغمبر آخرالزّماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ولایت کا دن ۱۲ربیع الاول ''عید میلادنبیؐ'' کے نام سے عزت واحترام سے منایا جاتا ہے۔اس دن لوگ اپنی عقیدت کا اظہار نعت و مناقب کی صورت میں کرتے ہیں۔اس روز سعادت کے بعد آنے والے جمعہ کو ہر سال حضرت بل میں بے مثال میلہ لگتا ہے۔ جہاں کشمیر کے لوگ دور دور سے آکر موئے مقدس کی زیارت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔اس طرح ''شب معراج'' اور ''شب برات'' بڑے مقدس تقاریب ہیں۔ان تقاریب پر بھی شب بیداری کی جاتی ہے۔شب برات کی رات کو مسلمان گھر میں چراغ افروز کرتے ہیں۔مسجدوں اور خانقاہوں میں ان کی فضیلت بیان کی جاتی ہے۔

کشمیر میں دیگر کئی معتبرک اور بزرگ ہستیوں کا عرس منایا جاتا ہے۔ جیسے عرسِ دستگیر سید عبدالقادر جیلانی، عرسِ نقشبندی، حجرت بہاؤ الدین، عرس شاہ ہمدان، حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ، عرس ریشی مول حضرت شیخ نورالدین ریشی، عرس حضرت شیخ نورالدین ولیؒ، عرس زین الدین ولیؒ، عرس سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ، عرس شیخ یعقوب صرفیؒ، عرس بابا نصیب الدین غازی، عرس شیخ داودالمعروف قابل ذکر ہیں۔

یوم عاشورا:۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس میں حضرت امام حسین علیہ السلام اوران کے رفقاء کارکو دشتِ کربلا میں یزید کے حکم سے دس دن کے اندر ماہ محرم میں شہید کیا گیا۔انھوں نے اپنی عظیم شہادت سے باطل کے سامنے سرِتسلیم خم نہ کرنے کی روایت قائم کی۔اس روز ریاست میں تعزیئے اور ماتمی جلوس نکالے جاتے اور مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔حضرت امام حسینؓ اوران کے معصوم جگر پاروں کے نام پر پانی، دودھ، کھیر اور شربت بانٹی جاتی ہیں کیونکہ آپ بھوکے اور پیاسے شہید ہوئے تھے۔ اس طرح یہ واقعہ قیامت تک یادرہے گا۔

ہندو کے تہوار ہولی، دیوالی، دسہرہ اور بیساکھی وغیرہ بھی ہندو و مسلم مل کر مناتے ہیں ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ خاص طور سے ''امرناتھ یاترا'' کے لئے ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ اس مقدس یاترا سے فیضیاب ہونے کے لئے آتے ہیں۔ اس موقع پر بیجبہاڑہ کے قریب ججی وارہ میں بھی شو کے استھاپن پر میلہ لگتا ہے۔ رکھشا بندھن کا تہوار بھی اسی روز منایا جاتا ہے جب بہن بھائی آپس میں بلالحاظ مذہب وملت راکھیاں باندھ کر محبت کا عہد و پیماں بھی باندھتے ہیں۔ شری امرناتھ جی کی گھپا سرینگر سے پہلگام تک ۹۴ کلومیٹر اور وہاں سے گھپا تک ۴۵ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ لوگ یہ صبرآزما یاترا موسم کی کھٹنائیوں کے باوجود جان کی بازی لگا کر صدیوں سے کرتے آئے ہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں رسومات ہیں جو صدیوں سے جاری ہیں۔ ''مرغ خوشہ'' جو دھان کی پہلی بالیاں نکل آنے پر مرغا ذبح کیا جاتا ہے جس کو پکنے کے بعد چاولوں کے ساتھ ملایا جاتا ہے اور پھر تبرکی کے طور پر تقسیم کیا جاتا ہے اور کچھ واصل بحق ہوئے لوگوں کی ارواح کو ایصال ثواب کے لئے کسی دینی بزرگ کو ضیافت کی صورت میں دعوت دیکر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی فصل بہار میں پہلی بار کھیتی میں ہل چلاتے وقت کیا جاتا ہے اور کتنی ہی ایسی رسمیں ہیں جو یا تو نیک شگون باندھنے یا اظہار تشکر کا روپ دھار چکی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔رسول پُو نیر/نگراں محمد یوسف ٹینگ۔رسالہ ہمارا ادب۔تاریخ کے ماخذ۔جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی،سرینگر، کشمیر۔۱۹۸۱۔۱۹۸۲۔ص۔۱۳۲

۲۔ایم۔ایس۔ناز۔تصویرِ کشمیر۔گلشن پبلیشرز،سرینگر،کشمیر۔۱۹۹۳۔ص۔۲۳

۳۔تہذیب وتمدن اور اسلام۔رحمان مذنب۔شاہراہ قائدِ اعظم لاہور۔۱۹۹۲۔ص۔۱۲

۴۔انوار احمد۔جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کی اُردو ادبی خدمات۔ادبی کتاب گھر صدرہ بل،سرینگر۔ص۔۱۱۔۱۲

۵۔ہمارا ادب۔نگراں محمد یوسف ٹینگ۔رسول پُو نیر۔تاریخ کے ماخذ۔جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی،سرینگر۔ ۱۹۸۱۔۱۹۸۲۔ص۔۱۱۸

۶۔عبدالقادر سروری۔کشمیر میں اُردو۔جموں اینڈ کشمیر کلچرل اکیڈیمی سرینگر۔۱۹۸۱۔ص۔۳۸۔۳۹

۷۔ہمارا ادب۔نگراں محمد یوسف ٹینگر۔بشیر اختر۔عبادت گاہیں۔جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی سرینگر۔۱۹۸۱۔۱۹۸۲۔ص۔۲۰۰

۸۔ایم۔ایس۔ناز۔تصورِ کشمیر۔گلشن پبلیشرز،سرینگر۔۱۹۹۳۔ص۔۲۸۷

۹۔سر والٹر روپرٹ لارنس/مترجم غلام نبی خیال۔کشمیر کی وادی۔قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی۔۲۰۱۴۔ص۔۳۵۵

۱۰۔ہمارا ادب۔نگراں محمد یوسف ٹینگ۔بشیر اختر۔عبادت گاہیں۔جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی،سرینگر کشمیر۔ ۱۹۸۱۔۱۹۸۲۔ص۔۲۰۴

۱۱۔ایم۔ایس۔ناز۔تصویرِ کشمیر۔گلشن پبلشرز،سرینگر،کشمیر۔۱۹۹۳۔ص۔۳۳۴۔۳۳۵ بحوالہ کشمیر،ادب وثقافت

۱۲۔ہمارا ادب۔نگراں محمد یوسف ٹینگ۔بشر بشیر۔لوک ادب۔جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی سرینگر۔۱۹۸۲۔۱۹۸۳۔ص۔۱۴۲

۱۳۔ہمارا ادب۔نگراں محمد یوسف ٹینگ۔بشر بشیر۔لوک ادب۔جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی سرینگر۔۱۹۸۲۔۱۹۸۳۔ص۔۱۴۲

۱۴۔ہمارادب۔نگراں محمد یوسف ٹینگ۔قیصر قلندر۔موسیقی۔جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی،سرینگر۔۱۹۸۰۔۱۹۸۱۔ص۔۱۸۴

۱۵۔ہمارا ادب۔نگراں محمد یوسف ٹینگ۔بشر بشیر،لوک ادب۔جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی سرینگر۔۱۹۸۲۔۱۹۸۳۔ص۔۱۴۴

۱۶۔شیرازہ،ثقافت نمبر۔نگراں نیلا سبر دیوشرما۔ایم یاسین۔کشمیر کی دستکاری۔جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی،سرینگر،جلد:۵۔ شمارہ:۱۔ص۔۳۷۱

۱۷۔ہمارا ادب۔محمد یوسف ٹینگ۔عبدالاحد رفیق۔میوے اور باغات۔جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی،سرینگر۔ ۱۹۷۹۔۱۹۸۰۔ص۔۲۵۹

۱۸۔ایم۔ایس۔ناز۔تصویرِ کشمیر۔گلشن پبلشرز،سرینگر،کشمیر۔۱۹۹۳۔ص۔۳۰۲

۱۹۔ایم۔ایس۔ناز۔تصویر کشمیر۔گلشن پبلشرز،سرینگر،کشمیر ۔۱۹۹۳۔ص۔۱۳۰۔۱۳۱

۲۰۔نگراں محمد یوسف ٹینگ۔رسالہ ہمارا ادب۔آفاق احمد۔آب و ہوا۔جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی،
سرینگر۔۱۹۷۹۔۱۹۸۰۔ص۔۱۱۱

۲۱۔ایم۔ایس۔ناز۔تصویر کشمیر۔گلشن پبلشرز،سرینگر،کشمیر۔۱۹۹۳۔ص۔۱۵۹۔۱۶۰

۲۲۔سر والٹر روبرٹ لارنس۔مترجم غلام نبی خیال۔کشمیر کی وادی۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،دہلی۔۲۰۱۴۔ص۔۱۹

۲۳۔ڈاکٹر صابر آفاقی۔عکسِ کشمیر۔لاہور۔۱۹۹۱۔ص۔۱۴۷۔۱۴۸

۲۴۔سر والٹر روبرٹ لارنس۔کشمیر کی وادی۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،دہلی۔۲۰۱۴۔ص۔۴۶

۲۵۔ایم۔ایس۔ناز۔تصویر کشمیر۔گلشن پبلشرز،سرینگر،کشمیر۔۱۹۹۳۔ص۔۲۸۶

۲۶۔والٹر روبر لارنس/مترجم غلام نبی خیال۔کشمیر کی وادی۔قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان نئی دہلی۔۲۰۱۴۔ص۔۲۹

۲۷۔ایم۔ایس۔ناز،تصویر کشمیر۔گلشن پبلشرز،سرینگر،کشمیر۔۱۹۹۳۔ص۔۱۷۵

۲۸۔پرج پر یمی/نگراں محمد یوسف ٹینگ۔رسالہ'ہمارا ادب۔غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں۔جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی،سرینگر،
کشمیر۔۱۹۸۱۔۱۹۸۲۔ص۔۳۰۸۔بحوالہ A History of kashmir .P N K Bamzai

۲۹۔سر ولٹر روبرٹ لارنس/مترجم غلام نبی خیال۔کشمیر کی وادی۔قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان،
دہلی۔۲۰۱۴۔ص۔۳۲۶۔۳۳۴

۳۰۔رشید نازکی/نگراں محمد یوسف ٹینگ۔مذاہب و عقائد۔رسالہ ہمارا ادب۔جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی،سرینگر،
کشمیر۔۱۹۸۱۔۱۹۸۲۔ص۔۱۶۱

۳۱۔سر ولٹر روبرٹ/مترجم غلام نبی خیال۔کشمیر کی وادی۔قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان،دہلی۔ص۔۳۳

۳۲۔سر ولٹر روبرٹ لارنس/مترجم غلام نبی خیال۔کشمیر کی وادی۔قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی۔۲۰۱۴۔ص۔۹۱

۳۳۔جہانگیر/مترجم،اعجاز الحق قدوسی۔توزک جہانگیر۔مجلس ترقی ادب لاہور۔۱۹۷۰۔ص۔۱۲۸

۳۴۔مرزا غلام حسن بیگ عارف۔نگراں محمد یوسف ٹینگ۔ہمارا ادب۔ریشم و کاغذ سازی۔جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی،سرینگر،
کشمیر۔۱۹۸۱۔۱۹۸۲۔ص۔۲۷۲

۳۵۔سر ولٹر روبرٹ لارنس/مترجم غلام نبی خیال۔کشمیر کی وادی۔قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان،نئی دہلی۔۲۰۱۴۔ص۔۲۹۱

۳۶۔ایم۔ایس ناز۔تصویر کشمیر۔گلشن پبلشرز،سرینگر،کشمیر۔۱۹۹۳۔ص۔۲۹۹۔بحوالہ کشمیر ادب و ثقافت

۳۷۔مولوی سید احمد دہلوی۔مرتبہ خلیق انجم۔رسوم دہلی۔اردو اکادمی،دہلی۔۱۹۸۶۔۲۰۰۶۔ص۔۷۷

۳۸۔عبدالقادر سروری۔کشمیر میں اُردو۔جموں اینڈ کشمیر کلچرل اکیڈیمی،سرینگر۔۱۹۸۱۔ص۔۲۹

۳۹۔مولوی سید احمد دہلوی۔مرتبہ خلیق انجم۔رسومِ دہلی۔اُردو اکادمی،دہلی۔۱۹۸۶۔۲۰۰۶۔ص۔۱۷۷

باب چہارم

اردو افسانے میں کشمیری تہذیب و ثقافت

(جموں و کشمیر کے افسانہ نگاروں کے حوالے سے)

اردو افسانے میں کشمیری تہذیب وثقافت
(جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کے حوالے سے)

ادب اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ ادب جس معاشرے میں تخلیق کیا جاتا ہے اس معاشرے کی تہذیب کو اپنے اندر سمولیتا ہے یعنی ادب اس معاشرے کا رہن سہن، طرز زندگی، بات چیت، لباس، اور رسومات وغیرہ اپنی تخلیق میں پیش کرتا ہے اس لئے ادب اپنے عہد کا آئینہ کہلاتا ہے۔ ایک ادیب حساس ہوتا ہے وہ جس معاشرے میں آنکھیں کھولتا ہے غیر شعوری طور پر معاشرے کو اپنی تخلیق میں پیش کرتا ہے۔ جس موڑ سے ایک عام آدمی یوں ہی گذرتا ہے وہاں پر ایک ادیب ٹھہرتا ہے اور بہت کچھ محسوس کرتا ہے پھر اسے اپنی تخلیق میں پیش کرتا ہے۔

انیسویں صدی میں اردو افسانے کا آغاز ہوا، راشد الخیری کے افسانے خدیجہ اور نصیر ۱۹۰۳ء کو پہلا افسانہ قرار دیا گیا۔ پریم چند نے باقاعدہ طور پر اردو افسانے کی بنیادی ڈالی۔ انھوں نے اپنے عہد کے فرسودہ روایات، ستی کا رواج، بے جوڑ شادی، ذات پات، مزدوروں کے ساتھ ظلم وزیادتیاں، دیہات کے مناظر و دیہات کے رسومات اور غریب کسانوں کے جذبات وخواہشات وغیرہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ جس کی عمدہ مثال ''کفن'' سوا سیر گیہوں'' ''ٹھاکر کا کنواں'' وغیرہ ہیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں پورے دیہات کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ خود بھی دیہات سے تعلق رکھتے تھے اس لئے وہ دیہات کی زندگی سے خوب واقفیت رکھتے تھے۔ اس بنا پر پریم چند کو دیہاتی تہذیب وثقافت کا عکاس کہا جاسکتا ہے۔

پریم چند کی طرح منٹو نے ممبئی کے ماحول اور وہاں کی تہذیب وغیرہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ان کے افسانوں میں ممبئی جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔اسی طرح بیدیؔ اور احمد ندیم قاسمیؔ نے پنجاب کی تہذیب وثقافت وغیرہ کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔غرض ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ یہاں ہر ریاست کی اپنی ایک الگ تہذیبی پہچان ہے۔ پھر بھی اگر ہم دیکھیں تو پورے ہندوستان میں ایک ملی جلی تہذیب پائی جاتی ہے۔ یہ کثرت میں وحدت کی منفرد مثال ہے۔ وہ اس لئے کہ یہاں اکثر وبیشتر لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ تجارت وغیرہ کے سلسلے میں آتے جاتے رہتے ہیں اور پھر وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔جس کی وجہ سے ایک ملی جلی تہذہب وجود میں آئی۔سوائے ایک ریاست کے، جو کہلاتی ہے کشمیر، جو نہ صرف موسمی، پیڑ پودوں اور قدرتی مناظر کے اعتبار سے اپنا ایک منفرد شناخت رکھتی ہیں بلکہ یہاں کے تمام تہذیبی وثقافتی عناصر انفرادیت کے حامل ہیں۔اس کے وجوہات یوں ہیں کہ آج کے مقابلے میں کشمیر زیادہ ٹھنڈا علاقہ تھا جبکہ آج سہولیات بھی میسر ہے۔آج سے کئی سو سال پہلے یہ بھی میسر نہیں تھیں اس لئے کشمیر میں ایک منتخب طبقہ ہی اس سردی کو جھیلتا تھا،اور سردی سے بچنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتے تھے جو آگے چل کر یہاں کی تہذیب میں شامل ہوئے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ کشمیر کو ایک الگ ملک ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہ چکا ہے۔اور ہندوستان کے ساتھ شامل ہوتے وقت یہاں آرٹیکل ۳۷۰ لگا ہے جس کے تحت یہاں کسی بھی غیر ملکی یا غیر ریاستی فرد کو زمین خریدنے کا اختیار نہیں ہے۔اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیری عوام ہمیشہ ظلم وزیادتی کی شکار ہوتی رہی ہیں۔جس کی وجہ سے دوسرے ریاست کے لوگ یہاں تجارت کرنے سے گریز کرتے ہیں۔اس نتیجہ میں کشمیر ملی جلی تہذیب نہ بن سکی۔ یہاں کا رہن سہن، کھانا پینا،لباس، زیورات اور رسومات وغیرہ پورے ہندوستان میں ہی نہیں تقریباً پوری دنیا میں ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ جس کے کئی پہلو یہاں کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں پیش کیے ہیں۔

جموں وکشمیر ہمیشہ سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ملکی سطح پر ادب میں وقتاً فوقتاً جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہی، ان کا اثر ریاست جموں وکشمیر پر بھی پڑا۔اگرچہ یہاں افسانہ نگاری کا آغاز

رومانی انداز سے ہوالیکن رفتہ رفتہ لکھنے والوں کے فن میں پختگی آ گئی اور وہ اپنے افسانوں میں حقیقی زندگی کی عکاسی کرنے لگے۔ ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کا آغاز کب اور کس افسانہ نگار سے ہوا یہ بات آج بھی زیرغور ہے۔اس تعلق سے پروفیسر عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر برج پریمی کی تحریریں حرف اول کا اعزاز رکھتی ہیں۔مگران کے یہاں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔وہ کوئی مستند رائے قائم نہیں کر پاتے ہیں۔تاہم یہ بات قابل تسلیم ہے کہ پریم ناتھ پردیسی نے ریاست میں باقاعدہ طور پراردوافسانے کا آغاز کیا۔اگرچہ ان سے پہلے بھی یہاں کئی افسانے لکھے گئے۔جن کے لکھنے والوں میں محمد دین فوق، ہرگو پال خستہ، چراغ حسن حسرت اور تیرت کاشمیری کے نام شامل ہے۔لیکن پردیسی کے افسانوں کی اہمیت وافادیت کا انداز اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔کہ ان کے افسانے فنی اور تکنیکی اعتبار سے مکمل، ملک کے مشہور ومعروف اور معیاری جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔اس بِنا پر انھیں ریاست کا پہلا افسانہ نگار قرار دیا جاتا ہے۔

پریم ناتھ پردیسی کا جنم ۱۹۰۹ءکو فتح کدل سرینگر کشمیر میں ایک پنڈت گھرانے میں ہوا۔تعلیم وتربیت کشمیر میں ہی ہوئی۔تعلم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۷ءتک محکمۂ کسٹمز سے وابستہ رہے۔اس کے بعد آخر تک ریڈیو کشمیر میں کام کرتے رہے اور ۹ جنوری ۱۹۵۵ء میں انتقال کر گئے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ڈوگرہ عہد میں شاعری سے کیا۔لیکن بہت جلدی افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوکر ان کی پہلی کہانی ”سچی پراتھنا“ روزنامہ ”رنبیر (۱۹۳۲)“ میں جموں سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کا یہ سلسلہ رواں دواں جاری رہا۔ ان کے تین افسانوی مجموعے ”دنیا ہماری (۱۹۴۰)“، ”شام وسحر (۱۹۴۱)“ ان کی وفات کے بعد ”بہتے چراغ (۱۹۵۵)“ اور ایک ناول ”پوتی“ شائع ہو چکے ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں کے موضوعات کشمیری ہیں۔انھوں نے بطور خاص کشمیریوں کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ان کے یہاں کشمیری زندگی کی تہذیب وتمدن، غربت،

بیروزگاری، ظلم جبر، تقسیم وطن، لوٹ مار کی سچی اور صحیح عکاسی ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں کھیت کھلیان، برف پوش پہاڑ، سر بفلک درخت، کشمیری رسومات اور رہن سہن جلوہ نما ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں اکثر و بیشتر کشمیر زبان کے الفاظ، ہتہ بی، ماج ویتھ، عزیز، سماوار اور کانگڑی وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔ سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''پردیسی کو کشمیر کی زندگی، تہذیب اور روایات سے محبت تھی اور ان ہی کو وہ اپنے افسانوں میں پیش کر کے عام انسانوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ یہی ایک افسانہ نگار اور انسان کی حیثیت سے ان کی بڑائی ہے''[۱]

پریم ناتھ پردیسی کشمیری عوام کی دلی تمناؤں اور اُمنگوں کو محسوس کرتے اور روانی کے ساتھ پیش کر کے قاری کا تجسس برقرار رکھتے ہیں۔ ان کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ بیرون ریاست کے سیاح اور ادیب کشمیر کے صرف ایک ہی پہلو ''خوبصورتی'' کو دیکھتے ہیں۔ یہاں کی عوام کئی مشکلات سے دوچار ہے اس بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دے رہا ہے۔ اس نقطے کو ابھارنے کے لئے انھوں نے اپنے فن کو آگے بڑھایا۔ بقول سہیل عظیم آبادی:

''پردیسی کی زندگی کشمیر کے لئے تھی۔ ان کا فن کشمیر کے لئے تھا۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اور ان کے افسانوں کا ایک ایک لفظ اسی حقیقت کا شاہد ہے۔''[۲]

کشمیر کی عورتیں اپنی تہذیب کی پابند رہتی ہیں۔ کسی غیر مرد کے ساتھ بات تک کرنا خلاف تہذیب سمجھتی ہے۔ جس کی ایک جھلک پردیسی نے افسانے ''دھول'' میں پیش کی ہے۔ اس افسانے کا کردار ایک عورت جو ہمیشہ اپنے بیمار شوہر کی خدمت کرتی ہیں۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جس پر ہمیشہ اس کا شوہر اسے طعنے دیتا رہتا ہے۔ وہ کہتا رہتا ہے ایک بچہ ہوتا تو چار پیسے کما کے لاتا۔ تم ٹھہری بانجھ عورت تم سے بچہ کہاں ہوگا۔ ان طعنوں سے تنگ آ کر اس نے پانچ روپیوں کے خاطر ایک انگریز سیاح سے تصویر کھچوائی تا کہ نرس کے پاس جا کر اپنا علاج کرا سکے اور ایک بچہ پیدا ہو۔ پھر جب

اس کی یہ تصویر اخباروں میں چھپ کر سامنے آئی تو سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی۔اس بات کی خبر اس کے شوہر تک پہنچی اور وہ اسے بہت ناراض ہو گیا۔ بظاہر تو اُس نے کوئی بُرا کام نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ وہ غریب تھی اس کے پاس پیسے نہیں تھے جس سے وہ اپنا علاج کراتی۔لیکن پھر بھی وہ اپنی تہذیب کے خلاف قدم اُٹھا کر خود کو بہت بڑا مجرم سمجھتی ہے۔اس کا شوہر خوش ہونے کے بجائے اسے اور بھی طعنے دے کر ملامت کرتا ہے۔اقتباس:

''اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔وہ آنسو جو طعنے سُن سُن کر بھی اتنے تلخ نہ ہوئے تھے۔آج کے آنسوؤں میں دُھوئیں کی سی کڑواہٹ تھی تیزاب کی سی جلن اور زہر کی سی تلخی، خاوند اُس کے آنسوں دیکھ کر بھڑک اُٹھا بولا اب روتی کیا ہو جو ہونا تھا ہو چکا اُس صاحب نے تمہاری تصویر ہی نہ لی بلکہ تمہاری عصمت پر بھی تھوکا تمہارے خاندان پر تھوکا۔تمہاری نسائیت اور تمہاری زندگی پر تھوکا اور یہ تھوک ایسی ہے جو زندگی بھر تمہارے بدن سے الگ نہ ہو گی، اب جو چاہو کرو۔کیا تعجب ہے جو کچھ تمہارے پیٹ میں ہے وہ بھی کسی صاحب کا''[۳]

پریم ناتھ پردیسی نے افسانے ''کتبے'' میں کشمیر کے ہاوس بوٹوں میں رہنے والے لوگوں کی تنگ دستی اور حسین پہاڑوں کے دامن میں رہنے والے لوگوں کا تقابل کر کے کشمیر کے رہن سہن کو نمایاں کیا ہے:

''وہ جنگلے کا سہارا لے کر بہتے دریا کو دیکھنے لگا۔جھونپڑیوں اور بنگلہ نما مکانوں سے بنی ہوئی آرام وادی کی بستی تھی۔دریا کے کنارے ہوس بوٹ، کچن بوٹ اور شکارے تھے۔اور اُن سے پرے ماہی گروں کے جال دُھوپ میں پھیلے ہوئے۔ہوس بوٹوں میں یہ لوگ کیوں کر رہ سکتے ہیں؟ وہ سوچنے لگا۔''نہ صحن نہ باغ نہ گھومنے کی جگہ یہ بھی کیا زندگی ہے کہ بیس فٹ لمبی اور آٹھ فٹ چوڑی کشتی میں قیدیوں کی طرح رہو''۔

اُسے اپنا گھریاد آ گیا۔ اوڑی سے نیچے سلام آباد میں پہاڑیوں کے دامن میں وہ کتنا حسین دکھائی دیتا تھا۔ آگے باغ اور پیچھے جھاڑیوں سے بھرا ہوا جنگل۔''۴؎

کشمیر میں شادی بیاہ کا پورا انتظام گھر میں ہی کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے کوئی شادی خانہ کرایے پر نہیں لیا جاتا ہے۔ خاندان کے تمام رشتہ دار اور دوست احباب کو دعوت دی جاتی ہے اور سب مل جل کر ایک ہی گھر میں خوشیاں بانٹتے ہیں۔ بارات کا استقبال کرتے ہیں۔ عورتیں دو قطاروں میں کھڑی ہو کر کشمیری زبان میں گیت گاتی ہے۔ دُلہا اور دلہن کے سر پر پیسے، اخروٹ، بادام، میٹھائی اور شیریں وغیرہ پھینکے جاتے ہیں۔ ان ہی رسومات کو پردیسی نے افسانے ''ٹیکہ بٹن'' میں پیش کیا ہے:

''وہ اُوپر دیکھتی ہے جہاں دُلہن کا سنگار ہو رہا ہے اور رنگا رنگ پوشاک میں ملبوس پنڈتانیاں کھڑکیوں میں ایک دوسرے کے اُوپر جھکی ہوئی دُولھا کو دیکھ رہی ہیں اور وہ دِن یاد کر رہی ہیں جب اُن کا دُولھا بھی اس طرح آنگن میں منڈل پر کھڑا تھا اور مسلمان عورتیں ایک کونے میں گا رہی تھیں۔

سڑکن وتھرے مُشلہ کوفورو — عشقہ بمبُورولیلہ آکھو

...... پگلی اب دُولھا اور دُلہن کے سر پر پیسے اور روپیئے، آنے اور دونیاں پھینکی جائیں گی جتنی ہاتھ آئیں، اٹھانا''۔۵؎

پردیسی نے کشمیر کو ہر زاوئے سے دیکھا اور اس کو اپنی کہانیوں پیش کیا۔ جہاں انھوں نے کشمیری رہن سہن، رسومات، غربت وغیرہ کو پیش کیا وہی کشمیر کے خوبصورت مناظر بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئے ہیں۔ جن کو دیکھنے سیاح ہر موسم میں دور دراز سے آتے ہیں۔ چاہئے موسم بہار کے حسین نظارے ہو یا موسم سرما کی شدت بھری سردی میں برف سے ڈھکی وادی، جو بے حد خوبصورت نظر آتی ہے۔ اس کی منظر کشی بھی پردیسی نے افسانہ ''پھسلن'' میں اس طرح کی ہے کہ

برف پوش وادی پیکر بن کر آنکھوں کے سامنے نظر آتی ہے:

''جونز اور بالغور بھی دروازے سے نکل کر برآمدے پر آ گئے جس کے جنگلے کے کنارے کنارے برف کی سفید لکیر چمک رہی تھی۔ نیچے میدان میں برف ہی برف تھی مکان اور مکانوں کی جُھکی جُھکی چھتیں، درخت اوران کی چوٹیاں، میدان اوران کے نشیب وفراز۔ پہاڑ اوران کی گھنی چھائیاں سب برف میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آسمان پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ اور ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے گلمرگ خاموش موت کی سفید وادی ہے۔ مکان پہاڑ درخت اسی وادی کی منجمد لاشیں ہیں''۔ ۶؎

پردیسی کے افسانوں میں کشمیری تہذیب اور روایات کی ایک تاریخ سمٹی ہوئی ہے۔ یہاں کی برسوں پرانی روایت ہے کہ گھر میں مرغے پالے جاتے ہیں جن میں مرغا اکثر صبح سویرے بانگ دیتا ہے اور لوگ مرغ کی بانگ سن کر اپنے وقت پر بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کانگڑی کشمیر تہذیب کی ایک شناخت ہے۔ اگر چہ یہ سردی سے محفوظ رہنے کے لئے ہیں تب بھی لوگ اسے کئی طرح سے استعمال میں لاتے ہیں۔ مثلاً سردی کے موسم میں لوگ اسی پر کپڑے سوکھاتے ہیں اور کبھی کبھی تھوک دان کا کام بھی اسی سے لیتے ہیں۔ اسی کی ایک مثال پردیسی نے افسانے ''نئی صبح'' میں یوں بیان کی ہے:

''بڑھیا نے تھوڑی دیر رک کر پُوچھا۔ ''کیا وقت ہوگا مُرغ نے بانگ دی؟'' .... بڑھیا لیٹ گئی، کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے سکوت چھایا رہا۔ سیماں نے اُٹھ کر کانگڑی کا بلغم دُھول سمیت دریچہ سے باہر پھینکا۔ معاً اُس کی نظر رادھا کے اُجڑے مکان کی طرف اُٹھی جس کی چھت پر اخروٹ کا ایک لنڈ منڈ بوڑھا درخت جھکا ہوا تھا اوراسی وقت ایسا نظر آ رہا تھا جیسے اس پر بھی غیر تسلسل کھانسی کا دورہ پڑا ہے............ ''ڈر گئی تھی؟'' بڑھیا کے تھرتھراتے ہوئے الفاظ میں خوف تھا۔ ''تین بار

تھوکواور دریچہ بند کروں۔ کیوں کھول دیا تھا'' ے

پردیسی نے یہاں اس نقطے کو بھی ابھارہ ہے۔ جب کشمیر پر افغانوں نے حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں بہت سے لوگ مارے گئے اور کچھ گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ اس لئے سیماںؔ رادھا کے خالی مکان کو بہت دیر تک دیکھتی رہتی ہے۔ جو اس حملے میں اس سے بچھڑ گئی تھی۔ پھر جب سیماںؔ ڈر جاتی ہے تو ماں اس کو تین بار تھوکنے کو اس لئے کہتی ہے تا کہ اس کے ساتھ کوئی بھوت پریت کا سایہ اندر نہ آ جائے۔ یہ روایت کشمیر میں بھوت کے تعلق سے رائج ہے۔

کشمیر میں آج سے بیس سال پہلے سفر کرنے کا بہترین ذریعہ ''ٹانگہ'' تھا۔ اب چونکہ اس کی جگہ گاڑیوں نے لی ہے تاہم آج بھی کہیں کہیں پر اس کا رواج قائم ہے۔ اس طرح کے کئی سارے کشمیری تہذیب وثقافت کے مٹتے نقوش کو پردیسی نے ضبط تحریر میں لایا ہیں۔ سردیوں میں لوگ حمام کا استعمال کرتے ہیں۔ جس کا اہتمام گھروں کے بجائے مسجدوں میں زیادہ کیا جاتا ہے۔ کشمیر کی تقریباً ہر مسجد میں یہ پایا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگ سماوار کی چائے کافی دیر تک پیتے رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ بات چیت کا سلسلہ رواں دواں جاری رکھتے ہیں۔ اس کشمیری ماحول کو پردیسی نے افسانے ''جھنجھنا'' میں یوں اجاگر کیا ہے:

> ''لال پور کے اڈے پر صرف ایک ٹانگہ کھڑا تھا۔ کوچوان اور گھوڑا دونوں فروری کی سردی سے اکڑ گئے تھے، سڑک کے کناروں پر جمی ہوئی برف کی کئی تہیں تھیں جن پر طرح طرح کے نقوش اُبھر آئے تھے۔ پاس کی مسجد میں درود خوانی ہو رہی تھی اور حمام کے بدرو سے بھاپ اُٹھتا ہوا پانی منجمند نالیوں میں بہہ رہا تھا............تھوڑی دیر بعد سماوار اُبلنے لگا پھر باتیں ہونے لگیں۔ شہر کی، لوگوں کی، حکومت کی، کنٹرول کی، قیمتوں کی، برف اور سرد ہواؤں کی، غرض کوئی مسئلہ موضوع گفتگو بننے سے نہ رہا۔'' ۸ے

پردیسی کو کشمیر کے عوام سے بہت ہمدردی تھی۔ وہ ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔

جس کا احساس ان کی کہانیوں سے ہوتا ہے۔ ان کی کہانیاں انسان دوستی، محبت پرستی، آپسی بھائی چارے اور امن پسندی پر مبنی ہیں۔ ان کے کردار امن پسندی کے مجسمے نظر آتے ہیں۔ جس کی عمدہ مثال کہانی ''بہتے چراغ'' کا کردار ''ملہ قادر'' ہے جو اپنی کشتی میں سیاحوں کو کشمیر کے ماضی کی امن اور محبت بھری کہانیاں سناتا ہے:

''اس دوران میں ملہ قادر پر پھول اور اس کی بیوی کی زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا۔ وہ انہیں ہر شام کشمیر کے ماضی کی کہانیاں سُناتا۔ بڑشاہ اور للتادتیہ کی کہانیاں، ملہ عارفہ اور شیخ العام کی کہانیاں حبہ خاتون اور ارنہ مال کی کہانیاں۔ وہ کہانیاں جن میں محبت ہی محبت اور امن ہی امن ہے۔ چنانچہ ساٹھ سال بوڑھا ہانجی بھی انہیں اُوپر سے نیچے تک امن اور محبت کا مجسمہ دکھائی دے رہا ہے۔''[9]

اس طرح پریم ناتھ پردیسی نے کشمیریوں کے مسائل کو کشمیری تہذیب کے پس منظر میں نہایت خوبصورتی اور فنکارانہ انداز سے پیش کیا۔ جس بنا پر ہم انھیں کشمیری تہذیب کا علمبردار کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے کشمیر کے تہذیبی پیرائے میں بھوک، افلاس اور استحصال سے بلکتی زندگیوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔ جنھوں نے ظلم وتشدد کے کئی دور دیکھے جس کی باقیات آج تک ان کے امن سے جڑی ہے۔

پریم ناتھ در ۲۵ر جولائی ۱۹۱۴ء میں سرینگر کشمیر کے ایک پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم لاہور سے حاصل کی۔ پھر آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہونے کے بعد ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا۔ ۱۹۷۷ء میں اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ پریم ناتھ در کا پہلا افسانہ ماہنامہ ''ادبی دنیا'' (لاہور) میں شائع ہوا۔ ان کے تین افسانوی مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ جن میں ''کاغذ کا واسدیو (۱۹۴۹)'' اور ''نیلی آنکھیں (۱۹۶۰)'' ان کی زندگی میں شایع ہوے۔ ''چناروں کے سایے میں'' ان کی موت کے بعد جی آر حسرت گڈھ نے ۱۹۹۱ء میں ترتیب

دیا۔جس میں ان کے چنندہ افسانے شامل ہیں۔ پریم ناتھ درکا نام اُردو افسانے میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ان کا شمار صفحہ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کو اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔ کشمیر سے باہر رہ کر بھی کشمیریت ان کی نس نس میں بسی تھی۔ وہ کشمیر کے ذرّے ذرّے سے واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیری تہذیب و ثقافت کی بھرپور ترجمانی کی ہیں۔ جی-آر-حسرت گڈھ لکھتے ہیں:

''پریم ناتھ در اپنے ثقافتی ورثے کو ساتھ لے کر ہی ترقی پسند تحریک کے لئے کام کرتے تھے۔ان کا کہنا ہے کشمیر کے شاندار ثقافتی ماضی کو میں فراموش نہیں کروں گا جس ثقافتی ماضی کی چھاپ برصغیر کی تاریخ پر چھائی ہوئی تھی۔'' ۱۰؎

در کو منظر کشی میں کمال حاصل تھا۔انھوں نے ''نیلی آنکھیں'' افسانے میں جھیل ڈل کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ جھیل ڈل کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ جفاکش کسان کی مجبوری جو کُھر درے تختوں سے اپنے لئے ایک چھوٹی سی کشتی تیار کرتا ہے اور ڈل میں رہنے والے بڑے بڑے شکارے بھی پیش کئے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''یوں تو آسمان کا آسمان اتنا صاف تھا۔جیسے ڈل میں اُتر کر مُنہ دھو کے ابھی ابھی اوپر چلا گیا ہو۔اور لگتا بھی تھا کہ ڈل اور اس کے آسمان میں کوئی بات ضرور ہے۔کیونکہ دیکھتا ہوا آدمی اس وقت یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ ڈل کی نیلاہٹ اپنی ہے کہ آسمان کی۔اتنی ہوا سے ہی پانی کے ہموار پھیلاؤ میں سلوٹیں پڑ گئی تھیں اور اضطراب کی سفید چمک میں بھی نیلاہٹ کی گہرائی اُبھرتی تھی۔

حُسنِ جمود کے تماشائی اپنی اپنی کشتیاں نیم جان نالوں کی طرف نکال چکے تھے اور ڈل کا پانی بھاری بھاری پہاڑوں کے عکس کو رقص میں لا چکا تھا۔کشمیر کی ایک ایسی چھوٹی کشتی اُبھر آئی۔جس پر نہ چھت ہوتی ہے نہ

بیٹھنے کا آرام۔ کشمیری شکارے کے سامنے ایسی کوکشتی بھی نہیں کہا
جاسکتا۔ شکارے کے ساتھ اس کا کیا مقابلہ! شکارے ایک کشش کو لے
کے چلتے ہیں۔ پردوں، گدوں، اسپرنگوں کی لوریاں لیکر، شائستہ سیاحوں
کے لئے پُر ذوق شیدائیوں کے لئے تھکے ہوئے انسانوں کے لئے اور
یہ چیز تو ڈل کی محض سبزیاں اٹھانے، مچھلیاں لیجانے کو، پانی کا پڑوسی،
جھیل کا جفاکش کسان کُھر درے تختوں سے بنالیتا ہے اور کم بخت اسکے
سروں پر نوک تک نہیں رکھتا۔'' [۱۱]

در کے اکثر افسانوں میں کشمیری ماحول نمایاں طور پر جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کشمیری معاشرے کی تصویر کشی کرنے میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ، کردار، موضوع اور ماحول کشمیری ہے۔ ان کے یہاں کشمیری زبان کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ مثلاً کینہ بوب (دریائی پھل)، ہل (زیر آب پودہ)، شیشر گانٹھ، کانگڑی، سماوار وغیرہ تک کا ذکر کیا ہے۔ جی-آر-حسرت گڈ اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''در کی کہانی پڑھ کر کشمیر کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت سبحان، عزیزہ،
رحمان، رام جو اور گنوتی کی بیکسی اور جسوری کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور
فکر مند ہوتے ہیں کہ کشمیر کے تمام افراد ترقی اور خوشحالی کی زندگی بسر
کریں۔'' [۱۲]

انھوں نے کشمیری تہذیب وثقافت کے پوشیدہ نقطوں کو بھی اُبھارا ہے۔ وطن پرستی اور غریب ومعصوم عوام سے اظہارِ ہمدردی ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ کشمیر کے قدرتی حسن و جمال اور یہاں کے تہذیب وثقافت کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ اسی خوبصورتی کے ساتھ یہاں کے عوام کا ذریعۂ روزگار بھی جڑا ہے۔ جس کو در نے اپنے افسانہ ''گیت کے چار بول'' میں پیش کیا ہے۔ اس کہانی میں ایک غربت اور افلاس زدہ محنت کش کسان دوردراز پہاڑوں سے برف اٹھا کر شہر کے برف فروشوں کو بیچ دیتا ہے اور یہ خودغرض شہری میٹھی زبان میں ان کسانوں کا استقبال

کر کے سستے داموں میں برف خرید لیتے ہیں۔اسی پیشہ کی ایک جھلک یوں دیکھی جاتی ہے جب افسانے میں ایک کسان برف بیچتاہے اور اونچی آواز میں کشمیری زبان میں گیت گاتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''چنانچہ جفاکش کسان گہرے سانس لیتے ہوئے۔شہریوں کے خاطر پہاڑوں سے برف بھی جمع کرتے ہیں اور دو دو ڈھائی ڈھائی من کے بوجھ گھاس میں لپیٹے، پیٹھ پر اُٹھائے شہر سرینگر میں لے آتے ہیں۔شہر کی سرحدوں پر شہری برف فروش انکا انتظار کرتے ہیں۔ پھر اس ٹوکری کو اپنی سفید پگڑی پر رکھ کر یہ برف جیسا برف فروش جھوم جھوم کر گلیوں کی طرف چل پڑتا ہے۔کشمیری کی برف تو آسمان سے آتی ہے،جس میں نہ تو شیشے کی وہ کاٹتی ہوئی چمک ہوتی ہے نہ تیزی۔ نہ اس میں وہ سختی ہوتی ہے کہ اسے لمبی لمبی کیل اور بڑے ہی توڑ دیں۔اس برف میں تو چاند کی نرم نرم روشنی ہوتی ہے۔ جب دو پہر کے تیز دھوپ میں بھی وہ گلی میں گُھستا ہے اندر دبکے ہوئے کشمیری ہلکے سانس لینے لگتے ہیں۔ کیونکہ اس کی آواز اور اس کا گیت اس کی برف سے بھی ٹھنڈا اور شفاف ہوتا ہے۔

''واہ یخ۔واہ یخ،ہائے کمہ ونہ وولمک یخو۔''

اے یخ تو نعمت ہے،تو خوشی ہے،دیکھ کتنی کھٹن چوٹیوں سے تجھے اتارا۔

''گنہ دور گریو یخو۔''

سن میری یخ۔اب جو تو میرے پاس ہے میں تیرے لئے کیا کیا نہ کروں گا، تجھے بالیاں بھی بنوادوں گا، ہاں بالیاں بھی بنوادوں گا۔

''ہائے تریشہ دادہ مور تھس یخو۔''

اے یخ تو ظالم بھی تو ہے،تم نے میری پیاس بڑھائی پھر پیاسا مارا۔

''ہائے اندری گُلخو یخو۔''

لیکن یخ تو بھی تو چپکے چپکے پگھل رہی ہے!''[۱۳]

پریم ناتھ در کو کھانا بنانے میں مہارت حاصل تھی۔ وہ شوق سے دوستوں کو کھانا بنا کر کھلا تے تھے اوران کے دوست واحباب بھی اکثر کسی بہانے کی تلاش میں رہتے تھے کہ کب پریم ناتھ در کا بنایا ہوا کھانا نصیب ہو۔ ان کے افسانے پڑھ کر بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کشمیری پکوان سے بھی پوری طرح واقف تھے۔جس کا ذکر اکثر جگہ ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔کشمیری وازوان سے بھی ان کو کافی دلچسپی تھی۔جس کے نام انھوں نے اپنے افسانوں میں گنوائے ہیں اور ساتھ ساتھ کشمیری برتنوں کا بھی ذکر کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''غرض اب بابو رام کے ٹھاٹ تھے اس نے الغاروں کو فتے ہی نہیں کھائے ''کبرگاہ'' ''طبق ناٹ'' ''گوشتابہ'' ''شفتہ'' سینکڑوں ہی نئے ناموں کے نئے رنگوں کے نئی نئی لذّتوں کے گوشت چکھے۔۔۔۔اندر سے ایک آدمی چائے کا ''سماوار'' لئے آیا۔ وہی بھاپ کی گھٹائیں نکالتا ہوا۔ الائچی ، دارچینی اور چائے سبز کی متوالی گھٹائیں، وہی کشمیری ''سماوار'' اور کانسی کی کونڈے نما کٹوریاں۔''[۱۴]

کشمیری ''سماوار'' جس کا ذکر در نے کیا ہے یہ کشمیری تہذیب وثقافت کا خاص ورثہ ہے۔ جو تابے کا ہوتا ہے۔کشمیری کاری گری کا یہ ایک بڑا نمونہ ہے۔کشمیر کے لوگ چائے ،قہوہ اسی میں بناتے ہیں۔اس میں چائے کافی دیر تک گرم بھی رہتی ہے اور لذیز بھی بن جاتی ہے۔اس میں کوئلہ ڈال کر چائے تیار کی جاتی ہے۔ اب اس کی جگہ ''کٹل'' نے لی ہے۔اس کا رواج بھی دھیرے دھیرے ختم ہوتا جا رہا ہے۔مگر پھر بھی لوگ اس کو گھروں میں سجائے رکھے ہیں۔

در نے جو دعوا کیا ہے کہ کشمیری شاندار ثقافتی ماضی کو کبھی فراموش نہیں کرے گے۔ بالکل اس دعوے کو پورا بھی کیا ہے۔انھوں نے کشمیری تہذیب وثقافت کو اپنے افسانوں میں ہمیشہ کے لئے زندہ رکھا ہے۔چھوٹے سے چھوٹے نقطے کو بھی بڑی باریکی سے اُبھارا ہے۔کشمیری لباس جو کشمیر کی پہچان ہے۔شاید ہی اب یہ لباس کشمیر کے بزرگ لوگوں تک ہی محدود ہے۔ پریم ناتھ در نے ''نیلی آنکھیں'' افسانے میں اس کی تصویر کھینچ کر اس کو محفوظ کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس نے اپنے پھیرن کے چوڑے آستین جو کہنیوں سے اوپر الٹے ہوئے تھے کھول دئیں اور باہنوں کو ڈھک دیا۔اس نے اپنے دوپٹے کی گانٹھ کھولا اور دوپٹہ اسکے کانوں پر سے ہوتا ہوا اسکے کندھوں پر ڈھلک آیا۔'' ۱۵ؔ

پھرن یہاں کی شان ہے اور پہچان بھی۔ یہاں کے لوگ کتنا ہی اس کو نظر انداز کریں مگر سردی کا موسم آتے ہی سب کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور اس کو بڑے ناز ونکھروں سے سلوا تے ہیں۔ سردی سے محفوظ رہنے کے لئے یہ سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کانگڑی کے ساتھ اس کا چولی اور دامن کا رشتہ ہے۔ دونوں ایک ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں۔ سردی کے موسم میں آدمی چاہے بند کمرے میں رہے یا برف سے بھرے کھلے میدان میں، ان دونوں کو فراموش نہیں کرسکتا ہے۔

در نے افسانہ'' کاغذ کا واسدیؤ'' میں برف کا پرکشش منظر پیش کر کے کشمیری تہذیب وثقافت کا نقشہ کھیچا ہے۔ کشمیر کی برسوں پرانی روایت کو زندہ کیا۔ جب پہلی بار برف باری ہو جاتی ہے تب خوشی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور لوگ ایک دوسرے کو پہلے برف دیکھنے کی اطلاع دیکر بازی مار لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ غریب عوام کس طرح بڑی بہادری سے ہنسی خوشی اس بھاری برف کا سامنا کرتے ہیں۔ نہ مرنے کا ڈر اور نہ پھسلنے کا خطرہ رہتا ہے۔ سب لوگ مل کر خوشی خوشی ایک دوسرے پر قہقہے مارتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جب رات کو پہلی برف دبے پاؤں آ گئی۔ جب چپکے چپکے برف کے ڈھیر لگ گئے۔ چپہ چپہ سفید ہو گیا اور گرم لحافوں میں سوتے ہوئے دیہاتوں کو خبر تک نہ ہوئی ان کو برف کے سپنے تک نہ آئے، گاؤں میں روایت تھی کہ جو برف کو پہلے دیکھتا اور اس کا اعلان کرتا وہ برف کی بازی جیتتا تھا۔ گاؤں والے اس کے سامنے ہار مان لیتے۔ سال بھر اس کی جیت زندہ رہتی، جب تک زمین کروٹ نہ بدلتی۔ پھر کھڑکی کے پاس تینوں نے مل کر برف کے نعرے بلند کئے۔

''شینہ پتو پتو ماما یتو یتو''

(برف کے گالے آ تا جا کتوں کے ماموں تو بھی آ)

یہ تو تھا اس دن کا آغاز۔ یہی ایک دھڑکن نہیں تھی جو یہ برف گاؤں لے آئی۔ دیکھتے دیکھتے پھوس کی چھتوں پر بھوت کھڑے ہو گئے۔ عالم گیر سفیدی کے پس منظر میں چیتھڑوں میں لپٹے لپٹائے کسان بیلچے، ایک ایک ہاتھ میں من من برف گرانے لگا اور ایک دھڑام پر بچوں کے نعرے بلند ہوئے۔ کہیں بلی پھاندی پھنس گئی کہیں کتا دوڑا دھنس گیا، کہیں ٹہنی بلی برف کی چادر گری اور کسی کے سر پر آ گئی کوئی لڑھکا، کوئی پھسلا جس نے دیکھا اُسی کے قہقہے نہ رکے۔''۱۶

قدرت اللہ شہاب کی ولادت ۱۹۲۰ء کو جموں میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مشن اسکول سرینگر میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ وہاں سے ایم۔اے انگریزی کرنے کے بعد تقسیم ملک سے پہلے ہندوستان میں کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ تقسیم ملک کے بعد ہمیشہ کے لئے پاکستان جا بسے۔ ۱۹۸۶ء میں دل کا دورہ پڑنے سے ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سو گئے۔ ان کا پہلا افسانہ ''چندراوتی'' ۱۹۳۸ء کو میگزین ''رومان'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے بیشتر افسانے مشہور جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ جن کو ۲۰۱۲ء میں جوہر قدوسی نے ''ماں جی' یا خدا اور دیگر کہانیاں'' کے عنوان سے مرتب کیا۔ اس کے علاوہ ان کی خود نوشت ''شہاب نامہ'' بہت مقبول ہوئی۔ ۱۹۶۸ء میں انھیں ستارہ پاکستان کے اعزاز سے بھی نواز گیا۔

قدرت اللہ شہاب نے بھی افسانوی ادب میں نام کمایا ہے۔ ان کے افسانے تقسیم وطن سے برپا مسائل، غربت اور ریاست پر ڈوگروں کے مظالم وغیرہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ''یا خدا'' تقسیم وطن سے برپا ہونے والے فسادات پر لکھا گیا ان کا مشہور افسانہ ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار دلشاد ایک جوان عورت ہے جو ملک کے مختلف ریاستوں میں ہجرت کر کے ہر جگہ طرح طرح کے

مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کی زندگی اُجڑ کے رہ جاتی ہے۔اس افسانے میں ملک کے بگڑے حالات کے ساتھ ساتھ کشمیر پر ہونے والے ظلم و بربریت کی کہانی بھی بیان کی ہے۔ڈوگروں نے کشمیر میں مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔لوگ ظلم وستم کی چکی میں پس رہے تھے۔کشمیر کی جنت میں دوزخ کے شعلے بھڑک اُٹھے تھے۔لوگ دور دراز علاقوں کی طرف ہجرت کر رہے تھے اور اپنے وطن کی یاد میں آنسوں بہا رہے تھے۔کشمیر کے میٹھے پانی کو یاد کرتے جس کا رنگ نیلا اور سبز ہے۔اسی کی مثال کشمیر کی ایک اندھی لڑکی پیش کرتی ہے۔جس کی آنکھیں ڈوگروں نے مسمار کر دی تھی:

''کشمیر کی اندھی دوشیزہ سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگی ایک گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔جب لہروں کے تلاطم پر کشش کا سینہ ڈگمگا تا تو اسے اپنا ہلکا شکارا یاد آتا، جو اسی طرح ڈل اور ولر کی نازک لہروں پر تھر تھرایا کرتا تھا۔پہلے دن جب اس نے سمندر کا چلو بھر پانی پیا تو اُسے قے آ گئی......اُف! کتنا کڑوا پانی تھا۔ڈل کا پانی تازہ دودھ کی طرح میٹھا تھا اور چشمہ شاہی کا پانی...... ہائے جیسے دودھ اور مکھن اور شہد کو برف میں لگا کر پیا جائے وہ چاہتی تھی کہ ایک بار اس کڑوی جھیل کو بھی دیکھے کہ اس کا پانی کالا ہے یا سرخ؟ نیلا ہے یا سبز۔'' [۷۱]

اس افسانے میں شہابؔ کشمیری لڑکیوں کے حُسن کا بھی ذکر کرتے ہیں۔جس کا ذکر اکثر کتابوں، تقریبوں اور محفلوں وغیرہ میں ملتا ہے۔مگر یہ حسن ان کے لئے کبھی خطرناک بھی ثابت ہو جاتا ہے۔جس کی عمدہ مثالیں اخباروں کی زینت بن کر روپوش ہو جاتی ہے۔یہاں کئی عورتوں کی عصمت دری ہوئی اور کئی لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔اس کی طرف کبھی کسی نے بھی دھیان نہیں دیا۔غرض یہ حُسن کشمیریوں کی ایک پہچان ہے جس کی تصویر شہابؔ نے کشمیری پھلوں اور پھولوں کو تشبیہ دیکر لفظوں میں قید کی ہے:

''لیکن خوشی محمد میں شاعری کی روح حلول کر آتی تھی۔ اس نے چٹخارے لے لے کر کشمیر کی نازک بدن، سیم تن عورتوں کا ذکر سنایا۔

خوبصورت رنگین، گلعذار عورتیں......جن کے گالوں میں سیب ہوتے
ہیں۔ چھاتی پر ناشپاتی، ہونٹوں پر انگور کا رس، آنکھوں میں ڈل کی لہروں
پر رمصندہ کنول، گلے میں پہاڑی جھرنوں کا سرود، انگ انگ میں
گلاب اور موتیے کی رنگت زعفران کی بھینی بھینی مہک۔'' ۱۸

''پھوڑے والی ٹانگ'' کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی ہے۔ جموں سے کشمیر کا سفر اور اس سفر کے درمیان مختلف مناظر پہاڑی جھرنے، پہاڑی ڈھلوانوں پر چرتی بکریاں اور تیڑھی پگڈنڈیاں، وغیرہ نظر آتے ہیں۔ موسم گرما میں لوگ قطار در قطار کشمیر کے آب وہوا سے لطف انداز ہونے کے لئے آتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں میں ایک پروفیسر کشمیری پنڈت اپنی بیوی سمت سفر کر رہا تھا۔ اس کی بیوی کشمیری تہذیب وثقافت کی ایک پیکر ہے۔ اس کا لباس، طور طریقے اور حربے وغیرہ کشمیری عورت ہونے کی ایک مثال پیش کرتے ہے۔ اس نے قے کرنے کے لئے راکھ سمت ایک کانگڑی بھی اپنے ساتھ لائی ہے:

''پنڈتانی نے سفید لٹھے کا فرن پہنا ہوا تھا جو یکسائی راہباؤں کے
لبادے کی طرح ٹخنوں تک آتا تھا۔ پاؤں میں لکڑی کی کھڑادیں تھیں۔
سر پر گہرے سرخ پشمینے کی خوبصورت چادر تھی......ہونٹوں پر اخروٹ
کے چھلکے کی سرخی، سبز اور نیلے ابرک سے منڈھی ہوئی ایک کانگڑی تھی۔
اس میں وہ گھر سے راکھ بھر کے لائی تھی تاکہ بانہال سڑک کے موڑوں
پر جب اس کا جی متلائے تو وہ آسانی سے اس میں قے کر سکے۔'' ۱۹

ٹھاکر پونچھی ۱۹۲۲ء میں ضلع پونچھ جموں میں پیدا ہوئے۔ مٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے جموں چلے گئے۔ وہاں بی۔اے کرنے کے بعد کچھ مدت تک سرکاری ملازمت کرتے رہے۔ پھر ریڈیو جموں سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۴اگست ۱۹۷۳ء کو ایک حادثے کا شکار ہو کر انتقال کر گئے۔ انھوں نے اردو ادب کو بہت بڑا سرمایہ دیا ہے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے ''زندگی کی دوڑ (۱۹۵۹)'' ''چناروں کے چاند'' اور ''یادوں کے کھنڈر'' شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے

علاوہ ان کے کئی ناول ''رات کے کھونگھٹ (۱۹۶۰)''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے''،''زلف کے سر ہونے تک''،''چاندنی کے سائے''،''پت جھڑ کے بچھڑے''،''ڈیڈی''،''قفس اداس ہے''،''یہ رشتے یہ لوگ''،''وادیاں اور ویرانے''اور''من بڑا چنچل ہے''قابل ذکر ہیں۔

ٹھاکر پونچھی کا تعلق چونکہ پونچھ سے تھا۔اس لئے ان کے افسانوں میں پونچھ اور پونچھ کے رسم رواج، رہن سہن، ڈھولک کے گیت وغیرہ جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔افسانہ''پگڑی''میں انھوں نے مختلف تہذیبوں کے ساتھ کشمیری تہذیب کو بھی پیش کیا ہے۔جھیل ڈل جس سے کئی ادیب اور شاعر متاثر ہوئے ہیں۔اس کی خوبصورتی ملک کے تمام جھیلوں سے منفرد اور دل لُبھانے میں اپنی مثال آپ ہے۔اس کا نیلا پانی بھی دلفریب ہے۔اسی جھیل کے پرکشش منظر کو ٹھاکر پونچھی نے اس طرح پیش کیا ہے کہ جھیل کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے:

> ''سامنے دیوار پر ایک تصویر تھی۔کشمیر کے سرسبز سرفراز اور برفانی چوٹیاں..........دور افق میں سوئی ہوئی ایک جھیل کا نیلا نیلا پانی،اور اس میں تیرتی ہوئی چھوٹی سی کشتی،اور اس کے عین سامنے درختوں کی جھنڈ میں چُھپا ہوا ایک چھوٹا سا پہاڑی مکان جو چُھپ چُھپ کر برفانی چوٹیوں میں سے اُبھرتے ہوئے چاند کو دیکھ رہا تھا...... پھر وہ کشتی تیرتے تیرتے کنارے پر لگی اور مس مرہنا اس میں کود گئیں۔وہ کنارے پر کھڑا دیکھتا رہا۔نیلگوں پانی میں حرکت ہوئی۔اور کشتی چل پڑی۔ہلکے ہلکے ہوا کے جھونکے تند تھپیڑوں میں بدل گئے۔''۲۰

موہن یاور ۱۹۲۷ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد صحافت سے وابستہ ہوئے اور یہی ان کے روزگار کا وسیلہ بن گیا۔روز نامہ''سندیش (جموں)''میں کام کرتے رہے اور زندگی کے آخری ایام میں جموں سے ہفت وار اخبار''رفتار''شائع کرتے تھے۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز تقسیم ملک سے پہلے کیا۔لیکن تقسیم ملک کے بعد باقاعدہ طور سے ادبی دنیا سے

جڑ گئے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ''وہسکی کی بوتل (۱۹۵۸)''، ''سیاہ تاج محل (۱۹۶۱)'' جس پر ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے انعام بھی ملا ہے، ''تیسری آنکھ'' اور ''دو کنارے (۱۹۶۲)'' قابل ذکر ہے۔ انھوں نے ایک ناولٹ ''پتھروں کا شہر'' بھی تحریر کیا ہے اور ''توی اور جہلم'' کے عنوان سے ایک افسانوی مجموعہ ترتیب دیا ہے جس میں ریاست کے معروف قلم کاروں کی کہانیاں شامل ہیں۔

موہن یاور کے یہاں بھی کشمیری تہذیب کے کچھ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کے ساتھ ''جو'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ کشمیری زبان کا لفظ ہے جو کشمیری لوگ مہذبانہ طور پر اکثر کسی مرد کے ساتھ بات چیت کرنے پر استعمال کرتے تھے مگر اب آج کے دور میں یہ لفظ مسترد کیا گیا ہے۔ شاید ہی آج یہ کہیں پر استعمال ہوتا ہو۔ موہن یاور افسانہ ''بستی بستی'' میں اس لفظ کا ذکر کرتے ہوئے کشمیری قہوہ اور پیالوں کو بھی ابھارتے ہیں جو خاص کشمیری تہذیب وثقافت میں شامل ہے:

> ''پھر علی جو نے چولہا گرم کیا اور قہوہ بنایا اور گرم گرم قہوہ مٹی کے چار پیالوں میں انڈیل دیا گیا۔ اور وہ چاروں بیک وقت پیالوں کو اپنے لبوں تک لے گئے۔''[۲۱]

کشمیری عوام ہمیشہ سے ظلم زیادتی کا شکار ہوتی آئی ہے۔ آزادی سے قبل یہاں کے لوگوں کی حالت بھی ویسی ہی تھی جیسی آج ہے۔ اُس زمانے میں لوگ ڈوگرہ حکومت سے تنگ آکر مایوسی کی حالت میں دربدر کام کے لئے دور دراز علاقوں میں بھٹک رہے تھے۔ وہ سکھ اور خوشی کے لئے ترس رہے تھے۔ اس دکھ بھری داستان کو موہن یاور نے افسانہ ''بستی بستی'' میں سمیٹا ہے۔ اس کہانی میں کچھ کشمیری نوجوان سرینگر چھوڑ کر جموں روٹی کی تلاش میں آتے ہیں اور خون پسینا بہا کر ایک جگہ بیٹھتے ہیں پھر بہار کے موسم میں کشمیر کی پرخمار بہار کو یاد کرتے ہیں:

> ''بیلی! کشمیر میں بہار آگئی۔ چنار کے پتّے جھوم رہے ہیں۔ ہری پربت کے سامنے والے باغ میں بہت بڑا میلہ لگنے والا ہے۔ باداموں کے

شگوفوں کی خوشی میں ۔مگر بیلی ۔کشمیر میں بہار کیسے آ گئی ۔ جبکہ ہم اُداس ہیں ۔ بادام کے شگوفے اُداس ہیں ۔سنبل اور نرگس کے نیلے اور سفید پُھول اُداس ہیں ۔ ہمارا دل ٹوٹا بیلی ۔جہلم کا پانی کراہ رہا ہے ۔آنسو بہا رہا ہے ۔ڈل اُداس ۔ برف اُداس ۔ پہاڑ اُداس ۔کشمیر نے ہم کو پکارا ہے بیلی ۔کشمیر نے ہم کو پکارا اپنے بیٹوں کو۔''۲۲

اسی افسانے میں موہن یاور کشمیری کی کاشتکاری اور صنعت کاری کے مسائل کو بھی ابھارتے ہیں ۔ یہاں کی کاشتکاری اور صنعت وحرفت کے بڑے بڑے ذرایعے ہونے کے باوجود لوگ غریبی اور بھوک کی زندگی بسر کرتے تھے ۔ کیونکہ ساہوکاران کی محنت کا پھل انہیں نہیں دیتے تھے بلکہ ان پر لگان (بیگاری) وغیرہ کے مظالم ڈھائے جاتے تھے ۔اسی بات کو کہانی میں پیش کیا گیا ہے ۔ جس کی ناقابل برداشت حد پار ہو جاتی ہے اور لوگ احتجاج کرنے پر اُتر آتے ہیں:

''لکڑی ہم کاٹتے ہیں ۔ چیرتے ہیں ۔ پھاڑتے ہیں ۔تو ند ہمارے شاہ کی بڑھتی ہے ۔سیٹھ دن بھر ''تخت'' پر بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا ۔محنت ہم کرتے ہیں ۔ پسینہ ہمارا بہتا ہے ۔لُہو رِستا ۔جان سُوکھتی اور روپیہ شاہ کی تجوری میں چلا جاتا ہے ۔ہمارا روپیہ ہم بُھوکے ۔ ہمارے بچے بُھوکے ۔سبزی ہم اُگاتے ۔سیب ، ناشپاتی ، اخروٹ ، بادام اور راجماش کا داتا ہم ۔ہمیں بُھوکے مرتے ۔ یہ کھیت ہمارے ہاتھوں سے لہلہاتے ہم کھیتوں کی مانگ سجاتے ۔کشتی ہم چلاتے شال ریشم ہمارا مگر ہم فنکار ہمارے بچے ننگے ۔ ہمارے بھائی ننگے ۔''۲۳

تیج بہادر بھان ۱۹۳۱ء میں محلّہ حبہ کدل سرینگر میں پیدا ہوئے ۔ابتدائی تعلیم سرینگر سے حاصل کی ۔مزید تعلیم پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی ۔ وہاں سے واپس آ کر محکمہ فلڈ کنٹرول میں تعینات ہوئے ۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۱ء میں ''لال چیزی'' کہانی لکھ کر کیا ۔ان کے دو افسانوی مجموعے ''جہلم کے سینے پر (۱۹۶۰)'' اور ''عورت (۱۹۶۲)'' ایک ناول ''سیلاب

اورقطرے(۱۹۶۷)''میں شائع ہو چکے ہیں۔ تیج بہادر بھان نے ابتدا سے ہی رومانیت سے انحراف کرتے ہوئے اپنی ایک نئی روش اختیار کی۔ان کے افسانے کشمیری عوام کی زندگی پر مبنی ہیں۔انھوں نے کشمیریوں کے دکھ درداور طرز زندگی وغیرہ کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔افسانہ''جوتے''میں تیج بہادر نے جیٹھ اشٹمی کے تیوہار پر سارے کشمیر کے عقیدت مند پنڈت لوگوں کو بھوانی دیوی کے یاترا کرتے دیکھایا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ کشمیری سماوار چائے اور پھرن وغیرہ کا ذکر بھی کیا ہے۔پھرن استعمال کرنے کے ایک مختلف حربے کو سامنے لایا ہے۔ جب کہانی میں مندر کی صفائی کرنے والی جُوتے کو پھرن کے اندر چھپا کر چُرا لیتی ہے:

''حتیٰ کہ دُکاندار بھی اپنی دُکان بڑھا گیا تھا۔اپنا اطمینان کر کے انھوں نے جلدی سے جُوتے فرن کے اندر چُھپائے اور ہنومان جی سے نظریں ملائے بغیر......صفائی ادھوری چھوڑ کر گھر کی طرف ہوئے۔''۲۴

افسانہ''جہلم کے سینے پر''میں انھوں نے ہانجیوں کے دکھ درد کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔جو اپنی ستم ظریفی کی وجہ سے مشکل سے مشکل وقت میں بھی دور دراز کا سفر کشتیوں میں کرتے ہیں۔جہلم کشمیر کا سب سے بڑا اور پھیلا ہوا دریا ہے۔جو پورے کشمیر کا پانی اپنے اندر سمو لیتا ہے۔اس دریا پر منحصر یہاں کے ہانجی لوگوں کی زندگی ہے۔یہ کہانی ایک ہانجی حاملہ عورت پر مشتمل ہے جس کا نام زونی ہے۔زونی نام کشمیری نام کی ایک انفرادیت ہے۔اس طرح کے نام اور کہیں نہیں ہوتے ہیں۔رونی ایک حاملہ عورت ہے جو درد سے تڑپ رہی ہے لیکن اپنے شوہر کو اپنا درد محسوس نہیں ہونے دیتی ہے ہر حال میں چپو چلانے میں اپنے شوہر کا مدد کرتی ہے اور کشتی میں ہی بچے کو جنم بھی دیتی ہے۔ان کے پاس گھر گرہستی کا کوئی سامان موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ دونوں شہر ٹھیکدار سے پیسے لینے جاتے ہیں۔شہر جاتے وقت کشتی میں ان کی جو حالت ہوتی ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

''اور زونی کا پیٹ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ڈھیلے ڈھالے پھرن کے باوجود اُبھار صاف نمایاں تھا۔لیکن زوانی اسکی فکر سے بے نیاز چپو تھامے

خاموش کھیتوں کو تک رہی تھی۔ کھیتوں سے پرے دور نیلے پہاڑوں کی
طرف دیکھ رہی تھی۔ رزاق کو محسوس ہوا کہ جیسے یہ پہاڑ اس کے ارد گرد
گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ مہیب دیوزادوں کی طرح خاموشی سے اس
کی بربادی کے منتظر ہیں۔ خاموشی اس کے کانوں پر بوجھ بن کر چھانے
لگی، اور اس کے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ شہر جلدی
پہنچ جائے۔''۲۵

حامدی کاشمیری ۱۹۳۲ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام حبیب اللہ ہے۔ ابتدائی تعلیم کشمیر میں حاصل کی۔ کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔اے انگریزی کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو کیا اور ''جدید اردو نظم پر یورپی اثرات'' عنوان کے تحت پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کشمیر یونیورسٹی سے تفویز ہوئی۔ کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں اور وہی سے وائس چانسلر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے تقریباً ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کی۔ ان کا پہلا افسانہ ''ٹھوکر (۱۹۵۱)'' ماہنامہ ''شاعیں'' میں دہلی سے شائع ہوا۔ ان کے چار افسانے مجموعے ''وادی کے پھول (۱۹۵۷)'' ''سراب (۱۹۵۹)'' ''برف میں آگ (۱۹۶۱)'' اور ''شہر افسوں (۲۰۰۹)'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ تیس تنقیدی کتابیں، چار شعری مجموعے، چار ناول، خودنوشت سوانح اور ایک سفر نامہ قابل ذکر ہیں۔ حامدی کاشمیری کو کئی ملکی انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ ان کے افسانے کشمیری تہذیب وثقافت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی اکثر کہانیوں میں کشمیری ماحول، رہن سہن، طرز زندگی، سماجی وسیاسی حالات اور یہاں کے لوگوں کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ ان کے افسانے کشمیر کے قدرتی حسن سے مالا مال ہیں۔ پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں سے اوپر دلکش نیلا ہٹ، بادام کے شگوفے، چنار اور شہتوت کے درختوں، ٹانگے میں لوگ سفر کرتے، کانگڑی اور پھرن، کشمیری شال، سیبوں، سماوار وغیرہ کا ذکر اکثر وبیشتر ملتا ہے۔ ان کے کردار اور ان کرداروں کے نام مثلاً جبار ڈار، سندری، زیبہ، زرینہ، خدیجہ اور زونی وغیرہ کشمیری تہذیب

وثقافت کی روایت میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ادھوری کہانی، اندھیرے کی روشنی، پمپوش، اندھیروں میں اور بہار آنے تک ان کے ایسے افسانے ہیں جن میں کشمیری تہذیب وثقافت کی بازیافت اورصدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

''اندھرے کی روشنی'' جھیل میں رہنے والے ایک غریب حاجی غفارڈار پر مشتمل ہے جو اپنی کشتی میں سیاحوں کو سیر کرا کے مشکل سے اپنا گزارا کرتا ہے۔اوراپنے بن ماں کے معصوم بیٹے قادر کی پرورش کرتا ہے۔ جواس کا آخری سہارا ہے۔ یہ افسانہ دراصل کشمیر میں رہنے والے ہانجی لوگوں کی معاشی صورت حال کی ترجمانی کرتا ہے۔کئی سالوں کے بعد جب غفارڈار کے ہاتھ میں پیسے آتے ہیں تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمورہا ہے۔اسی کو حامدی کشمیری نے کشمیری انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

> ''اس آٹھ سال کے عرصے میں ننھے قادر کو کتنی بار فاقوں کا شکار ہونا پڑا، اس کا کنول سا چہرہ مُرجھا گیا اور سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی راتوں میں کتنی بار اس کا جسم یخ بستہ ہو گیا............اس خیال نے غفارڈار کی روح میں زہر گھول دیا وہ تڑپ اُٹھا، اور چپوزور زور سے چلانے لگا''۲۶

''اندھیروں میں'' میں کشمیر کی روزمرہ زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہے،عورتیں تھکی ہاری پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس کشتیوں میں سبزیاں بیچ کر خوشی خوشی اپنے اپنے گھروں کولوٹتی ہیں۔دوسری طرف ڈونگے میں ایک کشمیری گیت گارہا ہے۔اس گیت میں کشمیر کے ایک دلفریب منظر''چار چناری'' کی تعرفیں ہورہی ہیں۔ یہ دل لبھانے والی جگہ جھیل ڈل کے بیچوں بیچ واقع ہے۔اس جگہ کو حامدی کاشمیری کشمیری گیت کے ساتھ اس طرح بیاں کرتے ہیں:

> ''ڈس منز باغ چھی چار چنار
> عاشقو رُٹ تت جایہ قرار

جا یہ سرسبز پر بہار
کمہ نعمژ ایوان کھنے
جھیل ڈل کے بیچوں بیچ چنار کے چار درخت ہیں
یہ ایسی جگہ ہے یہاں عشاق قرار وتسکین پاتے ہیں
یہ ایسی جگہ ہے جو بہار کی رعنائیواور تازگیوں سے معمور ہے
اوراس جگہ بڑی اچھی اچھی نعمتوں کالطف اٹھایا جاتا ہے۔'' ۲۷

''بہار آنے تک'' افسانہ وادی کی بے روزگاری اور غریبی کی ترجمانی کرتا ہے۔اس میں لوگوں کے چہرے بہار کے موسم میں بھی پھیکے پھیکے اوراُداس نظر آتے ہیں۔انھیں کسی اور ہی بہار کا انتظار ہوتا ہے یہ سوچتے ہیں کہ ہم بھی کبھی سراُٹھا کر جی لیں گے کیا ہمارے یہاں بھی بہار آئے گی۔ بوڑھے ''ماجھی'' اس کہانی کا ایک کردار ہے جس کے پاس ایک ہاؤس بوٹ خالی رہتا ہے۔سیاحوں کے انتظار میں اس کی آنکھیں تھک جاتی ہے۔ بہار کے موسم میں بھی یہ ناامیدی کی چادر اُڑھے پریشان نظر آرہا ہے۔اس بہار کی خوبصورت مثالوں سے کتابیں بھری پڑی ہے۔جس کی ایک چھوٹی سی مثال اس افسانے سے ملاحظہ فرمائیں:

''سورج کی روشنی میں سڑک چمک رہی تھی، اور بائیں طرف دریا کی نقرئی لہروں کا رقص دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ دُور مشرق کی طرف کی پہاڑیوں پر برف کی چادریں سورج کی تیز تیز شعاعوں سے پگھل رہی تھیں۔ داہنی جانب منڈی کے خزاں دیدہ باغ کو جیسے ایک نئی زندگی کا انتظار تھا۔خزاں کا دور گذر چکا تھا۔اوراب بہار کی امد تھی! رعنائیوں اور شادابیوں کی آمد!! وادی کا پتہ پتہ اور کلی کلی نکھر اُٹھے گی اور مسکراہٹیں ہوگی!!......نئی زندگی ہوگی۔'' ۲۸

حسن ساہو ۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام غلام حسن بٹ ہیں۔تعلیم وتربیت سرینگر میں ہی ہوئی۔اس کے بعد محکمہ اریگیشن میں کلرک ہوئے۔۱۹۶۲ میں محکمہ

برقیات (پی۔ڈی۔پی) میں تبادلہ ہوا۔۱۹۹۱ میں سبکدوش ہوئے اور اب کئی برسوں سے ہفتہ روزہ ''دوران'' کی ادارت باقاعدگی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ''پھول کا ماتم (۱۹۷۴)''،''بستی بستی صحرا صحرا (۱۹۸۱)'' اندھا کنواں (۱۹۹۶)'' اور'' گردش دوراں (۲۰۰۹)'' قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں ''کعبہ سے کربلا تک (۱۹۷۶)''،''دعائے حاجات (۲۰۱۰)''،''شیعہ سنی اتحاد (۲۰۱۳)'' اور'' شکستہ ساز (۲۰۱۴)'' وغیرہ شامل ہے۔کشمیری عوام کے بے کس زندگی، ان پر کئے جارہے ظلم و جبر اور سیاست دانوں کی سازشیں وغیرہ ان کے افسانوں کے اہم موضوعات ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں کشمیر کی رعنائی، ڈل جھیل کی دلکشی، کوہساروں کی مست بھری لے اور چناروں کے گنے سائے بھی موجود ہیں۔

افسانہ ''عکس'' میں انھوں نے کشمیر کے پُر فضا گاؤں میں رہنے والی ایک معصوم اور مجبور لڑکی کو پیش کیا ہے۔ جو شہر کے ایک آدمی کے ہوس کا شکار ہو کر گاؤں سے دور جنگل میں کنارہ کشی کرتی ہے۔تاکہ سماج کے طعنوں سے نجات حاصل کر سکے۔اور اپنے ناجائز بچے کی پرورش کر سکے۔مگر وہاں بھی ایک شہری لڑکا اس کے حسن اور شرم وحیا پر عاشق ہو جاتا ہے اور اُسے شادی کرنا چاہتا ہے مگر زیبو پھر سے کسی دوسرے شہری بابو کے فریب میں نہیں آنا چاہتی ہے وہ اس لڑکے کو اپنی پوری داستان سناتی ہے کہ وہ ایک بچے کی ماں ہے اور اس شخص کی تصویر بھی دکھاتی ہے جس نے اس کو محبت کا فریب دے کر برباد کیا تھا۔ یہ شہری لڑکا اپنے ہی باپ کی تصویر دیکھ کر حقابقا ہو کر رہ جاتا ہے۔جس جگہ یہ لڑکی رہتی ہے اس سے کشمیر کے تہذیبی وثقافتی نمونے بھی عیاں ہو جاتے ہیں۔جیسے بید اور چنار کے درختوں میں رہنے کا منظر اور چشموں میں صاف شفاف پینے کا پانی وغیرہ کا ذکر اس افسانے میں ملتا ہے:

> ''پٹارا اور بید کے ٹکڑوں کو کھوکھلے چنار میں چھوڑ کر وہ چشمے کی جانب
> بڑھنے لگی۔ پانی کے دو چار گھونٹ حلق سے نیچے اُتار کر وہ بڑے ٹیلے پر
> بیٹھ گئی جہاں سے اس بستی کے گھاس پھوس کے بنے ہوئے کئی چھپر

صاف نظر آرہے تھے جس بستی کو خیر باد کہہ کر وہ اس سنسان بیاباں میں
رہنے لگی تھی، آہ سرد بھر کر وہ سہمی سہمی نگاہوں سے اُس پگڈنڈی کی طرف
دیکھنے لگی جس نے اُسے یہاں آنے میں ساتھ دیا تھا۔'' ۲۹

افسانہ ''اعتراف'' میں انھوں نے امرناتھ کی مقدس گُھپا کی عکاسی کی ہے جو پہلگام میں ایک پہاڑی چندن وادی میں واقع ہے۔ یہاں دور دراز سے لوگ اپنے گناہوں کا کفارہ کرنے آتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ اس گپھا کے آس پاس کے مناظر دریا لدر، برفیلی چوٹیاں، سرد ہوائیں اور یہاں کا ہوش اُڑانے والا خوشگوار ماحول وغیرہ کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔اس کہانی کے چار کردار کرشن، کریم، کرتار اور ڈیوڈ جو آپس میں دوست ہیں یہ امرناتھ گُپھا کی یاترا کرنے آئیں ہیں تا کہ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں اور ایک ایک کر کے یہ اپنی اپنی گناہ شدہ کہانیاں بیان کرتے ہیں۔اس مقدس گپھا پر دور دراز سے آنے والے یاتریوں کے لئے مختلف انتظامات کئے جاتے ہیں تا کہ انھیں کسی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔جس کا بھی ذکر حسن ساہو یوں کرتے ہیں۔ اقتباس:

''آگے کا سفر پہاڑی تھا اور دشوار گزار راہوں سے گزر کر طے کرنا تھا
۔گورنمنٹ کے ساتھ ساتھ کچھ پرائیوٹ طرز کی انجمنوں کی جانب سے
اس پہاڑی سفر کی تکلیف کو کچھ کم کرنے اور یاتریوں کو ہر ممکن امداد فراہم
کرنے کی غرض سے طرح طرح کے انتظامات کیے گئے تھے۔دوران
سفر خوراک، پانی، گرم گرم کپڑے اور دیگر چیزیں دستیاب رکھنے کی خاطر
سرکار نے کچھ محکموں اور شعبو کے تال میل سے کمیٹیاں تشکیل دی
تھیں۔'' ۳۰

افسانہ ''ٹوٹی کہانی کمند'' میں سیاحوں کی آمد رفت، چنار اور ناشپاتی کے درخت، سیاح ڈل جھیل اور مغل باغات کے سیر کرتے نظر آرہے ہیں۔ان تمام سیاحوں اور مقامی لوگوں کے درمیاں نشاط باغ میں ایک اندھا لڑکا ناشپاتی کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا جس کا رُخ ایک نوجوان

جوڑے کی طرف تھا۔ یہ جوڑا غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور لڑکی اس اندھے کو خوب ڈانٹتی ہے کہ وہ کیوں انھیں گھور گھور کر دیکھتا ہے۔لیکن آخر میں بہت شرمندہ بھی ہو جاتی ہیں جب ان کو پتہ چلتا ہے کہ یہ لڑکا اندھا ہے۔ اسی طرح پورے ماحول میں یاسیت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔جس میں کشمیری تہذیب وثقافت کا عکس دیکھا جاسکتا ہے:

''اس مایوس کن واقعہ کو نظر انداز کیے ہم دونوں شکارے میں نشاط باغ کی جانب چل پڑے۔ باغ کا ہر گوشہ قریب قریب لوگوں سے کھچا کھچ بھر پڑا تھا۔ وہاں پر ایک ایسے واقعہ سے دوچار ہونا پڑا کہ تفریح کا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا۔ پرفضا و پُرسنگم ماحول میں یاسیت کے بادل اس کرخت انداز سے چھانے لگے''۔۳۱

''صدائے بازگشت''میں افسانہ نگار خط وکتابت کے ذریعے اپنے دل کا پیغام اپنی محبوبہ تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کے حسن کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی ایک پہاڑی لڑکی کی جفاکشی اور محنت ومشقت بیاں کرتے ہیں جو ایک جھونپڑے میں رہتی ہے۔جس کا پورا خاندان کشمیری فسادات میں تباہ ہوا تھا۔ دوسری طرف ان جھونپڑوں میں رہنے والے بے سروسامان لوگوں کی زندگی کا موازنہ بڑے بڑے شراب خانوں قلبوں سے کر کے سماج میں ہونے والے سرمایہ دارانہ نظام پر طنز کرتے ہیں۔افسانہ نگار اپنی محبوبہ کو خط لکھتے وقت کشمیر کی ایک پہاڑی لڑکی گل جان کے کردار کو اس طرح اُبھارتے ہیں:

''تو پھر پہاڑی لڑکی سے شادی کیوں نہیں کرتے''۔تم نے بیزاری کے عالم میں مشورہ دیا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور ان آنسوں میں ایک پہاڑی لڑکی کا وجود اُبھرا اس کا نام گل جان تھا جس کا جنم جھونپڑے میں ہوا تھا۔ پتھروں اور آبشاروں سے کھیلتی جوان ہوگئی تھی۔ گل جان بہادر اور جفاکش لڑکی تھی اور تمہاری طرح خوبصورت بھی۔ یہ سورج نکلنے اور ڈوبنے تک بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹاتی۔''۳۲

حسن ساہو کے افسانے کشمیری عوام کی مجبوری اور بے کسی، ان پر ہونے والے ظلم وستم کی روداد سناتے ہیں۔ کشمیر میں پچیس سال سے چلے آرہے فسادات نے بے پناہ تباہی مچادی، کئی لوگ بے گھر ہوگئے، کئی خاندانوں کے چراغ بجھ گئے، کئی عورتیں بیوہ ہوگئی اور کئی مائیں بیٹوں کے انتظار میں آنسوں بہاتے بہاتے آنکھوں کی بینائی سے محروم ہوگئیں۔ افسانہ ''ایک پہلو یہ بھی ہے'' اس روداد کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس میں امتیاز بوڑھے ماں باپ اور دو بہنوں کا ایک لوتہ سہارا تھا۔ جس کو نقاب پوش بندوق بردار گھر سے نکال کر موت کی نیند سُلا دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سچ کا ساتھ دیتا تھا۔ اس کی پڑھائی کے لئے سارے گھر والوں نے دن رات ایک کئے تھے۔ اپنی تہذیبی ورثے کی فنکاری کو اپنا کر اس میں محو ہو گئے تھے تاکہ امتیاز کی پڑھائی مکمل ہو سکے۔ مگر یہ بات بھی عرض کروں ان فنکاروں کی پزیرائی آج تک کہیں نہیں ہوئی جو کشمیر میں صدیوں سے کیا جارہا ہے۔ ان کے حصے میں صرف کام اور بھوک کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اس کی ایک جھلک اس افسانے میں بھی دیکھی جاسکتی ہے:

> ''دونوں لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے بجائے سلائی اور بنائی کے مقامی سینٹر میں سوزن کاری کا ہنر سیکھنے کی غرض سے داخلہ لینا پڑا۔ شالوں اور اونی کپڑوں پر گل کاری کرنے میں دونوں بہنوں نے زبردست مہارت حاصل کرلی...... ماں تو پہلے پہل چرخہ کاتا کرتی تھی۔ لیکن تب دق کے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باعث وہ یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکی۔'' ۳۳؎

ان کے دیگر افسانے ''گرگٹ صفت'' اور ''جانکاہ صدمہ'' وغیرہ بھی اس ضمن میں رکھے جاسکتے ہیں۔ ان میں پیپر ماشی اور سوزن کاری کے فن کو اُبھارہ گیا ہے اور کشمیری باغات اور ہاوس بوٹو ں میں ہونے والے عصمت فروشی کے نقطے کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔ ''اُجاڑ'' افسانہ میں انھوں نے کشمیر کے سرکاری انتظامیہ پر ملامت کی ہے۔ کشمیر عوام کو ٹرانسپورٹ کے لحاظ سے بھی مشکلات کا

سامنا کرنا پڑھتا ہے۔ کیونکہ یہاں کوئی بس سروس، سرکیں اور قانون وغیرہ نا ہونے کے برابر ہے۔ اس لئے لوگوں کو کچھوے کی رفتار چلتی چھوٹی چھوٹی بسوں میں سفر کرنا پڑھتا ہے۔ ان میں بھی اور لوڈ اتنا ہوتا ہے کہ ہلنے کہ جگہ تک نہیں ملتی ہے۔ ان بسوں کو یہاں میٹا ڈار کہتے ہیں۔ کہانی کے کردار 'امجد' کا تبادلہ جموں سے سرینگر ہوا تھا۔ اس کا مالک سخت طبیعت کا ہوتا ہے اس لیے نوکری کی سلامتی کے لئے برقع پہنتا ہے تا کہ وقت پر دفتر پہنچ سکے۔ کیونکہ برقع پوش عورتوں کو کم از کم گاڑی میں بیٹھنے کی جگہ ملتی ہیں۔ اس دوران امجد برقعے میں اکثر اپنے دوست کو گھورتا رہتا ہے۔ دوست تذبذب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ لڑکی اُسے ہمیشہ کیوں گھورتی ہے۔ پھر ایک دن دونوں کا آمنہ سامنہ ہو جاتا ہے اور پھر امجد دوست کو اپنی پوری کہانی سناتا ہے۔ دراصل یہ کہانی کشمیر کی روزمرہ زندگی سے عکس کی گئی ہے جس کو حسن ساہو یوں ابھارتے ہیں:

> ''میٹا ڈار اکثر لدی بھری ہوتی ہے تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی اور اکثر کھڑے کھڑے سفر کرنا پڑتا ہے اس پُر ہنگم صورتحال میں خوش پوش جیب کترے خوب مزے میں رہتے ہیں .... کیا کروں میٹا ڈار میں جگہ مشکل سے ہی ملتی ہے۔ اس مصیبت سے نجات پانے کی عرض سے میں آپ کی بھابی کا شلوار اور برقع استعمال کر لیا کرتا ہوں ایسا کرنے سے کم از کم گاڑی میں بیٹھنے کو سیٹ آسانی سے مل جاتی ہے کیا کروں یونٹ کا انچارج سخت قسم کا آدمی ہے۔ ذرا سی دیر ہو جانے پر آگ بگولہ ہو جانا اس کا معمول بن گیا ہے۔''[۳۴]

پشکر ناتھ ۱۹۳۴ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کی پہلی کہانی ''اور کہانی ادھوری رہ گئی'' ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ پشکر ناتھ کے تعلق سے یہ قول عام ہے کہ انھوں نے کہانی لکھنے کا آغاز اپنے دوست برج پریمی کے چیلنج سے کیا۔ جب برج پریمی نے انھیں کہا کہ تم کہانی نہیں لکھ سکتے ہو۔ ان کے چار افسانوی مجموعے اندھیرے اجالے (۱۹۶۲)، ڈل کے باسی، عشق کا چاند اندھیرا اور کانچ

کی دنیا منظر عام پر آ چکے ہیں۔''ڈل کے باسی'' پر ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے ایوارڈ سے نوازا اور یو پی اردو اکادمی کی طرف سے بھی ایوارڈ ملا ہے۔مزید انھوں نے کئی ٹی۔وی اور ریڈیو ڈرامے بھی تحریر کئے ہیں۔اور ''دشت تمنا'' کے نام سے ایک ناول بھی لکھا ہے۔ان کی بیشتر کہانیاں کشمیر کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی کے ساتھ ساتھ کشمیری تہذیب وثقافت کی ترجمان ہیں۔ان کی کہانیاں کشمیری عوام کے دکھ درد کو بیان کرتی ہیں۔

''جوڑا ابابیلوں کا'' افسانہ میں پشکر ناتھ نے کشمیر کے یخ آلودہ سردی کا ایک منظر پیش کیا ہے۔مکانوں کے چھتوں سے پانی کی بوندیں ٹپک ٹپک کر جم جاتی ہے اور یہ بوندیں جم کر گاجر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور پھر لوگ خاص کر بچے ان کو شوق سے کھاتے ہیں اور خوش ہو جاتے ہیں۔اس سردی کے موسم میں برف اور یخ وغیرہ سے لطف انداز ہونے کے بھی مختلف طریقے ہیں۔جس کو پشکر ناتھ فنکارانہ انداز میں بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں:

''اسے ابابیلیں بہت اچھی لگتی ہیں اور بھی کچھ چیزیں اسے اچھی لگتی ہیں، جیسے برف کے مجسمے بنانا یا یخ بستہ برف کی گاجریں کھانا۔ برف سے ڈھکی ہوئی چھتوں سے جب پانی کی بوندیں رسنے لگتی ہیں تو یہ رستی ہوئی بوندیں تیز ہوا سے منجمند ہو جاتی ہیں۔صبح اٹھ کر دیکھے تو چھت کے کنارے کنارے ان گنت ایسی گاجریں لٹکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔کرچ کرچ کر کے کھا جاتی ہے۔یہ گاجریں اور پھر پنسلین کے ٹیلے لگواتی ہے کئی کئی دنوں تک بول بھی نہیں سکتی ہے۔''[۳۵]

پہاڑوں پر آباد گجر لوگوں سے پشکر ناتھ ہمدردی کا احساس جتا رہے ہیں۔انھوں نے کئی بار اپنے افسانوں میں ان کا ذکر کیا ہے۔اس ضمن میں ''ایک بوند زہر'' اور ''ٹراوٹ مچھلی'' رکھے جا سکتے ہیں۔ان میں انھوں نے کشمیری گجر لوگوں کی داستان زندگی بیان کی ہے گجروں کا رہن سہن لاچاری اور روز مرہ زندگی کو پیش کیا ہے۔ یہ لوگ موسم گرم میں زمین داروں کے مویشیوں کو جنگلوں میں

چرانے لے جاتے ہیں اور کئی مہینوں تک وہاں اپنے ڈھوکوں میں رہتے ہیں جو لکڑی اور مٹی کے بنے ہوتے ہیں وہاں جا کر ان کا رشتہ پورے سماج سے کٹ جاتا ہے۔ وہاں نہ سڑکیں، نہ بجلی، نہ ہسپتال، نہ اخبار اور نہ کوئی ڈاک خانہ ہوتا ہے۔ ان کے پاس صرف گھی، مکھن اور مکئی کی روٹیاں ہوتی ہیں اور وہاں پر کچھ موزی جانوروں ریچھ اور شیر وغیرہ کا خطرہ بھی ستائے رہتا ہے۔ ان کے یہاں الاؤ جلانے کی ایک برسوں پرانی روایت ہے۔ جسے یہ لوگ اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں اور اس کے ارد گرد بیٹھ کر اپنے ہاتھ پاؤں بھی گرم کرتے ہیں۔ اسی گجر عوام کی تہذیب کے تعلق سے پشکر ناتھ کے افسانہ ''ٹراوٹ مچھلی'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پھاڑی کے اُوپر، گھنے جنگلوں کے پرے ایک بڑی چراگاہ ہے۔ یہاں گوجر لوگ بھیڑ بکریاں اور مویشی لے کر گرمیوں کے مہینے گذارتے ہیں۔ دنیا اور دنیا والوں سے دُور ان لوگوں کی زندگی قدرت کے بہت قریب ہوتی ہے۔ دودھ اور مکھن کی بہتات اور شہد کے چھتے کوئی نئی تہذیب کی روشنی نہیں۔ کوئی انگریزی یا دیسی اسکول نہیں۔ کوئی ہسپتال یا ڈاکخانہ نہیں، کوئی بینک یا بنیا نہیں۔ صرف چند کٹھار، الاؤ اور مکی کے بُھٹے۔''۳۶

''درد کا مارا'' میں پشکر نے کشمیر کے اعلیٰ پائے کے فنکاروں کی لاچاری اور انکساری کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کہانی کا کردار ایک بڑا کشمیری کاریگر صمد جو ہے۔ جو جانوروں کے کھالوں سے مختلف جانوروں چیتے، بارہ سنگھے، ولر کے راج ہنس، ڈل جھیل کی رام چڑیا، مانس بل کی بطخیں وغیرہ کے عکس بنایا ہے اور سیاح ان کو شوق سے خریدتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک سیاح لڑکی کو اس کا بنایا ہوا چیتہ بے حد پسند آتا ہے مگر اس کی قیمت سے متفق نہیں ہو پاتی ہے۔ پھر صمد جو اس لڑکی کے خاطر منافع نکال کر صرف لاگت کی قیمت بتاتا ہے۔ جس کے بدلے میں سیاح لڑکی صمد جو کو چیڑ کہتی ہے۔ یہ سن کر صمد جو ہکا بکا ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس کے باپ رمضان جو کو ایک انگریز سیاح نے اس فن پر

دادِ تحسین دی تھی اور ایک دستخطی سرٹیفکٹ دیا تھا۔جس پر لکھا تھا کہ اگر رمضان جولندن میں ہوتا تو وہاں کا بادشاہ اسے سر کے خطاب سے نوازتا۔ بدقسمتی سے یہ سرٹیفکٹ اس کے مکان کے ساتھ نظرِ آتش ہو گیا تھا۔ اس مشہور فنکار رمضان جُو سے اس کے بیٹے صمد جُو نے یہ فن سیکھا تھا جس کو سیاح لڑکی چیٹ کہتی ہے:

''آہستہ آہستہ صمد جُو نے اِن لفظوں کو اپنے کانوں میں اترتے سنا۔ آہستہ آہستہ ہی ان لفظوں کی تلخی اس نے اپنے اندر بہت اندر اُترتے محسوس کی، اس نے حیران حیران سی نگاہوں سے اُس دھان پان سی لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا پانچ سو رُوپیہ لینا تو بات کرو۔ اِدھر سب چیٹ ہے پہلے جاستی دام بولتا ہے۔پھر ہیگلنگ کرتا ہے۔ پھر بہت کمتی میں بیچتا ہے۔صمد جُو نے کچھ کہنا چاہا۔اس کے ہونٹ تھرتھرائے ،مگر کوئی آواز نہ نکل سکی۔ میرے خدا! یہ ہونٹوں کی خاموشی تھرتھراہٹ اتنے برسوں کے بعد؟''[۳۷]

''پل نمبر صِفر کے گدِھ'' میں کانگڑی کے مضر اثرات کو اُبھارہ ہے۔کانگڑی جو کشمیری تہذیب کی ایک منفرد شناخت ہے۔ اس کے سہارے لوگ کشمیر کی یخ آلود سردی سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ ہر گھر میں پائی جاتی ہے۔ خاص کر غریب طبقہ اور بزرگ لوگ اس کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ جان کر بھی کہ اس کا زیادہ استعمال صحت کے لئے مضر ہے۔اس سے کینسر ہونے کا خطرہ بھی رہتا ہے۔اس کے تاپنے سے ٹانگوں میں سرخ داغ پڑ جاتے ہیں جو کینسر کی علامت ہوتے ہیں۔جس کا ذکر پشکر ناتھ کے یہاں بھی ملتا ہے:

''روایت ہے کہ چند سال پہلے کسی انگریز نے بھی اِس دُور بین سے بوڑھے ملاح کی ٹانگوں کے ان گدلے نشانات کو دیکھا تھا۔ اور ایک میڈیکل پیپر تحریر کیا تھا۔کانگڑی اور کینسر۔اس مضمون نے طبّی دنیا میں ایک ہلچل مچائی تھی۔ کہتے ہیں اُس رات چناروں کی اُونچی پُھنگوں پر

بسنے والے گدھوں کا خاندان رات بھر رویا تھا اور سری نگری کی کلب کی راہداریوں میں آسیب اُچھلتے کودتے رہے تھے۔''۳۸؎

برج پریمی ۹ستمبر ۱۹۳۵ءکوحبہ کدل سرینگر میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام برج کشن ایمہ تھا۔انھوں نے اعلیٰ تعلیم کشمیر یونیورسٹی سے حاصل کی۔۱۹۷۶ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کشمیر یونیورسٹی سے بعنوان ''سعادت حسن منٹو،حیات اور کارنامے'' تفویض ہوئی۔پھر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی سے منسلک ہوئے اور ۱۹۹۰ء میں وفات پائی۔اُن کی پہلی کہانی '' آقا'' کے عنوان سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ برج پریمی کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں ''جلوہ صدر نگ (۱۹۸۵)''،''حرف جستجو''،''ذوق نظر''،''منٹو کتھا''،''سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے'' اور ''جموں کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما'' قابل ذکر ہیں۔ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''سپنوں کی شام'' ۱۹۹۵ءمیں ان کے فرزند پریمی رومانی نے ترتیب دے کر شائع کیا۔

برج پریمی کی کہانیاں کشمیر کے گرد ہی گومتی نظر آرہی ہے۔ان کے یہاں کشمیر،کشمیری مقامات،پھل اور پھولوں،جھیلوں،چنار،برف وغیرہ کا استعمال اکثر وبیشتر ہوا ہے۔کشمیری عوام کے دکھ درد اور ظلم ستم کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔اس تعلق سے کشمیری لال ذاکر لکھتے ہیں:

''ان سب کہانیوں میں دو باتیں بڑی کھل کر سامنے آتی ہیں۔ایک تو یہ کہ برج پریمی کو اپنی وادی سے جتنا پیار ہے اور اپنے ہم وطنوں کے لیے جتنا درد اس کے دل میں ہے اس کی عکاسی ان کہونیوں میں پوری طرح ہوتی ہے۔''۳۹؎

جہاں ان کے یہاں یہ سب ہے وہاں کشمیری تہذیب وثقافت کے چند نمونے بھی سامنے آتے ہیں۔افسانہ ''سپنوں کی شام'' میں انھوں نے کشمیری دیہات کی ایک لڑکی کو ہیروین بنا کر پیش کیا ہے۔ جو گاؤں آئے ہوئے ماسٹر جی کے پیار میں گرفتار ہو جاتی ہے مگر شرم حیا کی مورتی ہونے کی وجہ سے کسی سے بھی اپنے پیار کا ذکر نہیں کرتی ہے۔صرف چپکے چپکے آنسوں بہاتی ہے اور

خاموشی سے اپنے سسرال روانہ ہو جاتی ہے۔اس کی شادی میں برج پریمی نے کشمیری زبان کے چند گیت بھی پیش کیے ہیں۔اقتباس:

''وَنتیس تام دوپ تھم ژ یر گوم ژ یر گوم

نیر وونی ژ یر پوش چھاوانی

ترجمہ:اب تک تو کہہ رہی تھی کہ مجھے دیر ہو گئی ہے۔

اب خوبانیوں کے پھول لوٹنے چلی جا میری لاڑلی۔

ہارِ چھے نیندر ِتہ وَتہ وُ زناوی زین

طوط بول بوش کرناوی زین

ترجمہ: ہماری ننھی سی چڑیا سو رہی ہے۔اے طوطے میاں اسے رستے میں جگا کر

بولیاں کروانا۔''[۴۰]

اس افسانے میں انھوں نے ایک اور کشمیری روایت کو ابھارہ ہے۔جب کشمیر کے کسان کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔تب ان کے گھر کی عورتیں ان کے لئے چائے اور کھانا لے جاتی ہے۔نمکین چائے تانبے کے سماوار میں لے جایا کرتی ہیں جس کا ایک منظر برج پریمی یوں پیش کرتے ہیں:

''اور کھیتوں کے کنارے چناروں کی لمبی قطاروں کے نیچے سے عورتوں کے کارواں گذرتے جن کے سروں پر سفید سفید بھاپ اڑاتے ہوئے سماوار رکھے ہوئے۔جن میں ان کے شوہروں اور بیٹوں کے لئے گرم چائے کی چُسکیاں ہوتیں۔''[۴۱]

افسانہ''آنسوں کے دیپ''میں انھوں نے کشمیر کے حسین مناظر اور رقص کرتی زندگی کا ذکر کر کے کشمیر کے حسن کو دوبالا کیا ہے:

''اور میرے اس دیوانہ استفسار نے وادی کے ذرے ذرے سے پوچھ لیا۔میں نے وِتستا کے گنگناتے پانیوں سے پوچھا۔گلمرگ اور پہلگام کی گھاٹیوں سے پوچھا۔کہ''بتاؤ اے برفآب چوٹیو! اے حسین جھیلو،

تقدس اور فطرت کے رکھوالو۔ کشمیر کی زندگیو تم سب جو تحریف سے نفرت کرتے ہو تم جو ٹھہراؤ سے پرہیز کرتے ہو۔ تم جو رقص کرتی ہوئی زندگی ہو، سیب کی مٹھاس ہو۔ اہرہ بل کی ابشار ہو۔ زعفران کی بو ہو۔ اور کڑکتی ہوئی دھوپ میں کام کرتے ہوئے کسان کی آرزو ہو'' ۴۲؎

نور شاہ ۹ جولائی ۱۹۳۶ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کا ادبی سفر تقریباً پچاس سال کے عرصے کا محیط ہے۔ ان کے چھ افسانوی مجموعے بے گھاٹ کی ناؤ، ویرانے کے پھول (۱۹۶۲)، من کا آنگن اداس اداس، گیلے پتھروں کی مہک (۱۹۸۲)، بے ثمر سچ (۲۰۰۵) اور آسمان، پھول اور لہو (۲۰۰۹) خصوصیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ناول نگار، ڈرامہ نویس، کالم نویس، اور تذکرہ نگار کے حیثیت سے بھی مشہور رہے ہے۔ ان کے افسانوں میں کشمیری لوگوں کا حسن و جمال اور یہاں کے حسین قدرتی مناظر کا جمال و کمال نمایاں طور پر جھلک رہا ہے۔ نور شاہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا بچپن جھیل ڈل کے آس پاس گزرا ہے اور لاشعوری طور پر یہی مناظر اور ماحول ان کی کہانیوں میں منعکس ہوئے ہیں۔ وہ کبھی سیاحوں اور کبھی خود کو ڈل جھیل کے پاس ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں اکثر و بیشتر پری محل، شکاروں، کشتیوں، پہلگام، ٹنگمرگ، یوس مرگ اور کشمیری شال وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ نور شاہ کی کہانیاں زیادہ تر سیاحوں سے جڑی ہیں۔ ان کے یہاں سیاح کشمیر آتے جاتے رہتے ہیں۔ کشمیر کے پھلوں اور پھولوں، زعفران، کنول، چنار، سیب اور نمکین چائے وغیرہ کو تشبیہات کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ''اندھیرے اُجالے'' افسانہ میں نور شاہ نے کشمیر کی تاریخ کو سمیٹا ہے۔ وہ اپنے ایک سیاح کردار سے کشمیر کی تعریف اس طرح کراتے ہیں کہ کشمیر پیکر بن کر آنکھوں کے سامنے نظر آتا ہے:

''ورنہ کشمیر کی ہر چیز قابل تعریف ہے ہری بھری شاداب وادی، سندر دھرتی، بھانت بھانت کے لوگ، پہاڑ جن کی گود میں ہرے بھرے جنگل ہیں جو آگے پھیل کر ایسی شکھر مالاؤں میں بدل جاتے ہیں

جہاں بارہ مہینے برف کا رواج رہتا ہے۔ یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا
رنگ نیلا ہے سبز ہے یہاں پھولوں سے جڑی ہوئی مرگیں ہیں، رنگ
برنگے پھولوں سے سجے سنورے تختے ہیں جنکی خوشبو میں سیاحوں اور
یاتریوں کی سانسیں رچی بسی ہیں۔ یہ گلمرگ، یوس مرگ، پہلگام، یہ
شالیمار ہے، یہ نشاط ہے، نور جہاں کے خوابوں کا باغ، جہانگیر کی جوانی
کی یادگار، یہ ڈل جھیل ہے، اس پر چلتی پھرتی ننھی ننھی کشتیاں اور دلہن کی
طرح سجے سنورے ہاوس بوٹ، یہ لدرنالہ ہے جس کا پانی پتھروں سے
سر پھوڑتا جھاگ بناتا ہوا جاتا ہے۔''۴۳

''علیا اور بلبل'' میں نور شاہ نے گلمرگ کے آس پاس رہنے والے مقامی لوگوں کی غریبی اور مجبوری کو اُبھارہ ہے۔ جو دن بھر گھوڑے سواری سے لوگوں کو جگہ جگہ گھوماتے ہیں۔ یہی ان کی آمدنی کا ذریعہ ہے۔ غریبی اور بھوک مٹانے کے خاطر یہ لوگ گھوڑے سواری کی قیمتوں میں بھی کبھی کبھی اپنی من مانی کرتے ہیں۔ خاص کر سیاح لوگ اس سواری کے زیادہ شیدائی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ گھوڑے والے سواری کے سامنے مجبور بھی ہوجاتے ہیں۔ وہ جو بھی دینے کے لئے راضی ہوتے ہیں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس افسانے کا کردار ''علیا'' جس کے پاس ایک سست رفتار گھوڑی جس کا نام بلبل رکھا ہے۔ بھوک اور مفلسی کی وجہ سے یہ لوگوں سے جھوٹ بھی بولتا ہے کہ اس کی گھوڑی تیز رفتار سے چلتی ہے تاکہ کوئی اس کی گھوڑی سے بیزار نہ ہوجائے اور سواری کرنے سے انکار کردیں:

''بھائی گھوڑے والے۔ تمہاری یہ تیز رفتار گھوڑی تم ہی کو مبارک ہو۔ میں پہلی بار
گھوڑے کی سواری کررہا ہوں۔ کہیں دور نیچے گرادیا تو۔؟ نا بھئی نا،
مجھے تمہاری بلبل نہیں چاہیئے۔
اسے کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ مگر تیزی سے بولا۔ بابو جی بُرا نہ مانئے گا،
ایک بات بتادوں؟
کیا۔؟ میں نے چونک کر پوچھا

سچ پوچھئے تو یہ گھوڑی بڑی سست رفتار ہے۔
پھر ابھی تم کیا کہہ رہے تھے؟
بابُو جی کیا کریں جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔''۴۴؎

ان گھوڑے والوں کو سیاحوں کی مرضی کے مطابق کبھی کبھی اونچے پہاڑوں پر بھی چڑھنا پڑتا ہے اور کبھی تیز رفتار سے گھوڑے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر دوڑنا پڑتا ہے۔ اگر ان کی سانس بھی پھولے یا تھکاوٹ بھی محسوص ہو تب بھی ان کو چلنا ہی پڑتا ہے کیونکہ یہ غریبی اور مفلسی سے جفاکشی کرنے کے خاطر اپنے پیشے سے مجبور ہے جس کی نمائندگی نور شاہ اس طرح کرتے ہیں:

''مس نے گھوڑے کو چابک مارا، وہ ذرا تیزی سے دوڑنے لگا۔ علیا کی رفتار میں بھی تیزی اور پھرتی آ گئی۔ وہ زور زور سے سانس لینے لگا۔ میں نے گھوڑے کو ایک جگہ پر کھڑا کیا۔
راج مجھ سے آگے نکل گیا۔
ٹھہر۔علیا۔ میں نے کہا
وہ رک گیا اور اپنا سانس سنبھالنے لگا۔
''علیا تم تیری سے مت دوڑو۔ یو میں بھی آہستہ چلتا ہوں۔ صاحب کو جانے دو۔''
وہ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ شاہد سمجھا ہوگا میں بھی کوئی بیوقوف سیاح ہوں جو اس کے دُکھ درد کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''۴۵؎

افسانہ ''مرغابی'' میں انھوں نے کشمیری عورتوں کی تہذیبی نقطے کو اُبھارہ ہے۔ یہاں کی عورتیں شرم وحیا کی پیکر، بالباس اور شوہر کی فرمابردار ہوتی ہیں۔ زیادہ تر وقت گھر کے کام کاج میں ہی صرف کرتی ہیں اور کبھی کبھار کسی کام کے بہانے گھر سے باہر نکلتی ہے۔ اس تعلق سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ تو اپنی اپنی تہذیب ہے۔ مرد کماتے ہیں، محنت کرتے ہیں عورتوں کی اپنی دنیا ہے، اپنی تہذیب ہے، یہاں کی عورتیں اپنے خاوندوں کے

اشاروں پر چلتی ہیں۔ غیروں کی طرف دیکھنا گناہ سمجھتی ہیں۔ آپ کے
ہاں کی عورتیں حسن کی نمائش کرتی ہیں دوست بناتی ہیں۔''۴۶

نورشاہ نے ''بٹوت کے آخری رات'' میں کشمیر کے حسن کو لفظوں میں پرویا۔ اور کشمیر کے غریب عوام کے دکھ درد، رہن سہن، کاروبار وغیرہ کو بہت ہی باریکی سے پیش کیا ہے۔ ظاہری خوبصورتی کے پیچھے پوشیدہ نقطے کو اُجاگر کر کے کشمیری عوام کے ساتھ ہمدردانہ جذبے کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کشمیر کے نچلے طبقے سے بے حد ہمدردی رکھتے ہیں جن کا پیشہ صرف محنت اور مزدوری ہے۔ اسی غریب عوام کی زندگی کے ساتھ نورشاہ کشمیر کے حسین مناظر کو اس طرح ابھارتے ہیں:

''اس کے بعد ہم باتیں کرتے رہے۔ کشمیر کی باتیں، کشمیر کے ملکوتی حُسن کی باتیں، حسین مرغزاروں کی باتیں، کشمیر کے ملکوتی پہاڑوں کی باتیں، زعفران زاروں کی باتیں، ہم نے باتیں کیں اُن لوگوں کی جو کشمیر کے کھیتوں میں بسین کرتے ہیں۔ ڈھلانوں پر سیّاح لوگوں کے گھوڑوں کے آگے پیچھے ننگے پاؤں دوڑتے ہیں۔ اُکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ ہانپتے اور کانپتے ہوئے پہلگام کے حسین مرغزاروں میں گورے اور کالے لوگوں کے درمیان گِھرے ہوئے، اپنے خاک پیرہن رفو کرنے والوں کی۔ ان لوگوں کی جو دوسروں کے لئے پھول چنتے ہیں اور اپنے دلوں کے مرجھائے اور پژمردہ گُلوں کا ہار پروتے ہیں۔ کشمیر کے اُن لوگوں کی باتیں جو جھیل وُلر کی وسیع گہرائیوں میں خاردار سنگھاڑوں کے لئے غوطے لگاتے ہیں۔''۴۷

تمام سیاح کشمیر آ کر شکارے میں رہنے اور سیر کرنے کے مشاق ہوتے ہیں۔ یہ ہاوس بوٹ (شکارے) زیادہ تر جھیل ڈل میں پائے جاتے ہیں ان ہاوس بوٹوں میں ایک ہانجی طبقہ آباد ہے۔ ہاوس بوٹوں کے علاوہ ان کے پاس اور بھی چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہوتی ہیں جس میں یہ

سیاحوں کوجھیل کی سیر کراتے ہیں۔ان کشتیوں اور ہاوس بوٹوں کو یہ لوگ دلہن کی طرح سجا کے رکھتے ہیں۔جس کی ایک چھوٹی سی جھلک نورشاہ کے افسانہ ''تتلی'' میں دیکھی جاسکتی ہے:

''پہلگام سے وہ دوسرے ہی دن آ گئے تھے اور اب ہر شام گئے دیو
اُسے ملنے ہاوس بوٹ میں آیا کرتا تھا۔پھر وہ دونوں ایک شکارے میں
بیٹھ کر ساری جھیل میں گھوما پھیرا کرتے تھے۔''۴۸؎

نورشاہ ''میرے حصے کے خواب'' میں کشمیری لوگوں سے متعارف کراتے ہیں جو پرخلوص اور محبت کے پیکر ہوتے ہیں۔سیاحوں کا استقبال دل سے کرتے ہیں اور اگر کبھی کوئی سیاح کشمیر کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا چاہتا ہے تو یہاں کے لوگ خوشی خوشی پوری جانکاری دے دیتے ہیں۔ان ہی لوگوں کے بارے میں نورشاہ کا ایک کردار سیاح خاتون اپنی رائے کو اس طرح ظاہر کرتی ہے:

''اور یہاں کے لوگ؟
''یہاں کے لوگ'' وہ رک گئی۔
''کوئی رائے تو قائم کر لی ہوگی؟''
''لوگ بُرے نہیں ہیں، جہاں تک میں جان پائی ہوں، پُرخلوص اور
محبت کرنے والے ہیں۔''۴۹؎

کشمیری لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ان کا کوئی رہبر ہو جس کو یہ اپنا پیر مانتے ہے اور اس کی پیروی کرتے ہے پھر اس پیر کی وفات کے بعد اس کے درگاہ پر جا کر حاضری دیتے اور اپنا حاجت طلب کرتے ہیں۔ان نیک بزرگ ہستیوں میں سلطان الآرفین اور شیخ عبدالقادر جیلانی قابل ذکر ہے انھوں نے یہاں اسلام پھیلانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ان کی درگاہ پر آج بھی عقیدت مند لوگ حاضری دیتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں۔یہ روایت یہاں صدیوں سے چلی آرہی ہے۔اس کا ذکر بھی نورشاہ افسانہ ''ایک کہانی کے تین باب'' میں کرتے ہیں۔جب بیٹا دسویں جماعت کا امتحان اچھے نمبرات سے پاس کرتا ہے تو اس کا باپ بے حد خوش ہو کر سب سے پہلے اپنے پیر دستگیر کا شکریہ ادا

کرنا چاہتا ہے:

''سہیل بیٹا خوش رہو۔آباد رہو۔اللہ تمہیں ہمیشہ کامیابی کی منزل سے ہم کنار کرے۔آؤ بیٹا ہم دونوں پیر دستگیر صاحب کے در پر دستک دیں گے۔دو رکعت نماز ادا کریں گے۔شکریہ ادا کریں گے اپنے معبود برحق کا۔''۵۰؎

پیر دستگیر کا اصلی نام شیخ عبدالقادر جیلانی تھا۔جو بغداد سے کشمیر اسلام رائج کرنے کے غرض سے آئے تھے اور پھر بغداد واپس لوٹ گئے۔ان کی زیارت آج بھی یہاں موجود ہے جہاں ان کا موئے مقدس محفوظ ہے۔اس کے علاوہ نور شاہ کے دیگر افسانوں میں بھی کشمیری تہذیب وثقافت نمایاں طور پر جھلک رہی ہے۔اس ضمن میں ''اجنبی شہر کے لوگ'' چراغ گل کردو،خواب بھی بکتے ہیں وغیرہ رکھے جاسکتے ہیں۔ان میں انھوں نے کشمیری لکڑی کے مکانوں،ٹیڑھے میڑھے راستوں، پگڈنڈیوں، برفیلی چوٹیوں، پر بہار فضاؤں،جھیل ڈل اور جھیل ولر اور چنار کے سایوں وغیرہ کا ذکر فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔

عبدالغنی شیخ مارچ ۱۹۳۶ء کو لیہہ لداخ میں پیدا ہوئے۔ایم۔اے کرنے کے بعد محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے۔اب ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں مگر ان کے لکھنے کا سلسلہ رواں دواں جاری ہے۔ ان کی پہلی کہانی ''جلن'' ماہنامہ ''دیش'' سرینگر سے شائع ہوئی۔ ان کے دو افسانوی مجموعے'' زوجیلا کے آر پار(۱۹۷۵)'' اور'' دوراہا(۲۰۰۳)'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ناول'' دل ہی تو ہے(۱۹۷۸)'' اور ایک ناولٹ'' وہ زمانہ'' بھی شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے لداخ کے حوالے سے کئی کتابیں تحریر کیں ہیں۔''قلم،قلم کار اور کتاب'' ان کی دلچسپ کتاب ہے۔کلچرل اکیڈیمی نے بھی انھیں ایوارڈ سے نوازا ہے۔

عبدالغنی شیخ زیادہ تر جہیز پر ملامت کرتے نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے سماج میں بے شمار مسائل جنم لیتے ہیں۔ان کا تعلق لداخ سے ہے اس لئے ان کے یہاں لداخی ماحول، رہن سہن

اورلداخی لباس وغیرہ کی عکاسی زیادہ ملتی ہے۔لداخی تہذیب کے کچھ پہلو کشمیری تہذیب کی غمازی بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ لداخ کشمیر کا ہی ایک حصہ ہے۔شیخ صاحب نے کشمیری لڑکی کا کردار ''ماورا'' کے روپ میں افسانے ''دوراہا'' میں پیش کیا ہے۔ جو اپنے ہم جولی کلاس میٹ حامد کو دل ہی دل میں بے حد چاہتی ہے۔مگر شرم وحیا کی مجسمہ ہونے کہ وجہ سے اس کا اظہار کسی سے نہیں کرتی ہے۔ ماورا کے ماں باپ بھی اس کی شادی کے فکر میں لگے رہتے ہیں اور ان کی نظر میں بھی حامد رہتا ہے یہ دونوں اس تعلق سے آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ اتفاقاً ماورا بھی ان کی باتیں سن لیتی ہے مگر تہذیب کی بندشوں میں جھکڑ کر یہ صرف یہ باتیں چھپ چھپ سن لیتی ہے نہ کہ اپنی رائے کا اظہار کر پاتی ہے۔اقتباس:

> ''لیکن میں یہ بات پاپا اور ممّی کے سامنے نہیں کہہ سکتی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا، کاش میں ان سے کہہ سکتی کہ حامد آپ کی ہی پسند نہیں، میری بھی پسند ہے۔ میں تو ازل سے حامد سے پیار کر رہی ہوں۔ کاش ممّی ہی میرے سامنے اس بات کو چھیڑتی اور میں ان کی ساری پریشانی دور کر دیتی۔لیکن ممّی کیسے بولیں۔ پاپا نے پہلے ہی ان کی زبان پر تالا لگا رکھا ہے۔'' ۵۱

عبدالغنی شیخ نے ''ہوا'' میں کشمیری دیگ کا ذکر کیا ہے۔جس کا شمار کشمیر کے برتنوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دیگ کو کشمیری کس طرح استعمال میں لاتے ہیں اس کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ ''دیگ'' کشمیری زبان کا لفظ ہے یہ زیادہ تر تانبے کی ہوتی ہے۔ جب بھی کشمیر میں کسی کے یہاں شادی منگنی وغیرہ جیسی کوئی بھی تقریب ہوتی ہیں۔تو لوگ رشتہ داروں اور ہمسایوں سے وازہ وان بنانے کے لئے بڑے بڑے برتن مستعار لیتے ہیں۔جن میں دیگ خاص طور سے شامل ہے۔ کیونکہ یہاں کسی بھی بڑی سے بڑی تقریب کا اہتمام گھر ہی میں کیا جاتا ہے۔اس دیگ کو عبدالغنی شیخ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''ڈشی نے بڑی دیگ اٹھائی تھی جو گاؤں کے ہر تیوہار اور دعوت پر مجھ سے مستعار لی جاتی تھی۔'' ۵۲؎

مخمور بدخشی یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام محمد حسین بدخشی ہے۔۱۹۶۳ء میں کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ایم۔اے کے دوران ہی افسانے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔پروفیسر محی الدین قادر زور اس وقت کشمیر یونیورسٹی کے صدر تھے۔وہ مخمور بدخشی کے افسانے دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور ان کا افسانوی مجموعہ ''نیل کنول مسکائے'' (۱۹۶۲) کے عنوان سے ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد سے شائع کرایا۔مگر اس مجموعے میں یہ افسانہ موجود نہیں ہے جو اس کا عنوان ہے۔یہ جاننے کے لئے سب بے چین ہیں۔کہ بدخشی کو وہ افسانہ چھپانے سے اعتراض کیوں ہے۔خیر مخمور بدحشی کی کہانیوں میں بھی کشمیر جھلک رہا ہے۔شہر کی بدحالی اور جہیز وغیرہ پر طنز کرتے نظر آتے ہیں۔دیہات سے وابستہ ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔رحیما، ساجی اور منظور وغیرہ ان کے کرداروں کے نام ہیں جو خالص کشمیری نام ہیں۔کشمیری پیڑ دیودار اور چنار، دریائے لدر، زعفران کے کھیت۔شالیمار باغ، ڈل گیٹ، لال چوک، پھرن اور برف وغیرہ کا ذکر ان کے افسانوں میں عام طور سے ملتا ہے۔افسانہ ''نور اور سائے'' میں انھوں نے گاؤں کی ایک لڑکی ساجی کا کردار پیش کیا ہے جو اس کہانی کا متحرک اور مرکزی کردار ہے۔بکری کو چرانے لے جانا اس کا کام ہے۔یہی ساجی کی دنیا ہے مخمور بدشی ساجی کو دیہات کے حسین منظر میں مدحوش ہو کر کشمیری زبان میں گیت گاتے اس طرح پیش کرتے ہیں:

''اس کی نظریں بار بار اِدھر اُدھر پھیل رہی تھیں۔بکری بدستور گھاس چر رہی تھی۔ پرندے سرسبز جھاڑیوں میں بیٹھے چہچہا رہے تھے، جھرنا چھوٹے چھوٹے گول گول نیلگوں پتھروں سے ٹکراتا ہوا بہہ رہا تھا اور دھیرے دھیرے گا رہی تھی۔

مہِ گو چون محبت زیادہ موکر وعدہ خلافی گلاب رویہ قد شمشاد موکر وعدہ

خلافی''۵۳؎

کانگڑی جو کشمیری تہذیب وثقافت کا ایک اہم جز ہے جس کی روایت یہاں صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ یہاں کے لوگ اس کو مختلف طرح سے استعمال میں لاتے ہیں۔ جیسے خوشیوں کے موقع پر کانگڑی میں اسبند جلایا جاتا ہے تا کہ نظر بد سے نجات ملے، جنات اور بھوت پریت کو دور کرنے کے لئے یہی ترغیب استعمال کی جاتی ہے۔ اور سردی کے موسم میں کپڑے سکھانے کے لئے اور حقّہ میں آگ بھرنے کے لئے بھی کانگڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ جس کو مخمور صاحب کہانی ''وادی کی رانی''میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''وہ اُٹھا کھڑکی بند کی۔ کونے میں رکھا ہُوا حقہ بستر ے کے نزدیک لے آیا اور کانگڑی میں دکھی ہوئی آگ کو پھونک کر تیز کرنے لگا۔ جب وہ چلم میں تمبا کو بھر چکا اور زور سے دو چار کش کھینچے تو اپنی پلکوں کو اُوپر اُٹھا کر بولا''۵۴؎

شبنم قیوم کی ولادت ۱۹۳۸ء کو سرینگر میں ہوئی۔ سرینگر میں ہی تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمہ زراعت میں ملازم ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور آج ہفتہ روزہ ''قومی وقار'' میں مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی پہلی کہانی ''اخبار کی سرخی'' روزنامہ ''خدمت''(سرینگر) میں شائع ہوئی۔ انھوں نے دو افسانوی مجموعے ''ایک زخم اور سہی (۱۹۷۱)''اور''نشانات(۲۰۰۷)''تخلیق کئے ہیں۔ مزید اُن کی چار ناول ''یہ کس کا لہو ہے یہ کون مرا''جس دیش میں جہلم بہتی ہے''،'' زندگی اور موت'' اور'' چراغ کا اندھیرا(۱۹۶۹)''منظر عام پر آ چکے ہیں اور کشمیر کی سیاسی صورت حال کے تعلق سے ان کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں ''کشمیر کا سیاسی انقلاب''،''کشمیر میں خواتین کی بے حرمتی''،''سیکس پولیوشن ''اور''جو کہوں گا سچ کہوں گا''اہمیت کے حامل ہیں۔

شبنم قیوم کی کہانیاں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ملبوس ہیں۔ ان کے یہاں تجسس ہے،

تسلسل ہے، بات ہے اور انداز بھی ہے، وہ بغیر کسی منظر کو پیش کئے اپنی بات سیدھے لفظوں میں کہہ دیتے ہیں۔ ان کے افسانے قاری کا تجسس برقرار رکھتے ہوئے روانی کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں اور ایسے موڑ پر لاکر کھڑا کرتی ہیں جہاں قاری کے ذہن میں ایک سوال اُبھرتا ہے جس کا جواب جاننے کے لئے قاری بے قرار ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں خاص کوئی علاقائی اثر نہیں پایا جاتا ہے بلکہ کسی عام واقعہ کو اپنی کہانی کا موضوع بناتے ہیں جو کہیں پر بھی پیش آسکتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں پر ان کے یہاں کشمیری تہذیب کے نقوش بھی نظر آتے ہیں۔ کشمیر کی مہمان نوازی کا بہت چرچا ہے۔ یہاں خوش اسلوبی کے ساتھ مہمان کا استقبال کیا جاتا ہے۔ مہمان کے آنے پر مختلف زیافتیں پیش کی جاتی ہیں۔ آج چونکہ اس میں اور اضافہ ہو چکا ہے۔ آج سے کئی سال پہلے غریبی زیادہ تھی تاہم پھر بھی مہمان کو قہوہ اور قلچہ وغیرہ پیش کیا جاتا تھا اور لوگ سچے دل سے مہمان کا استقبال کرتے تھے جس کی ایک مثال شبنم قیوم کے افسانہ ''دسہرہ کی سیتا'' سے ملاحظہ ہو:

> ''ہاں۔! اس نے کچھ لاپرواہی سے کہا۔ ''تم قہوہ بناؤ'' شیلا سماوار لے آنے آگے بڑھی اور نرملا۔ اس نے حقے میں پانی بھر دیا اور جب وہ حقّہ لے کر ناتھ جی کے قریب بیٹھ گئی تو اس کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیت بھانپنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔'' ۵۵؎

شبنم قیوم کشمیر کی ناقابل برداشت سردیوں اور سردیوں میں دفتری نظام کشمیر سے جموں منتقل کرنے کا ذکر اپنے افسانہ ''دیا جلاؤ......روشنی بجھاؤ'' میں کرتے ہیں:

> ''حالانکہ کشمیر کی آنے والی سردیوں کا خیال آتے ہی میں ابھی سے ٹھٹھرنے لگتا، کشمیری باشندہ ہوتے ہوئے بھی مجھے کشمیر کی سردیوں سے ایسا ڈر لگتا ہے کہ کچھ نہ پوچھو، اس ڈر کے مارے نومبر آتے ہی میں دربار موکے دن گننے لگتا کہ کب اور کس گھڑی ہمیں اپنے اپنے دفتر کے ہمراہ جموں جانے کا آرڈر ملے تاکہ یہاں کی جان لیوا سردیوں سے نجات ملے۔'' ۵٦؎

کشمیر میں جھیل ڈل کے آس پاس آباد لوگ اکثر و بیشتر جھیل کے کنارے سیر کرنے جاتے ہیں اور وہاں کچھ لوگ کھیلتے ہیں، کچھ لوگ باتیں کرتے ہیں اور کچھ تنہائی میں بیٹھ کر گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔ جس کی عکاسی شبنم قیوم ایک پر کیف منظر کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں:

''میں جھیل کے کنارے بنڈ پر بیٹھا تھا اور تا حد نظر اس جنت الارضی وادی کو دیکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کا ماڈل بنا رہا تھا۔ نیلی جھیل کے اس بنڈ پر چار چبوتری سے لیکر قلعہ ہاری پربت تک، شنکراچاریہ پہاڑی سے لے کر ڈل گیٹ تک کا ماڈل تیار کر چکا تھا۔ اور اب میں اس میں رنگ بھر رہا تھا۔'' ۵۷

''بہت اونچے، بہت نیچے'' میں شبنم قیوم نے کشمیر کے ہاوس بوٹوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کو دکھایا ہے۔ جن کی روزی روٹی کا واسطہ سیاحوں سے جوڑا ہوتا ہے اور سیاحوں کے آتے ہی ان کا استقبال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ غریبی سے تنگ آ کر چند پیسوں کے خاطر سیاحوں کی ڈانٹ اور مار پیٹ تک ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ جس کی عمدہ مثال شبنم قیوم کا کردار رمضان ہے۔ جس کو دو سیاح اکثر پیٹتے ہیں اور پھر پیسے دیتے ہیں۔ رمضان ان سے مار کھانے کے لئے مختلف حربے کرتا ہے تا کہ جتنا وہ ان سے پیٹا جائے گا اتنے ہی اس کو روپے ملیں گے۔ اقتباس:

''بلجیم کے یہ دو وزیٹر رمضان کے گڈ لک ہاوس بوٹ میں متواتر دس سال سے آ رہے تھے اور ایک دو مہینے ٹھہر کر واپس جاتے تھے۔ لیکن اس سال وہ پورے چار ماہ یہاں گزار کر گئے تھے ان چار مہینوں میں انھوں نے رمضان کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ اُسے یاد آ گیا......آج سے چند ماہ قبل وہ بازار سے سودا سلف لے کر گڈ لک میں آیا تھا تو صاحب نے اسے ڈانٹے ہوئے پوچھا تھا اور انگریزی میں کہا تھا'' تم اس وقت تک کہاں تھے تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی تم نے یہ کیا مخول سمجھ رکھا ہے؟...... کچھ دنوں کے بعد اس نے ان کے املیٹ میں زیادہ نمک ڈالا تھا۔ جس

> کے چکھتے ہی انہوں نے دونوں پلیٹ جھیل میں پھینک دیئے تھے اور رمضان کی ایسی پھٹکار کی تھی کہ اگر روپے کا معاملہ درمیان میں نہیں ہوتا تو رمضان یہاں سے چلا گیا ہوتا۔''۵۸

شبنم قیوم خود بھی جھیل ڈل کے کنارے رہتے تھے۔ اس لئے ان کو ہاوس بوٹ میں رہنے والے ہانجی طبقہ کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ وہ ان کی ہر ادا سے واقفیت رکھتے تھے۔ شبنم قیوم کا یہ افسانہ ''بہت اونچے، بہت نیچے'' پڑھ کر پریم چند کا افسانہ 'کفن' یاد آتا ہے۔ جس طرح افسانہ ''کفن'' میں یہ طے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ پریم چند کا پلہ اس فریبی مادھو کی طرف ہے جو آلسی اور کام چور ہے یا اس ساہوکار کی طرف جو اُن سے کام تو لیتا ہے مگر پیسے برابر نہیں دیتا ہے۔ اسی طرح یہ طے کرنا یہاں مشکل ہو جاتا ہے کہ شبنم قیوم کا پلہ ہاوس بوٹ میں رہنے والے غریب ہانجی رمضان کی طرف ہے جو اپنی بھوک اور غریبی مٹانے کے لئے بری حرکتیں کرتا ہے اور اپنے وعدے سے اکثر مکر جاتا ہے یا اس انگریزی سیاح کی طرف جو مجبور ہو کر اکثر رمضان کو پیٹتا ہے اور پھر روپے دیتا ہے۔ لیکن آخر میں شبنم قیوم اس بات کی تصدیق بھی اس طرح کرتا ہے جب رمضان انگریز سیاح کا بھیجا ہوا خط پڑھتا ہے:

> ''آپ کی امانت جو ہمارے پاس تھی اور جو لاٹری کا ٹکٹ تمہارے نام سے ہمارے یہاں نکلی تھی وہ پانچ ہزار ڈالر تھی۔ تمہارے شادمرگی کو مدنظر رکھ کر یہ رقم ہم نے تمہیں دھیرے دھیرے لوٹا دی اور وہ بھی تمہارے ساتھ بدسلوکی کر کے۔ اس میں ہماری حکمت عملی تھی۔ اچھا خوش رہو آباد رہو، پھر ملیں گے۔''۵۹

''اور میں مر گیا'' میں شبنم نے ایک عام کشمیری نوجوان کی روداد بیان کی ہے۔ انھوں نے ڈل جھیل کے پرکشش منظر کو پیش کر کے ایک منفرد نقطے کو ابھارا ہے۔ جہاں تک ہر ایک کی نظر نہیں جاتی ہے۔ بظاہر کشمیر کے خوبصورت مناظر ہر سیاح کے لئے جس قدر لطف اندازی کا ایک بہترین سرمایہ ہے۔ وہی ان سے جڑے آدمی کے لئے یہ مناظر پھیکے پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ یہاں کی عوام

پریشانیوں کی وجہ سے ان نظاروں سے محظوظ نہیں ہوتے بلکہ ان سے بے زار ہوجاتے ہیں۔جس کی مثال شبنم قیوم نے افسانہ میں پیش کی ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار واحد متکلم ہے۔جوڈل جھیل کے کنارے ڈونگے میں رہتا ہے۔ بہت پڑھا لکھا ہونے کے باوجود اس کو ایک کلرک کی نوکری مل جاتی ہے اور ہمیشہ قرض لے کے اپنے گھر والوں کے لئے راشن لاتا ہے۔کبھی بھی اپنے بیوی بچوں کی فرمائش پوری نہیں کر پاتا اور اپنے ساتھی رشید کو دیکھ کر اس کو جلن ہوتی ہے جو کم پڑھا لکھا ہو کر بھی ممبئ میں بزنس کر کے ایک اچھی زندگی گزارتا ہے۔اس پر اس وقت جو کیفیت طاری ہوتی ہے۔اس کو شبنم قیوم اس طرح بیاں کرتے ہیں کہ کشمیری تہذیب ابھر کر سامنے آتی ہے:

> ’’رشید کی یاد کے ساتھ میں سڑک کراس کر کے فٹ پاتھ پر آیا جھیل ڈل میں ہاوس بوٹوں کی قطار لگی ہوئی ہے۔ پانی میں شکارے تھرک رہے ہیں۔ہاوس بوٹوں اور شکاروں میں میلانی اس کشمیر کی خوبصورتی کا حضن اٹھا رہے ہیں۔ جو کشمیر مجھے صرف بدصورت دکھائی دے رہی ہے مجھے اس میں کوئی حسن دکھائی نہیں دیتا، بھلا جو ادھار کے پیسوں سے راشن لانے گھاٹ پر آیا ہو، وہ حسن پرست کہاں ہوسکتا ہے جس کے دن آہ وزاری میں گزر رہے ہوں اور راتیں صرف کروٹیں بدل بدل کر بسر کرنا پڑ رہی ہوں۔اس کوڈل کے یہ نظارے کاٹ کھانے کو نہ آئیں تو کیا کریں۔‘‘۶۰

عمر مجید ۱۹۴۰ء میں سرینگر کے علاقہ سونہ وار میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام عبدالمجید میر تھا۔ابتدائی تعلیم بسکو اسکول سے حاصل کی اور پھر بی۔اے کرنے کے بعد اسی اسکول میں بحیثیت مدرسہ ۴۰ سال تک خدمات انجام دیتے رہے۔اس کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی وابستہ رہے۔روزنامہ ’’آفتاب‘‘ (سرینگر) میں ایڈیٹر کی حیثیت سے آخر تک کام کرتے رہے۔۲۳ ڈسمبر ۲۰۰۸ میں انتقال کر گئے۔ ان کا پہلا افسانہ ’’ایک بوڑھا ولر کے کنارے‘‘ ۱۹۶۵ء

روزنامہ ''آفتاب'' (سرینگر) میں شائع ہوا ۔ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''اجالوں کے گھاؤ (۱۹۶۷)'' میں شائع ہوا۔ دوناول ''یہ بستی یہ لوگ (۱۹۷۰)'' اور ''درد کا دریا (۱۹۷۶)'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد سلیم سالک نے ان کی کہانیوں کو بعنوان ''عمر مجید کے بہترین افسانے (۲۰۰۹)'' ترتیب دے کر شائع کیا۔

عمر مجید نے اپنے افسانوں کا موضوع کشمیر کو ہی بنایا ہے۔ان کی کہانیاں اور کردار کشمیر کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ وادی کشمیر گذشتہ پچیس سال سے جس دور سے گزر رہی ہے اس نے عمر مجید کے ذہن پر گہرا اثر کیا تھا۔ان کے موضوعات دکھ درد، غربت، معصوموں کی شہادت، ریاست کے سناٹے اور امن پسندی وغیرہ ہے۔ان نقطوں کو اُبھارتے اُبھارتے ان کے یہاں کشمیری تہذیب وثقافت کے نمونے بھی کہیں کہیں جلوہ نما ہو رہے ہیں۔اس تعلق سے سلیم سالک نور شاہ کی یہ صراحت لکھتے ہیں:

> ''عمر مجید کے افسانوں کا ایک الگ ہی انداز ہے۔وہ افسانہ لکھنے کے ڈھنگ سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ اپنے کردار زمین کی کھردری سطح پر تلاش کرتے ہیں اور چن کر۔انہیں اپنے افسانوں میں قید کر لیتے ہیں۔ اسلوب کا ستھرا پن ان کی کہانیوں کی نمایاں خصوصیت ہے کشمیر، کشمیریت اور کشمیر کی زندگی اُن کے محبوب ترین موضوعات ہیں''[۶۱]

کشمیر کے لوگ مہمان نوازی میں بہت مشہور ہے۔کشمیر آیا ہوا ہر فرد تقریباً اسے واقف ہوگا۔ یہاں کے لوگ گھر آئے ہوئے مہمان کی خاطر داری بہت عمدہ طریقے سے کرتے ہیں۔ مہمان کو مختلف زیافت پیش کرتے ہیں۔بغیر کچھ کھلائے پلائے مہمان کو جانے نہیں دیتے ہیں۔تب تک خود نہیں کھاتے جب تک نہ مہمان کو کھلاتے ہیں۔اس بات کی وضاحت عمر مجید افسانہ ''محمد شمیم کو کشمیر جانا ہے'' میں یوں کرتے ہیں:

> ''وجے دھر نے پانی کا ایک اور گلاس خالی کرتے ہوئے کہا محمد شمیم کو کشمیر

میں آنچ بھی نہ آئے گی۔ وہاں کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔ ہم تب
تک خود کھانا نہیں کھاتے جب تک نہ گھر بُلائے ہوئے مہمان کی دلجوئی
کرتے ہیں۔ میرے کشمیر کا ذرہ ذرہ مہمان نواز ہے۔'' ٦٢

کشمیر میں جب سردیوں کا موسم شروع ہوتا ہے تو سب لوگ سردی سے محفوظ رہنے کے لیے پھرن پہنتے ہیں۔ پھرن کے اندر کانگڑی لے کر اپنے گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں اور گرتی برف کا مزا لیتے ہیں۔ جس کی عکاسی عمر مجید افسانہ ''محمد شمیم کو کشمیر جانا ہے'' میں کرتے ہیں:

''ہاسردی بہت ہوتی ہے، برفباری ہوتی ہے۔ لیکن سب لوگ، مرد ہو
یا عورتیں، ہندو ہو یا مسلمان سبھی پھرن پہنتے ہیں۔ تم بھی ایک بنوا لینا۔
اور کانگڑی لے کر گرتی ہوئی برف کو دیکھنا بڑا مزا آتا ہے۔'' ٦٣

کشمیر کے لوگوں کا عقیدہ ہے وہ کسی بزرگ کے زیارت گاہ پر جاتے ہیں۔ وہاں دعائیں مانگتے اور اپنے حاجت کے لئے دھاگا باندھتے ہیں۔ زیارت گاہ پر جا کر بکرے، مرغے اور بیل وغیرہ ذبح کرتے ہیں اور لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حاجت روانی کے لیے اور بھی مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ کشمیر میں گلمرگ کے قریب حضرات بابا ریشی کا روضہ ہے وہاں اُن کا ایک بنایا ہوا مٹی کا چولہا بھی ہے۔ جہاں لوگ اپنی حاجت روانی کے لئے اس چولہے کی لپائی بھی کرتے ہیں۔ جس کا ذکر عمر مجید اسی افسانے میں کرتے ہیں:

''لیکن اولاد کی نعمت سے ہم محروم رہے ماں نے ہر تیرتھ استھان، ہر
درگاہ میں حاضری دی۔ پھر شیخ پورہ کی سب سے بزرگ عورت خدیجہ
ماسی نے حضرت بابا ریشی کے روضہ پر حاضری دینے کو کہا۔ روضہ
مبارک پر مٹی کا بنا ہوا ایک چولھا ہے۔ وہاں جا کر حاجت مند عورتیں
چولھے کی لپائی کرتی ہیں...... ہم بھی بابا ریش کی زیارت گاہ پر گئے۔ ہم
نے دعا مانگی، میری ماں بہت روئی، لاجونتی نے چولھے پر لپائی کی اور
مقدس دھاگا باندھا اور ٹھیک ایک سال کے بعد انجلی پیدا ہوئی۔ یہ ہے

انجلی۔''۶۴؎

عمر مجید نے افسانہ ''مردہ چنار''میں ایک غریب مظلوم رحمان کی کہانی بیان کی ہے جس کو موسم سرما کے لئے کانگڑی خریدنی ہے مگر اس کی آمدنی قلیل ہونے کی وجہ سے وہ بہت پریشان ہوجاتا ہے۔اس کی غریبی کا شکار اس کا معصوم بیٹا بھی ہوجاتا ہے۔وہ کھیلنے کودنے کے بجائے اکثر کام کرتا رہتا ہے۔کبھی لکڑیاں لاتا ہے اور کبھی پتے جمع کرتا ہے تاکہ سردی کے موسم میں چولھا بھی جلے اور کانگڑی کے لئے کوئلہ بھی بن جائے۔یخ آلودہ سردی میں اس کے پاس گرم کپڑے بھی نہیں ہوتے ہیں اور کانگڑی کا سہارا لے کر دوسرے بچوں کو تماشا دیکھتا رہتا ہے۔جو سردی کے موسم میں برف کا پتلہ بناتے ہیں اور یہ غریب لڑکا ہمیشہ ان بچوں کو دیکھ کر ہی اپنا دل بہلاتا ہے۔کیونکہ غریبی کی وجہ سے اس نے بہت کم کپڑے پہنے ہیں اور ان مختصر کپڑوں میں اس کو زیادہ سردی محسوس ہوتی ہے:

''لیکن رحمٰن کالڑکا گیا نہیں، گہری نظروں سے چنار کو دیکھتا رہا جس طرح وہ سردیوں کے دنوں میں پاس والی کوٹھی کے بچوں کو دیکھتا رہتا ہے جو گرم گرم کوٹ، لمبے لمبے سیاہ جوتے پہنے برف کا آدمی بناتے ہیں۔اپنی جھونپڑی کے دروازے سے لگ کر وہ دیکھتا رہتا ہے اور پیٹ کے ساتھ لگی ہوئی کانگڑی کو اتنے زور سے دبانا شروع کرتا ہے جیسے اُس کی آگ کو پیٹ کے اندر ڈالنا چاہتا ہو۔کوٹھی والے بچے برف کے آدمی کی آنکھوں میں بڑے بڑے کوئلے ڈالتے ہیں۔اس عمل کے دوران بہت سارا کوئلہ ضائع ہوجاتا ہے وہ اپنے ڈیڈی کی ہیٹ برف کے آدمی کے سر پر رکھتے ہیں اور اُس کے گلے میں ڈیڈی کا مفلر ڈالتے ہیں۔ پھر ان کی ماں جو گرم اُونی شال میں لپٹی ہوئی ہے باہر آتی ہے......

اور عین اُسی لمحے رحمان کی بیوی اپنے لال سے کہتی ہے۔

''بدبخت......ابھی تو تماشا دیکھ رہا ہے جا لکڑیاں چن کے لا۔''۶۵؎

اس افسانے میں عمر مجید نے ایک اور نقطے کو بھی اُبھارہ ہے کہ خزاں کے موسم میں یہاں کے لوگ درختوں کے پتے جمع کرتے ہیں اور موسم سرما کے لئے ان سے کوئلہ بناتے ہیں اور ان پتوں کو چولھا جلانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔عورتیں پتے جمع کرتے وقت گیت گاتی رہتی ہے۔جس کو عمر مجید نے یوں پیش کیا ہے:

''پھر جب شام کی ہوئیں زیادہ خنک ہونے لگیں اور دور مغربی پہاڑوں پر سال میں پہلی برف گری تو چنار کے سارے پتے سُرخ ہوکر زمین پر گر گئے پھر ایک چمکیلی صبح کو رحمان اس کی بیوی اور اس کے سب بچے پتوں کو ڈھروں میں جمع کرنے لگے۔رحمان کی بیوی ہلکی لے میں گانے لگی جیسے برف گر رہی ہے۔

جاڑے بیت جائے گا

برف پگھلے گی

اور بہار آئے گی۔''٦٦؎

کشمیر میں غریب سے غریب آدمی کو رہنے کے لئے ایک گھر ضروری ہونا چاہئے ورنہ یخ آلودہ سردیوں کے موسم میں بغیر مکان کے کوئی زندہ کیسے رہ سکتا ہے اور اس سے بھی ضروری مکان کا چھت ٹین یا گھاس سے ڈھکا ہونا چاہئے۔یہاں کی عوام کو پورے سال سردیوں کی فکر لگی رہتی ہے۔موسم سرما کے لئے لکڑیاں، کانگڑی، گرم کپڑے یہاں تک کہ کھانے پینے کا انتظام بھی کرنا پڑتا ہے۔ان ہی نقطوں میں ایک باریک نقطے کا ذکر عمر مجید افسانہ ''برف کے پھول'' میں کرتے ہیں۔جس کا مرکزی کردار ایک بوڑھے ماں باپ کا بیٹا احمد ہے۔اس کو دو اہم کام کرنے ہے۔ایک غریب ماں باپ کی خوشی کے لئے شادی اور دوسرا اپنے مکان کا چھت ٹھیک کرنا ہے تا کہ سردی کا موسم کاٹنا محال نہ ہو جائے۔وہ شادی سے زیادہ ضروری مکان کا چھت ٹھیک کرنا سمجھتا ہے اور اس کی فکر میں پریشان رہتا ہے:

''اگر مکان کی چھت اس برس بھی نہ بدلی جا سکی تو سرما میں یخ آلودہ

برف زندہ نہ رہنے دے گی۔ گذشتہ برس ٹین کے خالی کنستروں کو سیدھا
کر کے چھوٹے بڑے سوراخ وقتی طور بند کئے گئے تھے لیکن اب وہ بھی
سڑ چکے تھے۔ چھت کو سہارا دینے والی لکڑی گل سڑ گئی تھی۔ برف کے
بوجھ سے چھت کے بیٹھ جانے کا اندیشہ تھا۔'' ٦٧

افسانہ ''پرچھائیاں'' میں انھوں نے ڈونگے میں رہنے والے ایک ہانجی کی کہانی بیان کی ہے۔ جس کے ڈونگے میں سیاح آ کر ٹھہرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی روزی روٹی کماتا ہے۔ جو یہاں کے ہانجی لوگوں کا پیشہ ہے۔ اس ہانجی کا نام جبارا ہے۔ ایک روز جبارا کے ڈونگے میں ایک جرمن سیاح ٹھہرتا ہے۔ اس دوران جبارا غلط فہمی کا شکار ہوجاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس کی بیوی اور اس جرمن کے بیچ ناجائز تعلقات ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بیٹے رحمان کو بھی ناجائز قرار دیتا ہے۔ یہ بات رحمان کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔ اس کو کھیل کود کا بھی کوئی شوق نہیں رہتا ہے صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ اسی ایک باریک مسئلہ کو عمر مجید نے ابھارا ہے۔ اقتباس:

''رحمان بہت خاموش رہنے والا لڑکا ہے۔ نہ دوسرے ہانجی لڑکوں کے
ساتھ بنڈ پر جُوا کھیلتا ہے اور نہ سگریٹ کے ٹوٹے کان کے پیچھے رکھتا ہے
خاموش سے اپنے شکارے میں بیٹھا رہتا ہے۔ کوئی گاہک مل جاتا ہے تو
خاموشی سے چپو سنبھال کر اس کو ڈل کے پار لے جاتا ہے۔'' ٦٨

وریندر پٹواری ١١ستمبر ١٩٤٠ء کو اپنے ننہال سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کشمیر میں ہوئی۔ پھر سول انجینیرنگ (ایم۔ائی۔ای) پنجاب سے حاصل کی۔ ١٩٦٤ میں کشمیر آ کر جونیر انجینیر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ١٩٧٠ میں پرموشن ہوکر جموں منتقل ہوئے اور آخر میں محکمہ ارگیشن سے executive engineer کے عہد سے سبکدوش ہوئے۔ ان کا تخلیقی سفر ابھی رواں دواں جاری ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ''سسکیاں (١٩٦٥)'' ماہنامہ ''صبح امید'' ممبئی سے شائع ہوا۔ ان کے نو افسانوی مجموعے ''فرشتے خاموش ہیں (١٩٨١)'' ''دوسری کرن (١٩٨٦)'' ''بے چین لمحوں کا

تنہا سفر (۱۹۸۸)'' آواز سرگوشیوں کی (۱۹۹۴)''ایک ادھوری کہانی (۲۰۰۲)'' ''افق (۲۰۰۳)'' دائرے (۲۰۱۰)'' آفتوں کے دور میں (۲۰۱۱)'' اور لالہ رخ (۲۰۱۳)'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامہ بھی لکھتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کے دو مجموعے ''دن'' اور ''انسان'' بھی شائع ہوئے ہیں اور کشمیری زبان میں ایک افسانوی مجموعہ ''علم (۲۰۰۷)'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

وریندر پٹواری کے افسانے زندگی کے مختلف رنگوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھوں نے اکثر اپنے افسانوں میں کشمیر اور کشمیری عوام کے مسائل اُبھارے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں کہیں کہیں پر کشمیر کے تہذیبی و ثقافتی پہلو، جیسے نمکین چائے، قہوہ، برف، گانگڑی اور وازوان وغیرہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کشمیر کی ایک بڑی آبادی شکاروں میں آباد تھی اور کم و بیش آج بھی ہے۔ ان لوگوں کو یہ شکارے بہت عزیز ہوتے ہیں اور ان شکاروں کو الگ الگ ناموں سے پکارتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ پانی میں آباد ہوتے ہیں اس لئے ان کا روزگار بھی اسی کے ساتھ جڑا ہے۔ کاشتکاری کے لئے ان کے پاس زمین نہیں ہے اس لئے دریائی پھل، مچھلیاں، سگاڑے، کنول وغیرہ سے اپنا گزارا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا روزگار سیاحوں پر منحصر ہے جن کو یہ اپنی کشتیوں میں ڈل جھیل کی سیر کراتے ہیں اور شام کو اپنے بھوکے بچوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ مگر اب فسادات کی وجہ سے یہ روزگار بھی ان کے پاس نہ رہا۔ اس کی عکاسی وریندر پٹواری نے افسانے ''برف'' میں کی ہے:

> ''کہ یہ نوح کا سفینہ نہیں ہے! یہ میری ناؤ ہے۔ ہم لوگ اس کو شکارا کہتے ہیں! لگتا ہے تم یہاں ایک اجنبی ہو یا پھر یہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو! ہمارے شکارے ہمیں اپنے بچوں کی طرح پیارے ہیں! ہم ان کو نام دیتے ہیں! جیسے میرے شکارے کا نام ''جنت'' ہے............ یہ جھیل کا وہ گھاٹ ہے جہاں ہر وقت درجنوں شکارے موجود رہتے تھے! سیاحوں کو جنت کی سیر کرانے کی خاطر۔! مگر اب یہاں کوئی نہیں ہوتا ہے! میں بھی اس لئے آیا تھا کہ شاید کوئی سیاح یا سواری ملے تاکہ آج چوتھے دن تو بھوکے بچوں کو کھانا کھلاسکوں۔''۶۹

افسانہ ''رسرتھ'' میں انھوں نے برف کا موسم پیش کیا ہے۔ اس موسم میں لوگ اکثر کانگڑی لے کر گرتی برف کا تماشا دیکھ کر مزا لیتے ہیں ہر طرف برف ہی برف نظر آتا ہے۔ ایسے میں مکان کے چھتوں سے برف گرنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں اور ان چھتوں کے ساتھ برف کے ٹکڑے اویزان ہوتے ہیں۔ جن کو بچے اکثر توڑ کر کھانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اس منظر کی ایک مثال وریندر پٹواری کے افسانے سے ملاحظہ ہو:

> ''مگر برف سے اُس کو بہت پیار تھا! جب ہی تو وہ اکثر کانگڑی تاپتے ہوئے دہلیز پر بیٹھ کر بڑے اشتیاق سے برف پوش وادیوں کو دیکھتی رہتی تھی! کبھی گرتی ہوئی برف دیکھتی رہتی تھی اور کبھی اپنے مکان یا دوسرں کے چھتوں سے لٹکے ہوئے لمبے لمبے برف کے ٹکڑوں کو دیکھ کر ان کو چھونے کی یوں کوشش کرتی رہتی تھی جیسے کسی پہاڑی پر چڑھ کر آسمان پر لٹکتے ہوئے ستاروں کو پکڑنا چاہتی ہوں گی۔''۷۰

افسانہ ''لالہ رخ'' میں انھوں نے کشمیر میں ہندو مسلمان اتحاد کو اُبھارہ ہے۔ کشمیر میں ابتداء سے ہندو لوگ آباد تھے بلکہ پوری آبادی ہی شروع میں ہندو تھیں جو بعد میں دھیرے دھیرے اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ مگر پھر بھی چند اعلیٰ ذات کے لوگ اپنی جگہ اڑے رہے۔ لیکن کبھی کسی نے ایک دوسرے کے ساتھ مداخلت نہیں کی۔ دونوں مذہب کے لوگ آپس میں خلوص سے پیش آتے رہے اور ایک دوسرے کے غم وخوشی میں شریک ہوتے تھے۔ جس کو آج بھی وہ کچھ لوگ یاد کرتے ہیں۔ جن کو ترک کشمیر کرنے پر اکسایا گیا تھا اور پھر ملک کے مختلف ریاستوں میں آباد ہوئے۔ اسی بھائی چارہ اور پیار ومحبت کے تہذیبی ورثے کو وریندر پٹواری اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''ہمارے محلے میں ایک ہی مسلمان کا گھر تھا اور حسن نانوائی کا مکان سے جڑا ہوا تھا! اور اتفاقاً حسن چاچا روزا اپنے تندر سے نکالی گئی پہلی روٹی مجھے کھلایا کرتا تھا حالانکہ اُن دِنوں ہند اور مسلمان دونوں ایک دوسرے سے جذباتی اور خیالاتی ہم آہنگی کے باوجود ایک دوسرے کے

گھروں میں کھایا پیا نہیں کرتے تھے بلکہ ایسے موضوعات کو جن پر بحث
کرنے سے برف سے بھی حرارت ہونے کے خدشات، اندیشے یا
دوریاں پیدا ہوسکتی تھیں ان کو مصلحتاً نظر انداز کیا جاتا تھا۔ یعنی لوگ ایک
دوسرے کی عزت بھی کرتے تھے اور بے پنا محبت بھی۔''اے

اس کے علاوہ قہوہ اور نمکین چائے کا ذکر بھی انھوں نے افسانہ ''روبوٹ'' میں کیا ہے۔ جس کے کشمیری لوگ خاص کر بڑے بزرگ شیدائی ہوتے ہیں یہ دونوں چیزیں یہاں کی صدیوں پرانی تہذیبی ورثے ہیں۔ ان کا اہتمام اکثر مہمان ہو یا میزبان، خوشی ہو یا غم میں رکھا جاتا ہے۔ ان کی عکاسی تقریباً ہر افسانہ نگار نے کی ہے اور ورییندر پٹواری کے یہاں بھی ملتی ہے:

''چاول مانگ لوں تو وہ روٹیاں کھلانے کے لیے بضد رہتا ہے! کشمیری
نمکین چائے پینے کی تو حسرت ہی رہ جاتی ہے! اور کم بخت اب قہوہ میں
بھی شکر نہیں ڈالتا!''۲ے

بشیر شاہ ۲۱ فروری ۱۹۴۳ء کو سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے (اردو) کرنے کے بعد ریڈیو کشمیر سرینگر میں بطور سکرپٹ رائٹر تعینات ہوئے۔ اور ریڈیو کے لئے بہت سارے ڈرامے بھی لکھے۔ ان کا ایک ڈرامہ ''تم میرے پاس ہو'' بہت مقبول ہوا۔ ریڈیو کشمیر نے انھیں انعام سے بھی نوازا ہے۔ بشیر شاہ کے مطابق ان کا پہلا افسانہ ''رشتے'' ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی سے شائع ہوا۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''شب کے سمندر میں (۲۰۱۱)'' منظر عام پر آچکا ہے۔

بشیر شاہ کے افسانے بھی کشمیری تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے کردار شکاروں میں ڈل جھیل کی سیر کرتے نظر آتے ہیں۔ جس کی عمدہ مثال افسانہ ''میرے اندر کا موسم'' پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ''برف کا درد'' میں کشمیر کے ایک عام غریب شخص کی روداد کو اس طرح پیش کیا گیا ہے جس سے وہاں کے عوام کو سردی کے موسم میں پیش آنے والے مشکلات سامنے آتے ہیں۔ بہ ظاہر وادی میں برف باری کا موسم جتنا دلکش اور دلفریب نظر آتا ہے۔ اس سے کئی زیادہ سخت اور کٹھن

بھی ہوتا ہے۔ جو بشیر شاہ کے افسانے ''برف کا درد'' کے اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے:

''اس برف باری نے ساری وادی کا حلیہ ہی بدل ڈالا، سپید، سپید، اجلی اجلی سی برف گرتی ہے تو کتنی دلکش اور دلفریب لگتی ہے، فضاؤں میں روئی کے گالوں سی تیرتی ہوتی یہ برف واقعی عجب نظارہ پیش کرتی ہے! اور جب یہی نرم نرم سی، دھلی دھلی سی برف سخت ہو کر جم جاتی ہے تو سارے منظر سوئی کی طرح بدن میں چُبھ جاتے ہیں۔ مفلسی اور ناداری میں خوبصورتی کی حس گویا مرجاتی ہے! برف جم چکی تھی، ہوائیں خنک ہو چلی تھیں، راستوں کی پھسلن بڑھ گئی تھی اور برفیلی ہواؤں کے تیز جھونکے کانوں کو سُن کر رہے تھے۔''۳۷

اس کہانی کا مرکزی کردار احمد ہے اور اس کی بیوی کا نام زونی ہے جو اپنے شوہر کی فرما بردار اور ہمدرد ہے۔ گرما کے موسم میں تو لوگ ایسے تیسے زندگی گذارتے ہیں مگر سرما کے موسم میں ان کے اخراجات کافی بڑھ جاتے ہیں۔ احمد ہمیشہ پھٹا پرانا کمبل اوڑھتا رہتا ہے۔ سر پر میلا کنٹوپ اور پھٹا پرانا جوتا پہنتا ہے جس کی وجہ سے اس کے پیروں میں ''شہو'' ہو جاتا ہے یعنی پیر سردی کی وجہ سے سڑ جاتے ہیں۔ زونی روز گرم پانی سے اس کے پیر دھوتی ہے تاکہ اس کا ''شہو'' ٹھیک ہو جائے جس کی وجہ سے وہ چل بھی نہیں پا رہا ہے۔ احمد کچھ بچے کچے پیسوں سے اپنے لئے جوتا لانے کے بجائے زونی کے لئے پھرن لاتا ہے تاکہ وہ اسے خوش کر سکے مگر زونی خوش ہونے کے بجائے اور مایوس ہو جاتی ہے۔ اقتباس:

''رونی کا پھٹا ہوا فرن (پیرہن) دیکھ کر رہا نہ گیا چپکے سے اپنی وفا شعار بیوی کے لئے فلالین کا کپڑا لے آیا، فرن کا کپڑا دیکھ کر زونی کو ذرا بھی خوشی نہ ہوتی الٹا احمد کو ٹوکا کہ وہ کپڑا لوٹا کر اپنے لئے جوتا خرید لائے۔ فرن تو آج کل میں آ ہی جائے گا...... آخر اسے جانا کہاں ہوتا ہے؟ گھر ہی میں تو رہتی ہے وہ؟...... مگر احمد بھی کہاں ماننے والا تھا حالانکہ سردی

کے کارن اس کے اپنے پاؤں شل ہوگئے تھے، داہنے پاؤ میں ''شہو'
ہوگیا تھا، سچ تو یہ ہے کہ وہ ٹھیک سے چل پھر بھی نہیں سکتا تھا۔'' ۴۷؎

خالد حسین یکم اپریل ۱۹۴۵ء کو ادھم پور جموں میں پیدا ہوئے۔ وہ اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی افسانے لکھتے ہیں۔ پنجابی زبان میں ان کے چار افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں اور اردو میں ان کے تین افسانوی مجموعے ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں (۱۹۸۱)'' ''اشتہاروں والی حویلی (۱۹۹۱)' اور ''ستی سر کا سورج (۲۰۱۱)'' اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے افسانوں میں لوٹ مار، گولی بارود، قتل غیرت، خوف ودہشت، ظلم و بربریت، کشمیری عوام کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ اور کشمیری تہذیب وثقافت کا نظام کارفرما ہے۔''ستی سر کا سورج'' کشمیری تہذیب وتاریخ پر لکھا گیا ان کا شاہکار افسانہ ہے۔''ستی سر'' کشمیر کا پہلا نام ہے جب کشمیر ایک گہری جھیل کی شکل میں موجود تھا۔ یہ افسانہ کشمیر کی مشترکہ تہذیب کے بکھراؤ کا تجزیہ ہے۔خالد حسین چودھویں صدی کے تہذیب وثقافت کی یاد دلاتے ہیں جس کی بنیاد صوفیوں اور سنتوں نے پروان چڑھائی تھی اسی تہذیب کو پیش کر کے وہ یہاں کے ستم زدہ عوام کو روشن مستقبل کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔اوراس منفرد تہذیب وثقافت کی حفاظت کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔نندرش جس کا نام شیخ نورالدین ولی چودھویں صدی کا مشہور ومعروف درویش اور صوفی شاعر گزرا ہے۔اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔جس کا پورا تعارف اس کہانی میں پیش کیا گیا ہے۔وہ یہاں کے عوام کا رہبر مانا جاتا تھا اور اسے کہانی میں جب تلاش کرنے کی بات آتی ہے تو کشمیر کے مختلف مقامات کا ذکر بھی ساتھ میں آتا ہے:

''آپ نندرشی کو نشاط کے ان پتھروں میں دھونڈو جہاں واسوگپت کو شیو فلسفے کا گیان ملا تھا۔ پھر بھوانی کے چناروں، مارتنڈ کے مندروں، شاردا مٹھ اور مٹن بھون میں تلاشو۔ڈل، گنگ بل، مانس بل، وتر اور کوثر سر کے پانیوں میں ڈھونڈو۔ ویری ناگ اور ناگ بل کے ناگوں سے دریافت کرو۔بُلبُل شاہ کی کمبلی اور شاہ ہمدان کے کلس میں دیکھو کھپت

کھلیانوں اور کیسر کیاریوں میں جاؤ۔ اپنی زبان اور ثقافت میں تلاشو۔
لوک گیتوں اور شلوکوں کی لَے میں محسوس کرو۔ دیوں کی دھڑکنوں اور
سانسوں کی گرماہٹ میں محسوس کرو۔ سیبوں اور باداموں کے باغوں
میں جاؤ۔ رنگ برنگے پھولوں کو سونگھو۔ برف پوش چوٹیوں کی خوبصورتی
میں تلاش کرو۔ تمہارا مرشد تمہیں ضرور ملے گا۔'' ۵؎

''لکیر'' کشمیر کی تاریخ پر مشتمل ان کا ایک اور افسانہ ہے۔ ملک کی ہر ریاست کی طرح کشمیر بھی تقسیم ہوا تھا۔ ہر طرف فسادات برپا ہوئے تھے۔ بے شمار لوگ مارے گئے۔ کئی خاندان ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ باپ بیٹے سے، بیویاں شوہروں سے الگ ہو گئیں اور کئی سال سے آپس میں ملنے کی تڑپ دل میں دبائے بیٹھے تھے۔ اس کہانی میں متکلم کئی سالوں کے بعد سرینگر سے مظفر آباد جانے والی بس میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ بس تقسیم ملک کے بعد آج پہلی بار مظفر آباد جا رہی تھی۔ اسی دوران ان سے ملنے ایک چاچا ''سجاول چودھری'' آتا ہے جو اپنی بیوی صابری سے تقسیم کی وجہ سے الگ ہو گیا تھا اور اُس تک اپنا پیغام پہنچانے کی گزارش کرتا ہے۔ سجاول چاچا کے آتے ہی انھیں نمکین چائے پیش کی جاتی ہے۔ جو کشمیر کی صدیوں پرانی روایت ہے:

''لیکن وہ صحتمند دکھائی دے رہا تھا۔ لمبا، خوبصورت اور مضبوط جسم کا
مالک ہم دونوں کمرے میں بچھی قالین پر بیٹھ گئے۔ میں نے دیسی نمکین
چائے منگوائی اور پھر بزرگ سے کہا۔'' ۶؎

پھر سجاول چاچا اپنی پوری کہانی سناتا ہے۔ مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کر لیا اور قبایلیوں کو ریاست میں پسپا کیا۔ صابری اپنی ماں سے ملنے گئی تھی اور وہی رہ گئی۔ پھر آخر ۸۰ سال کی عمر میں صابری اپنی بچوں اور شوہر سجاول چاچا سے ملنے تو آتی ہے مگر اس عمر میں بھی اسے اپنے خاندان کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں ملتی ہے اور مرتے مرتے صابری کو واپس مظفر آباد لے جایا جا رہا تھا۔ اسی فرسودہ سرکاری نظام پر خالد حسین ملامت کرتے نظر آ رہے ہیں۔

''ایک مرے بندے کی کہانی'' کشمیری نو جوانوں پر ظلم و بربریت کی داستان ہے۔ کہانی

کا مرکزی کردار منظور ''پن چکی'' پر کام کرتا ہے جو اس کے گھر سے تین کلومیٹر دور ہے۔ ایک دن برف باری زیادہ ہونے کہ وجہ سے منظور کو پن چکی میں ہی رہنا پڑھتا ہے۔ اس کے پاس وہاں کچھ بندوق بردار آتے ہیں اور اسے کھانا مانگتے ہیں اور رات بھر وہی ٹھہرتے ہیں۔ منظور انھیں کشمیر کا ہلکا پھلکا کھانا کھلاتا ہے:

> ''میں نے مکئی کا آٹا گوندھا اور روٹیاں پکائیں۔ موٹھ اور آلو کا سالن بچا ہوا تھا۔ اخروٹ کی گریوں، پُودینے اور تمرو کی چٹنی بنائی اور کھانا ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بھی بھوکے تھے اس لیے چند منٹوں میں ہی کھانا کھا کے فارغ ہوگئے اور میرے ساتھ باتیں کرنے لگے۔''[۷]

اس بات کو منظور کی خطا سمجھ کر پولیس اسے روز ستاتے ہیں جس میں پولیس کو رشوت دیتے دیتے اس کی ساری زمین جایداد فروخت ہوجاتی ہے۔ منظور پولیس کے ظلم وستم سے تنگ آ کر ان ہی بندوق برداروں کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے اور آخر ان ہی کے ہاتھوں مارا بھی جاتا ہے کیونکہ وہ حق پرست تھا۔

''سانجھا درد'' میں بھی کشمیری تہذیب وثقافت کے نقوش سامنے آتے ہیں۔ گاش لعل کول اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ ''اپنا کشمیر'' جماعت کی طرف سے ایک جلسے میں گاش لعل کول کشمیر کے بارے میں سرکار کی کمزور پالسیوں کی نقطہ چینی کرتا ہے۔ یہ جماعت کشمیر سے فرار ہونے والے لوگوں کی طرف سے شروع کی ہوئی ہوتی ہیں۔ گاش لعل کول کشمیر میں علحید گی پسند تحریک چلانے والوں اور دہشت پھیلانے والوں کو جی بھر گالیاں دیتا ہے اور سب تالیاں بجا کر چلے جاتے ہیں۔ اسی دوران اس کی نظر ایک کشمیری آدمی کی طرف پڑتی ہے جو کشمیری پھرن پہنے، سر پر پگڑی اور پشمینے کا شال پہنے ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوجاتا ہے دونوں آپس میں گلے ملتے ہیں اور ایک دوسرے سے متعارف ہوجاتے ہیں۔ یہاں پر کشمیری عوام کا آپسی بھائی چارہ بھی ظاہر ہوتا ہے جو یہاں کی صدیوں سے چلی آرہی روایت کا تحفہ ہے:

''خواجہ صاحب! میں نے بھی آپ کو کہاں پہچانا ہے۔ میں تو آپ کو
بالکل نہیں جانتا۔ آپ کو کشمیری لباس میں دیکھ کر میں اپنے جذبات پر
قابو نہیں رکھ سکا اور بے اختیار آپ کو گلے لگا لیا۔ آپ کو گلے لگا کر مجھے
ایک سکون سا ملا۔ آپ سے گلے مل کر مجھے لگا کہ میں کشمیر کو گلے لگا رہا
ہوں اور پنڈ گاش لعل کول نے خواجہ صاحب کو ایک بار پھر اپنی بانہوں
میں لے لیا...... اور فرطِ جذبات میں دونوں کی آنکھوں سے جہلم اُمڈ
پڑا۔'' ۸ے

اشوک پٹواری اصل نام اشوک کمار پٹواری کی ولادت اکتوبر ۱۹۴۸ء کو سوپور کشمیر میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کشمیر میں حاصل کی۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس پٹیالہ سے کیا۔ پھر دہلی یونیورسٹی سے ایم۔ ڈی اور ایم۔ این۔ اے۔ ایم۔ ایس کرنے کے بعد بائیس سال تک لیڈی ہارڈینگ میڈیکل کالج دہلی میں بحیثیت پروفیسر کام کرتے رہے اور اب ہمدرد انسٹٹوٹ آف میڈکل سائنسز اینڈ ریسرچ دہلی میں صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اشوک پٹواری کا خاندان علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ ان کے والد مسرور کشمیری اور بڑے بھائی وریندر پٹواری ادب میں خاصا نام کما چکے ہیں۔ ان کی کہانی ''ساکھشی (۱۹۶۸)'' ماہنامہ ''نگینہ'' (سرینگر) میں شائع ہوئی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ بعنوان'' کچھ لمحے کچھ سائے (۲۰۰۵)'' شائع ہو چکا ہے۔ مزید ریڈیو کے لئے ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔

اشوک پٹورای نے اپنے افسانوی میں سماج کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ انھوں نے طبقاتی مسائل، بچوں اور عورتوں کا استحصال، لوٹ مار، غریبی، بھوک اور بیماری وغیرہ جیسے موضوعات پر قلم اُٹھایا۔ ان کے کردار دور حاضر کے مجسمے نظر آتے ہیں۔ اشوک پٹواری پیشے سے ایک ڈاکٹر ہے اس لئے ان کے یہاں ہسپتال کا ماحول، مریض، بیماری اور دوائی کا ذکر عام ملتا ہے۔ ان کی کہانیاں ایک ملی جلی تہذیب کی عکاسی کرتی ہیں۔ تاہم انھوں نے اپنے افسانے ''فریاد'' میں کشمیری

ماحول اور منظر کو اُجاگر کیا ہے:

''اس کے سامنے جھیل ڈل کا دور تک پھیلا ہوا پانی جس کی ٹھہری ہوئی سطح پر دوسفید مرغابیاں ہلکورے بنائے ہوئے اونٹ کدل، کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ فلک پر آفتاب اپنی آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور اس کی سنہری کرنیں ہاری پربت کے قلعے پر کچھ اس طرح روشن ہورہی تھیں جیسے قلعے کی دیواریں سونے کی بنی ہوں۔ اور ہاری پربت کا جھیل کے پانی میں نظر آنے والا عکس اس قدر خوبصورت تھا کہ وہ دل ہی دل میں جھوم اٹھی تھی۔ دور کنارے پر اِکا دُکا شکارے اس لاجواب تصویر میں کچھ اور خوبصورت رنگ بھر رہے تھے۔ کتنا خوبصورت ہے میرا وطن، میرا کشمیر باغ بہشت کا تصور اس سے زیادہ حسین تو نہیں ہوسکتا۔''۹ے

کشمیر کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ انھوں نے کشمیری پانڈوں اور کشپ رشی کو پیش کر کے افسانہ ''فریاد'' میں کشمیر کی ایک تاریخ کو سمٹنے کی کوشش کی ہے۔ کشمیر پر حکومت کرنے والا پانڈو خاندان ہندو عہد کا ایک بہادر خاندان مانا جاتا تھا اور کشپ رشی کے تعلق سے یہ رائے قائم ہے کہ انھوں نے ہی موجودہ کشمیر کی بنیاد ڈالی ہے۔ جو پہلے ستی سر کے نام سے ایک گہری جھیل تھی۔ افسانے میں اشوک پٹواری ان ہی بہادروں کے شہر میں ایک لاچار دوشیزہ کی عزت کو لوٹتے دکھاتے ہے۔ جس کا باپ ایک بم بلاسٹ میں بُری طرح زخمی ہوکر اپنے دونوں ہاتھ گوا بیٹھا تھا اور بھائی کراس فائرنگ میں ہلاک ہوا تھا۔ اس صدمے سے ماں دماغی توازن کھو چکی تھی۔ ان موزور ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی ان کی لڑکی تین غنڈوں کے ہاتوں لٹ جاتی ہے اور وہ دونوں حالات کا شکار ہونے کی وجہ سے اپنی بیٹی کو نہیں بچا پاتے ہیں اور نہ ہی کوئی پیر فقیر، سادھو یا کوئی بہادر مرد اس کو بچاتا ہے۔ اسی المیہ کو اشوک پٹواری یوں بیان کرتے ہیں:

''یہ ایک بڑا المیہ تھا کہ کہیں کوئی پیر دستگیر کوئی سادھو مہاتما کوئی درویش

دکھائی نہیں دے رہا تھا۔آج کے اس کروکھشیر میں ارجن اپنا گانڈیو (Gandiv) کمان اٹھائے بغیر ہی میدان جنگ چھوڑ کرآیا ہے اور سچائی کے لیے لڑنے والے پانڈو بزدلی کا چولا پہن کرکہیں چھپے بیٹھے ہیں یا نروان حاصل کرنے کے لیے گھنے جنگلوں میں روپوش ہو گئے ہیں۔ اس مہابھارت میں کوروپانڈووں کا بھیس بدل کر دروپدی کی عزت پر ہاتھ ڈال رہے ہیں اور بھگوان کرشن کو اس لاچار دوشیزہ کی چیخ وپکار سنائی ہی نہیں دیتی۔ کشب رشی کی بیٹی کبھی اتنی بے سہارا اور مجبور نہ تھی۔‘‘۸۰

جان محمد آزاد ۱۹۴۸ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ان کے والد ملازمت کے دوران کشمیر کے پہاڑی علاقہ کنگن میں رہے۔ والد کے ساتھ جان محمد آزاد کو بھی ان پسماندہ علاقوں میں گھومنے کا موقعہ ملا اوران کی زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا۔ جان محمد کا پہلا افسانہ ’’جمی‘‘ اسلامیہ کالج کے میگزین ’’بادام وادی‘‘ میں شائع ہوا۔ان کا ایک افسانوی مجموعہ ’’آشاں سے آسماں تک (۲۰۰۹)‘‘ شائع ہوا ہے اور تین ناول ’’وادیاں بلا رہی ہیں‘‘ ’’کشمیر جاگ اُٹھا‘‘ اور ’’ظلمات‘‘ منظر عام پر آچکے ہیں۔ایک شعری مجموعہ ’’الوداع موسمی پنچھی (۱۹۹۹)‘‘ بھی شائع ہوا ہے۔اور ایک کتاب ’’جموں وکشمیر کے اردو مصنفین (۲۰۰۴) میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کا تعلق صحافت سے بھی ہے جس کے حوالے سے ان کی کتاب ’’آدابِ صحافت‘‘ آہمیت کی حامل ہے۔

جان محمد آزاد کی کہانیاں حسن کشمیر کی آئینہ دار ہیں۔ان کے افسانوں میں صرف حسن کشمیر ہی نہیں ہے۔ بلکہ انسان دوستی، کشمیری عوام کی پسماندگی اوران کا درد وغم بھی موجود ہے۔انھوں نے دور دراز پسماندہ پہاڑی علاقوں کی زندگیوں کو اپنی کہانیوں میں اُبھارا ہے۔ان کے یہاں موسم خزاں اور سرما کا ذکر عام ملتا ہے۔انھوں نے گاؤں اور موسم سرما کے تہذیبی وثقافتی پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے اُجاگر کیا ہے۔کشمیر میں بہت سارے زیارت گاہ موجود ہے جہاں پر کوئی ولی خدا دفن

ہوتے ہیں۔ان زیارت گاہوں پر دور دراز سے بے شمار عقیدت مند اپنی مرادیں لیکر حاضر ہوتے ہیں اور اپنی حاجت روائی کے لئے رنگ برنگ دھاگے اور کپڑے باندھتے ہیں۔اس بات کو جان محمد نے افسانہ ''لالۂ طور'' میں اُجاگر کیا ہے:

''چنار کی گھنی چھاؤں میں آستانے کی لکڑی کی بنی عمارت اس قدر شکستہ ہوچکی تھی کہ اس کا ہر تختہ اب سیاہ رنگ اختیار کر چکا تھا۔ چنار کی نچلی شاخیں عقیدت مندوں کے باندھے رنگ برنگے دھاگوں اور کپڑوں کے ٹکڑوں سے لدی ہوئی تھیں۔ اطراف واکناف میں رہنے والوں کے لئے اس آستانے کی خاک متبرک تھی۔ باغاں نے بھی اپنے بیٹے کی سلامتی کیلئے منت مانگی۔ وہ آستانے کے باہر ایک گوشے میں درجن بھر دوسری پہاڑی عورتوں کے ساتھ نماز ادا کرتی رہی۔''۸۱؎

کشمیری لوگ پرانے زمانے میں چائے کے ساتھ ''ستو'' کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ آج بھی کہیں کہیں پر لوگ اس روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔''ستو'' مکئی،سویابین یا چاول کے آٹے کو بھون کر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ یہاں کی برسوں پرانی روایت ہے جس کا ذکر جان محمد بھی اسی کہانی میں کرتے ہیں:

''دوسرے روز صبح باغاں جنگل نہیں گئی وہ گُل کے جاگنے کی منتظر رہی۔ پھر جب وہ منہ ہاتھ دھوکر چائے اور ستو پی چکا تو ماں نے نہایت شفقت بھرے لہجے میں اُسے باہر جانے سے منع کیا۔''۸۲؎

جان محمد نے پہاڑی لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں اخروٹ، ناشپاتی،خوبانی،مکئی وغیرہ زیادہ پائے جاتے ہیں۔اس لئے ان کا ذکر ان کے یہاں عام ملتا ہے۔سردی کے موسم میں جب برف باری ہوتی ہے تب جنگلی مرغے جنگلوں سے بستی کی طرف آتے ہیں اور پہاڑ کے قریب رہنے والے لوگ ان کو پکڑتے ہیں۔اسی بات کو انھوں نے ''آس کا پنچھی'' افسانہ میں علامت بنا کر پیش کیا ہے:

> ''کیا پتہ کس دن یہ زمین اور یہ شجر برف کی موٹی تہہ سے ڈھک جائیں گےاور پھر ہمیں ہفتوں کیا مہینوں تک کھانے کےایک ایک دانے کو ترسنا پڑے گا۔میری برادری کے جو مُرغ جنگل کی نشیبی بستی میں بھوک سے تنگ آکر غذا کی تلاش میں جاتے ہیں۔وہ بے چارے خود انسان کی غذا بن جاتے ہیں۔'' ۸۳؎

اس افسانے میں جان محمد نے یہاں کی ایک اور روایت کو بھی اجاگر کیا ہے۔سرما کے لئے کسان اپنے مویشیوں کے لئے بڑے درختوں پر چارے کو اس طرح محفوظ کر کے رکھتے ہیں کہ اس کے اندر بارش یا برف کا پانی جانے کے خدشات بالکل نہیں ہوتے ہیں اور پھر موسم سرما میں یہ گھاس دھیرے دھیرے اپنے مویشیوں کے لئے استعمال میں لاتے ہیں:

> ''پہاڑی دیہات کے آس پاس ایک سدابہار برف پوش پیڑ ملا اس پیڑ کی شاخوں میں مکئی کی فاضل گھاس گھڑی کی صورت میں رکھی تھی۔شاید کسی کسان نے سرما میں اپنے مویشوں کے چارے کے لئے یہ گھاس محفوظ رکھی تھی۔ذراسی تلاش کے بعد پرندے کو اس میں پکی ہوئی سرخ سرخ مکئی کے ان گنت دانے ہاتھ لگے لیکن ابھی وہ کچھ ہی دانے چگ پایا تھا کہ کسان ایک لمبی سی چھڑی ہاتھ میں لئے پیڑ سے گھاس کا گٹھا اُتار لے گیا'' ۸۴؎

کشمیری عوام کو موسم سرما کا مقابلہ الگ الگ طرح سے کرنا پڑھتا ہے۔سرما کے لئے خوراک، کپڑے، کانگڑیاں اور جوتے وغیرہ کا انتظام کرنا پڑھتا ہے۔کیونکہ برف جب زیادہ تعداد میں گر جاتی ہے تو گھر سے باہر نکلنا محال ہو جاتا ہے۔مگر پھر اس بے حد سردی میں لوگ ہاتھوں میں بیلچہ لیکر اپنے مکان کے چھتوں سے برف گراتے ہیں تب جا کے وہ آرام سے رہ سکتے ہیں ورنا چھت گرنے کا امکان ہوتا ہے۔مگر یہ بہت پہلے کی بات ہے جب کشمیری مکانوں کے چھت گھاس کے ہوا کرتے تھے۔اب ٹین نے اس کی جگہ لی ہے۔جہاں سے برف آرام سے پھسل کر نیچے گر جاتی ہیں۔

اس کی ایک مثال بھی اسی افسانے سے ملاحظہ ہو:

''دراصل یہ بھی بچے ہنستے ہنساتے چیتھڑوں میں لپٹے اپنے باپ کو دیکھ رہے تھے جو برف کے بیلچے چھت سے آگے دھکیل رہا تھا۔ برف کا پہلا تو دا جب ایک دھڑام سے نیچے گر آیا تو بچے خوشی سے چلا اُٹھے۔'' ۸۵؎

برف وادی کی جان ہے اور اسی سے اس کی پہچان۔ جس کے انتظار میں لوگ سال بھر رہتے ہیں اور مختلف طریقوں سے برف کا مزا لیتے ہیں۔ کچھ کھا کر، کچھ دیکھ کر اور کچھ کھیل کر، سرما میں دور دراز سے سیاح گلمرگ کی برف سے لدی بڑی بڑی چٹانوں پر سکنگ (پھسلن) کرنے آتے ہیں۔ نوخیز لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینک دیتے ہیں۔ اور ہنستے اچھلتے زور زور سے تالیا بجاتے ہیں۔ اس کا ذکر بھی جان محمد افسانہ ''انضمام'' میں کرتے ہیں:

''اُدھر کی یخ کی تہہ پہ شائقین کے کھیل نئے جوش وخروش سے شروع ہو گئے تھے۔ ہر طرف قہقہوں کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ اس طوفانِ بدتمیزی میں اچانک شوخیوں اور شرارت کا زاویہ بدل گیا۔ نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں نے ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینکنے شروع کئے۔ اُن کے میلے میلے چھوٹے چھوٹے ہاتھ برف پر بار بار جھپٹ رہے تھے۔ برف کا بُرا حال ہو گیا۔ اس کے ڈھیرے میں بڑے بڑے گھوئے ہوئے لیکن نوعمر لوگوں میں برف ترنگ برابر بڑھ رہی تھی۔ جونہی برف کا لہراتا ہوا گولہ کسی نوعمر کے بدن یا پھر اُس کے لباس سے چھو جاتا تو وہاں نعرے بلند ہوتے اور پھر قہقہوں کے بے پناں شور میں زور زور سے تالیاں بجائیں جاتیں۔'' ۸۶؎

شمس الدین شمیم ۱۹۴۹ء کو سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ان کا پہلا افسانہ ''باون گز کے دیوتا'' روزنامہ '' آفتاب'' سرینگر میں شائع ہوا۔ وہ خود بھی کئی سال تک روزنامہ آفتاب سے منسلک رہے۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''ویرانے (۱۹۷۴)'' شائع ہوا ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ

انھوں نے کشمیری زبان میں بھی افسانے تحریر کئے ہیں۔اور کئی ڈرامے ریڈیو اور ٹی وی کے لئے لکھے۔ حال ہی میں ۱۵مارچ ۲۰۱۳ءکو انتقال کر گئے۔

شمس الدین شمیم نے ذات پات ، رشوت خوری، جہیز، سرمایہ دارانہ نظام وغیرہ جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے پہلوؤں کو بھی سامنے لایا ہے جو کشمیری تہذیب وثقافت کی غمازی کرتے ہیں۔شال کشمیر کی قدیم صنعت ہے جس کا کاروبار یہاں بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔اس کا استعمال ملک بھر میں ہی نہیں بیرون ممالک یورپ وغیرہ میں بھی ہوتا تھا۔ اس صنعت کاری سے یہاں کے فن کار کافی واقفیت رکھتے ہیں۔جس کا ذکر شمس الدین شمیم کے افسانے''انگلیاں''میں ملتا ہے۔اس کہانی کا مرکزی کردار ممہ جو بہت بڑا فنکار ہےاور رات دن محنت کر کے شالوں پر رنگارنگ ڈیزائن بناتا ہے۔مگر اس کی محنت کا فائدہ ساہوکار خوجا سبحان اُٹھاتا ہے۔ کیونکہ ممہ جو کے پاس صرف فن ہے۔غریب ہونے کی وجہ سے وہ شال نہیں خرید پاتا ہے اس لئے خوجا سبحان سے شال لیکر ان پر کڑائی کرتا ہے۔ممہ جُو جب بھی شال تیار کر کے خوجا سبحان کے پاس جاتا ہے تو وہ ہر بار ان شالوں میں کوئی نہ کوئی نقص نکال ہی لیتا ہے اور ممہ جُو کو چند روپے دیکر ڈانتا ہے جب کہ اس کا فن داد دینے کے قابل ہوتا ہے۔ پھر خوجا سبحان ان شالوں کو اعلیٰ داموں میں فروخت کرتا ہے اور شہرت پاتا ہے۔لیکن ممہ جُو اپنی انگلیاں یہ سوچ کر کاٹتا ہے کہ یہ انگلیاں دوسروں کے محل تعمیر کرتی ہے اور اپنا گھر اُجاڑ دیتی ہے۔اس لئے اس کو اپنے فن سے نفرت ہوجاتی ہے۔اس تعلق سے افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''آرٹ پر قدرت رکھنے والا ایک عظیم فنکار تھا۔اسی باعث اُس کے بنائے ہر شال پر کام مکمل اور واضح ہوتا۔بوٹیاں دوڑتی ہوئی بیلیں اور بارڈر کے قدرتی رنگوں سے بھرے ہوئے پھول اور پتیاں شال کی زیبائش کو چار چاند لگا دیتی تھی۔ رنگ کا انتخاب شاید اُسے ورثہ میں ملا تھا۔اس کی فن کاری ملک کے ہر کونے میں پہونچتی تھی۔لیکن اس کی

شخصیت صرف ایک کمرے تک ہی محدود تھی اُسے کوئی نہیں جانتا تھا۔
مالک کو کام دیتے وقت اس کے ہاتھ کانپنے لگتے۔ وہ سوچنے لگتا کہیں
خوجا سبحان کام کو ناصاف قرار نہ دے حالانکہ اس کا فن اعلیٰ درجہ اور
شاندار ہوا کرتا تھا۔''۸۷؎

افسانہ ''رات کے سائے میں'' میں انھوں نے رسم ختنہ کو پیش کیا ہے۔ جیسا کہ اس رسم پر دوست احباب اور رشتہ دار کو دعوت دی جاتی ہے۔ گیت گائے جاتے ہیں۔ خوشی کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے اور دوست احباب طفوں کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال افسانے میں یوں دیکھی جاسکتی ہے:

''جس کے ختنہ پر پچھلے ہفتے اس نے بھیڑوں کی چار سر یاں پکا کر
دوست واحباب کو دعوت پر بُلایا تھا۔ اور خود لپک لپک کر کھایا تھا۔''۸۸؎

راجہ نذر بونیاری کا اصل نام عبدالقیوم خان ہے لیکن ادبی اور صحافتی دنیا میں راجہ نذر بونیاری کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی پیدائش ۲ جنوری ۱۹۴۹ء کو ضلع بارہمولہ، تحصیل بونیار میں ہوئی۔ ایم۔ اے اور بی ایڈ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوکر سبکدوش ہوئے۔ صحافتی دنیا میں ایک کالم نویس کی حیثیت سے ان کا کالم متواتر ہفتہ روزہ ''چٹان'' کشمیر میں شائع ہوتا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ''کلائمکس'' ۱۹۶۷ء کو ماہنامہ ''بیسوی صدی'' میں شائع ہوا۔ دو افسانوی مجموعے ''دوسرا آدمی (۱۹۷۲)'' اور ''یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں (۲۰۰۹)'' شائع ہوچکے ہیں۔ آج کلچرل اکیڈیمی میں شعبہ پہاڑی کے سرگرم رکن ہے۔

راجہ نذر بونیاری سماج کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ جن کو وہ اپنے افسانوں میں پروتے ہیں۔ ان کے یہاں کشمیر ماحول، رہن سہن، رسومات وغیرہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ڈل جھیل کا منظر، حقہ بھرنے کے لئے کانگڑی کا استعمال، وازہ وان، ون ون (گیت) وغیرہ کا استعمال ان کی کہانیوں ''تھیس''، ''سی فار کیوٹ'' اور ''پاگل خانہ'' میں ہوا ہے۔ ان کے کرداروں کے نام بھی

کشمیری ہے۔ افسانہ ''سٹیٹ منٹ'' میں جگری کے کردار کو پیش کر کے سرکاری نظام پر ملامت کی ہے اور ساتھ ساتھ کشمیری رہن سہن کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ جگری کا شوہر ساہوکار سے قرضہ لے کر دس سال کے لئے اپنے اخروٹ کے سات درخت اور آٹھ پیڑ ناشپاتی فروخت کر دیتا ہے۔ جگری محنت ومشقت کر کے مرغیاں بیچ کر اور اون کات کر ایک بکری خرید کر لاتی ہے۔ اس بکری کو بھی قرض دار لے جاتا ہے۔ جس پر جگری جیل بھی جاتی ہے اور وہاں اسے انصاف ملنے کے بجائے اس کی عصمت دری ہوجاتی ہے۔ جگری کے جیل میں رہنے سے ایک اور ثقافتی پہلو بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ جیل میں جگری کو نمکین چائے اور تیل ورو دکھانے کو دیا جاتا ہے۔ نمکین چائے تو یہاں کی شناخت ہے اور تیل ورو کشمیری روٹی میں شامل ہے۔ جس کو راجہ نذر بونیاری اس طرح پیش کرتے ہیں:

''وہ بنچ پر بیٹھ گئی اور دانت سے ناخن چبانے لگی اس آدمی نے اس کے لئے نمکین چائے کی ایک پیالی اور ایک تیل ورو لایا'' کھاؤ'' ۸۹؎

افسانہ ''جھنجھنا'' میں انھوں نے کشمیری شادی میں ادا کی جانے والی ایک پرانی رسم کو ابھارا ہے۔ جس کو'' بھانڈ پتھر'' کہتے ہیں:

''اس دن ماسٹر گلہ لون کے بیٹے کی شادی تھی برات دلہن لیکر واپس آ رہی تھی، رحمان بھانڈ شہنائی پر ایک خوبصورت گانے کی دھن بجا رہا تھا ''پارتھو گلاس گلنی نل'' اتنے میں کسی شریر بچے نے پٹاخے جلا دیا'' ۹۰؎

اس'' بھانڈ پتھر'' میں کئی آدمیوں کا ایک گروپ ہوتا ہے جو شادی بیاہ کے موقعے پر شہنائیاں بجاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ناٹک بھی کرتے تھے۔ جس کو دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ شوق سے آتے تھے۔ مگر اب پچھلے پچیس سال سے کشمیر کے حالات درہم برہم ہوگئے ہیں جس کے اثرات یہاں کے رہن سہن اور رسومات وغیرہ پر بھی پڑے۔ اب اس طرح کے رسومات صرف کتابوں میں ہی ملتے ہیں جس طرح راجہ نذر بونیاری نے اس رسم کو کشمیری گیت کے ایک مصرعے'' پارتھو گلاس گلنی نل'' کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس کے معنی ہے، تجھے میں گلاس (پھل) کے درخت کے

سائے میں سجاؤں اور سواروں۔

افسانہ ''آدھی سواری'' میں ایک طرف کشمیری لوگوں کی ایک تہذیبی وثقافتی ورثے کو اجاگر کیاہے دوسری طرف مجبور لوگوں کی مجبوری کو بھی پیش کیا ہے۔کشمیر میں ایک روایت ہے۔کہ لوگ سردیوں کا موسم شروع ہونے سے پہلے کھیتوں میں ساگ کاٹ کرلاتے ہیں اور پھر بڑے بڑے مٹی کے مٹکوں میں اچار بھر دیتے ہیں تا کہ سردیوں میں اس کو استعمال کیا جائے ،جس کو راجہ نذر نے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔راجہ نذر ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ یہ لوگ مٹکے میں روئی اور دھنیا برابر بھی جگہ خالی نہیں رکھتے ہیں مگر ان کی ایک بات سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ یہ لوگ لاتو سے بھی اس اچار کو بھر دیتے ہیں۔جہاں تک میں جانتا ہوں صرف ہاتھوں اور مکوں سے ہی اچار بھر دیا جاتا ہے:

> ''اس روٹ پر چلنے والی سبھی بسوں میں مسافر سوار نہیں ہوتے تھے بلکہ انہیں بس میں ایسے بھرا جاتا تھا جیسے دیہاتی لاتوں،گھونسوں اور مکوں سے بڑے بڑے مٹکوں میں ساگ بھر کے اچار ڈالتے ہیں اور راتی اور دھنیا کے دانے برابر بھی جگہ خالی نہیں رہنے دیتے۔شہر کے مضافات میں چلنے والی بسوں میں صبح شام بلا کا ہجوم رہتا ہے۔''۹۱

اس اقتباس میں سرکاری بدحالی پر طنز کیا گیا ہے۔کشمیر میں سرکاری بسوں کا بالکل بھی انتظام نہیں ہے صرف چھوٹی چھوٹی ذاتی بسیں ہی سواریوں کو منزل مقام تک پہنچا دیتی ہیں۔وہ بھی اس طرح جس کا ذکر اقتباس میں ہوا ہے۔یہاں کا ڈرائیور پیشہ بھی اسی میں خوش ہے کیونکہ ان کے پاس اور کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے اور یہاں کی عوام بھی مجبور ہو کر اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

راجہ نذر بونیاری کشمیر کے موسم سرما کا تعارف بھی اس کے اصلی نام سے کراتے ہیں۔ یعنی ''چلہ کلان'' کے نام سے سرما کو جانا جاتا ہے۔یہ اکیس دسمبر سے شروع ہو کر جنوری کے آخر تک رہتا ہے۔ان چالیس دنوں کے دوران کشمیر میں بہت زیادہ سردی پڑتی ہے،لوگ اس کا ایک ایک دن گنتے ہیں۔اس تعلق سے ایک کہاوت عام ہے۔''چلہ کلان'' نے کہا ہے اگر میں بوڑھا نہیں ہوتا تو

چولے پر ابلتے برتنوں کو بھی جم کر دیتا۔اس ''چلہ کلان'' کا ذکر راجہ نذر افسانہ ''پورا چانداور آدھی رات'' میں کرتے ہیں:

''یہ جنوری کی ایک سرد ترین رات تھی......سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور کمرے میں چلہ کلان کی کیفیت کا احساس دلانے لگا۔'' ۹۲

دیپک کنول کا اصلی نام، دیپک کمار کول ہے۔۱۹ جنوری ۱۹۴۹ء کو بڑ گام، کشمیر میں پیدا ہوئے۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد ریاست کے محکمہ ٹرانسپورٹ میں ملازم ہوئے۔ملازمت سے سبکدوش ہوئے پھر ممبئی جا کر وہی سکونت اختیار کی۔ان کے تین افسانوی مجموعے ''ہم تیرے ہو گئے'' ''برف کی آگ'' اور ''پمپوش (۲۰۱۱)'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔پانچ ناول 'کشمکش'، 'تماشہ'، 'ترنگ'، 'نیا سفر' اور 'درانہ' شائع ہو چکے ہیں۔

دیپک کنول نے اپنی کہانیاں کشمیر کے پس منظر میں لکھیں ہیں۔ان کے یہاں اکثر و بیشتر کشمیری زبان کے الفاظ پھرن، موت، جو، ڈار اور چوپان وغیرہ کا استعمال کیا گیا ہے۔''پھرن'' کشمیری لباس میں شامل ہے۔''جُو'' ادباً کسی مرد کے نام کے ساتھ استعمال ہو جاتا ہے۔''ڈار'' اور ''چوپان'' کشمیری لوگوں کی ذات ہیں۔کشمیر سے دور ہونے کا غم ان کے افسانوں میں پیش پیش جھلک رہا ہے۔اور کشمیر کا امن وامان درہم برہم ہونے پر اکثر افسوس کرتے نظر آتے ہیں۔افسانہ ''باباجی'' کشمیر کے فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اس کہانی کا کردار سولہ موت ہے جو ایک چھوٹی ہندو لڑکی کو اٹھا کر اس کی پرورش کرتا ہے۔جس کے ماں باپ اور بھائی بہن کشمیر کے فسادات میں مارے گئے تھے۔اس لڑکی کا گھر بسانے کے لئے سولہ موت اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔کیونکہ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی حادثہ پیش آیا ہوا تھا۔جس میں اس کا پورا خاندان مارا گیا تھا اور سولہ موت اپنا دماغی توازن بھی کھو بیٹھا تھا۔لوگ اسے موت کہتے ہیں۔کشمیری لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ سولہ موت کو درویش سمجھ کر اس کی باتوں اور گالیوں کو تبرک مانتے ہیں۔جس کی ایک جھلک دیپک کنول کے اس افسانے میں دیکھی جاسکتی ہے:

''ایک بار کوئی اُسے چھیڑتا تھا تو پھر وہ نہ عمر کا لحاظ کرتا تھا اور نہ ہی جنس کا ۔ جو بھی سامنے ہوتا تھا وہ اُسے من بھر کی گالیاں دے دیتا تھا گالیاں بھی ایسی فحش اور ننگی جنہیں سن کر شیطان بھی پناہ مانگے ۔ یہ اس کی دہشت تھی یا اس کے تیئں لوگوں کی عقیدت کہ اس کی گالیوں کو بھی تبرک سمجھ کر آنکھوں سے لگا لیتے تھے۔'' ۹۳

''مرغی چور'' ہندوؤں کے کشمیر سے فرار ہونے پر لکھا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے کشمیری پنڈتوں اور مسلمانوں کی ملی جلی تہذیب کو اُبھارہ ہے۔ یہ کہانی دو گھروں پر مشتمل ہے۔ اس کہانی کے دو کردار مشتاق اور پیارے لال ہمیشہ پیار ومحبت سے رہتے ہیں۔ یہ دونوں آپس میں پڑوسی ہے۔ ان کی بیویاں آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں اور کبھی کبھی ان کی لڑائی کی نوعبت مشتاق اور پیارے لال تک بھی آتی ہیں۔ مگر پھر بھی یہ سب کچھ بھول کر ہمیشہ ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شریک ہوجاتے ہیں۔ اچانک کشمیر میں حالات خراب ہوجاتے ہیں۔ قتل وغیرت کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔ ہر طرف گولی اور بارود کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اسی درمیان مرغی کے گم ہوجانے پر مشتاق اور پیارے لال کے بیچ روز کی طرح تو تو میں میں ہوجاتی ہے اور مشتاق کی چھوٹی سی دھکی سے پیارے لال ڈر کر کشمیر سے فرار ہوجاتا ہے اور پھر ایک سال کے بعد جب کسی غلط فہمی کی وجہ سے اپنے گھر کو دیکھنے آتا ہے تو اس کے گھر کو اس کے پڑوسی مشتاق اور اس کی بیوی نے حفاظت سے رکھا ہوتا ہے پھر مل کر سب آپس میں زار زار روتے ہیں۔ یہ لوگ کشمیر کے ایک گاؤں میں آباد ہوتے ہیں۔ جس طرح کشمیری گاؤں والے آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ یہ یہاں کے بھائی چارے کی ایک انفرادیت ہے۔ اس کی ایک مثال افسانے سے ملاحظہ ہو:

''مشتاق احمد اور پیارے لال کشمیر کے ایک دور افتادہ گاؤں ماگام میں ایک دوسرے کے اڑوس پڑوس میں رہتے تھے۔ یہ گاؤں گل مرگ کے دامن میں واقع ہے۔ دور سے دیکھنے پر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بچہ ماں کے قدموں میں بیٹھا کلکاریاں مار رہا ہو۔ اخروٹ کے پیڑوں سے گھِرا یہ

گاؤں بھائی چارے کی ایک مثال تھا۔ اس گاؤں میں آٹھ دس کشمیری
ہندوں کے گھر تھے جب کہ اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ دونوں فرقے
آپس میں صدیوں سے شیر وشکر بن کر رہ رہے تھے۔''۹۴

دیپک کنول کے افسانوی مجموعے کا عنوان ''پمپوش'' ہے۔ جو کشمیر زبان کا لفظ ہے ۔ پمپوش کشمیری زبان میں کنول کے پھول کو کہتے ہیں۔ یہ افسانہ کشمیر کے موجودہ صورت حال پر لکھا گیا ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے ایک کشمیری عورت کی روداد بیان کی ہے جو شکارے میں رہتی ہے۔ اس کا شوہر شرابی ہونے کی وجہ سے پورے گھر اور بچوں کے خرچات اسی کو اُٹھانے پڑھتے ہیں۔ وہ دن بھر کنول کے پھول توڑتی ہے اور صبح اپنے گراہکوں کو دیتی ہے اور یہ گراہک ان پھولوں کو مندر میں دیوی کے چرنوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح اس عورت کا (فردوسہ) کا گھر بھی بس جاتا تھا۔ مگر کشمیر میں فسادات شروع ہونے کہ وجہ سے اس کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے اور اس کی پریشانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی کنول کے پھول بیچنا ان شکاروں میں رہنے والے لوگوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھا۔ جس کو اس افسانے میں ابھارہ گیا ہے:

''پھر وہ شکارے سے بہت سارے پمپوش اٹھا کر لے آتی اور انہیں اپنے گراہکوں میں مسکراتے ہوئے تقسیم کرتی تھی جو صبح دم سے ہی اُس کے انتظار میں گھاٹ پر یوں آس لگائے بیٹھا کرتے تھے......فردوسہ کے گھر کی حالت دن بہ دن خستہ ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اس طرح بھوکے پیاسے مرنے سے اچھا ہے کہ وہ کمل ککڑی نکال کر بیچے، کمل ککڑی جو کہ کمل کے پھول کی ڈنڈی ہوتی ہے اور جس کو کشمیری زبان میں ندرو کہتے ہیں، سبزی کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی ہمیشہ کشمیر میں مانگ بنی رہتی ہے۔ یہی فیصلہ کر کے جب وہ صبح سویرے ناؤ میں بیٹھ کر ڈل کے بیچوں بیچ پہونچ گئی تو یہ دیکھ کر وہ دم سے رہ گئی کہ سارے پمپوش مرجھا گئے تھے۔''۹۵

دیپک بدکی ۱۵فروری ۱۹۵۰ء میں سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ بی ایڈ کی ڈگری مکمل کرنے کے بعد انڈین پوسٹل سروس میں بحثیت چیف پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کا پہلا افسانہ ''سلمیٰ'' ۱۹۷۰ء میں روزنامہ ''ہمدرد'' میں شائع ہوا۔ ان کے چار افسانوی مجموعے شائع ہوچکے ہیں جن میں ''ادھورے چہرے' (۱۹۹۹)'' ''چنار کے پنچے (۲۰۰۵)'''' زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (۲۰۰۷)'' اور'' ریزہ ریزہ حیات (۲۰۱۱)'' قابل ذکر ہے۔ اور دو تنقیدی کتابیں'' عصری تحریریں'' اور'' عصری شعور'' شائع ہوچکی ہیں۔ ان دو کتابوں میں انھوں نے مختلف قلم کاروں کی نثری اور شعری تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔

دیپک بدکی اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے سماج میں پھیلے مختلف برائیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ ان کے افسانے نہ صرف کشمیری تہذیب بلکہ پورے ہندوستانی تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیری کہاوتوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ کشمیر میں ایک کہاوت ہے جو بدکی نے افسانے'' دس انچ زمین'' میں پیش کی ہے۔ یعنی یہ کہاوت پڑوس کے حسد پر کہی گئی ہے:

> ''کہاوت مشہور ہے کہ ایک آدمی کے ہاں بیٹا نہیں تھا مگر پڑوسی کی حسد میں اس نے بیٹی کا ختنہ کروایا۔'' ۹۶

اس طرح کی ایک اور کہاوت بھی انھوں نے افسانہ'' میں ساری کی ساری تمہاری'' میں پیش کی ہے۔ یہ کہاوت اکثر کوئی چیز مل جانے پر کہی جاتی ہے۔ یعنی جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تب وہ نہیں ملتی ہے اور جب اس کی ضرورت ختم ہوجاتی ہیں تو پھر اس کے مل جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کہاوت اس طرح سے ہے:

> ''ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے کہ جب زیور ہوتے ہیں تو کان نہیں ہوتے اور جب کان ہوتے ہیں تو زیور نہیں ہوتے۔'' ۹۷

افسانہ'' کبھی ہم سے سنا ہوتا'' میں بدکی نے کشمیر کے ڈرئینگ روم کو پیش کیا ہے۔ جس

کی اپنی ایک الگ شناخت ہے۔اس سے یہاں کی صنعت وحرفت کا بھی انداز ہوتا ہےاوران سب چیزوں کواستعمال کرنے کی وجہ بھی سامنےآتی ہے۔ یہ روایت آج بھی کم وبیش یہاں موجود ہیں۔آج بھی کہیں کہیں پرگھاس کی چٹائی اورنمدے وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔جس کو بدکی یوں اُبھارتے ہیں:

''آنکھیں موندتے ہوئے میں بستر سے اُٹھا،کرتے پائجامے کےاوپر پھرن پہن لیااور پھردروازہ کھولا میرے سامنے ہرجی لال کھڑا تھا۔میں اسے سیدھے بڑے کمرے میں لے گیا جہاں فرش پرگھاس کی چٹائیاں بچھی تھیں اوران کے اوپرنمدے بچھے تھے۔دیوار کے ساتھ گاؤ تکئے لگے ہوئے تھے۔کشمیرمیں عام طورپرمہمانوں کے لئے بڑاکمرہ مختص کیا جاتا ہے جس کو بیٹھک کہتے ہیں اور سردی کی وجہ سے کرسیوں کے بدلےفرش پر بیٹھنے کارواج ہے۔گھاس کی چٹائیاں حاجز کا کام کرتی ہیں اورفرش کی سردی محسوس ہونےنہیں دتیں۔۹۸؎

''ریزہ ریزہ حیات'' میں انھوں نےکشمیرکےموجودہ صورت حال کی عکاسی کی ہے جو پچھلے پچیس سال سے کشمیرمیں چلاآرہاہے۔امن وامان درہم برہم ہوا۔ ہرطرف قتل وغیرت نظرآنے لگا۔جس کے اثرات پوری وادی پر پڑھے،لوگ پریشانی کی حالت میں ریاست سےفرار ہوگئے۔معاشی اعتبار سے بھی کافی پسماندہ ہوگئے۔سیاحوں کی آمدورفت کم ہوگئی۔ ہرطرف سناٹا نظرآنے لگا۔کشمیرکےخوبصورت باغات سونے سونے لگنے لگے۔جس کا ذکر دیپک بدکی یوں کرتے ہیں:

''ان برسوں کے دوران وادی ناساز گار حالات سے جوجھتی رہی نہ ہوا میں وہ تازگی رہی تھی اورنہ پانی میں وہ مٹھاس۔ہوامیں بارود کی تیز بدبو بسی ہوئی تھی جبکہ پانی میں شورے کی تیزابیت گھلی ہوئی تھی۔مغل باغات میں بھی وہ پہلی سی چہل پہل نہیں تھی اورنہ ہی کھیتوں میں وہ مدھرگیت

گونج رہے تھے۔ اگر کچھ تھا تو بس سونی سڑکیں، پولیس چوکیاں اور
ڈرے سہمے لوگ۔

حسب عادت میں صبح سویرے مارننگ واک کے لئے نکل پڑا۔ دریائے
جہلم سوکھا سوکھا سا نظر آ رہا تھا۔ جہلم کے کنارے بنا ہوا بنڈ، جس پر کسی
زمانے میں سیاحوں کی قطاریں دکھائی دیتی تھیں، ویران سا لگ رہا
تھا۔ اِدھر اُدھر اکا دُکا آدمی سودا سلف لینے کے لیے چل پھر رہے تھے۔
دریائی سطح پر ہاوس بوٹ بڑی مدت سے سیاحوں کے لیے ترس رہے تھے
ان کی راتیں سیاحوں کی راہ تکتے کٹ جاتیں اور دن اونگھتے ہوئے
گذر جاتے۔ کنارے پر لمبے اونچے سفیدے کے درخت چپ چاپ
اکھڑے ہاوس بوٹ مالکوں کا غم بانٹ رہے تھے۔'' 99

فسانہ ''پروٹوکول'' میں بدکی نے کشمیر کی خوبصورتی اور اس کے ساتھ جڑے جسم فروشی کے نقطے کو بڑی باریکی سے اُبھارا ہے۔ اس کہانی میں کامنی ایک کردار ہے۔ کامنی کی دو بہنیں اور ماں ہوتی ہے۔ آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ نہ ہونے کہ وجہ سے کامنی اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کامنی بہت خوبصورت ہے اور مشہور بھی۔ اس کی منگنی ہو جاتی ہے مگر وہ بھی بدنامی کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ کامنی اپنی مجبوری کے سامنے مند پڑ جاتی ہے۔ اعلیٰ عہدیداران اس کی زندگی سنوارنے کے بجائے اسے برباد کر دیتے ہیں۔ وہ اس کے خوبصورت جسم کے مزالے رہے ہیں۔ کشمیر میں جسم فروشی پر پابندی ہونے کے باوجود لوگ یہاں کی خوبصورتی کا غلط فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس تعلق سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہاں۔ یہی میرا کام ہے یہ وزیر...... یہ اعلیٰ حکام...... جب بھی وادی کی
سیر کرنے آتے ہیں، یہاں کی دوشیزائیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ کشمیر
بیوٹی، کشمیری بیوٹی......! بس یہی رٹ لگاتے ہیں۔ ہمیں ان کی ہر
ضرورت پوری کرنی پڑتی ہے۔ میں ایک اکیلی تھوڑی ہوں۔ میرے

ساتھ اور بھی تو کئی لڑکیاں ہیں بھگوان جانے ان سالوں پر کیا بھوت
سوار ہو چکا ہے۔ کشمیر بیوٹی۔!''۱۰۰؎

''زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'' میں بدکی نے کشمیر مکان کا نقشہ کھینچا ہے۔ کشمیر مکان کی بناوٹ اور اس کے طرز تعمیر کے طریقے اس طرح پیش کیے ہیں کہ اس کے تعلق سے ایک پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کشمیر میں جب لوگ مکان تعمیر کرتے ہیں تو اس کی بنیاد بڑے بڑے سبز پتھروں سے ڈالتے ہیں اور دیودار کی لکڑی کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ جو بے حد مضبوط اور خوبصورت ہوتی ہے۔ ان مکانوں میں لوگوں کا طرز رہن سہن کو بھی دیپک بدکی اُبھارتے ہیں:

''گھر تو وہ تھا جو یہ لوگ اننت ناگ میں چھوڑ کر آئے تھے۔ تین منزلہ مکان، عمدہ سبز پتھروں کی بنی ہوئی اس کی کرسی، پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی۔ دیواریں، چیڑ کی بنی ہوئی کمروں کی نقش دار چھتیں، دیودار کی کھڑکیاں اور دروازے اور ٹاٹین سے ڈھکی مکان کی ڈھلوان چھت جس پر جاڑوں میں برف پھسل پھسل جاتی تھی۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ دور تک ہرے بھرے لہلہاتے دھان کے کھیت تھے جن کی فصلیں قدرت نے نیلے اودے پہاڑوں سے بنائی تھیں۔ سامنے صحن میں اخروٹ کے دو بڑے بڑے درخت تھے۔''۱۰۱؎

افسانہ ''اداس لمحوں کا کرب'' میں کشمیری ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد اور آپسی بھائی چارے کو اُجاگر کرتے ہیں۔ اس افسانے کا کردار ایک مسلم لڑکی حمیدہ ہے جو راوی کی پڑوسی ہے۔ یہ لڑکی گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ ایک دن حمیدہ کی شادی ہو جاتی ہے مگر شوہر بے وفائی کر کے طلاق دیتا ہے اور حمیدہ میکے واپس آجاتی ہے اور آخر کینسر کی مریض ہو کر مر جاتی ہے۔ اس کا یہ غم ہمیشہ راوی کو چیرتا رہتا ہے جو ایک ہندو لڑکا ہوتا ہے۔ اسی ہندو اور مسلم اتحاد کے ساتھ ساتھ دیپک بدکی نے کشمیری شادی بیاہ کے رسومات کو بھی اُبھارہ ہے۔ کشمیری ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خوشی اور غم میں برابر شریک ہو جاتے ہیں۔ گھر کے کام کاج اور شادی کی تیاریوں وغیرہ میں ایک

دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ براتیوں کا اہتمام پڑوسی کے گھر میں کیا جاتا ہے۔عورتیں گیت گاتی ہیں اور دلہے کو بڑے بڑے خطاب دے کر پکارتی ہیں۔جس کے وضاحت بدکی یوں کرتے ہیں:

''ہم دو فرقے ہیں اور ہمارے رسم رواج الگ الگ ہیں۔ دونوں فرقے ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں برابر کے شریک رہتے مسلمان لڑکی کی شادی ہوتی تو ہندو استقبال، سجاوٹ اور دیگر کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور ہندو لڑکی کی شادی ہوتی تو مسلمان ہمسایہ کے گھر میں برات کا انتظام کیا جاتا۔مہینوں پہلے شادی کی تیاریاں شروع ہوتیں۔ ہندو اور مسلمان عورتیں مل بیٹھ کر چھاج سے چاول پچھوڑتیں............ عورتیں گلا پھاڑ پھاڑ کر استقبالیہ گانے گا رہی تھیں کوئی دلہے راجہ کو ''غازی'' کا لقب دیتا تھا اور کوئی ''مجاہد'' کا خطاب۔''۱۰۲؎

افسانہ ''اچانک'' میں بدکی نے کشمیری لوگوں کا آپس میں پیار ومحبت سے زندگی گزارنے کو پیش کیا ہے۔ یہاں کے لوگ مل بانٹ کر ایک ہی سینی میں کھانا کھاتے ہیں۔اس وقت ان کو ذرا بھی گمان نہیں ہوتا ہے کہ کوئی چھوٹا ہے یا کوئی بڑا، کوئی ہندو ہے اور کوئی مسلمان، کوئی بیمار ہے یا کوئی صحتمند۔خاص کر جب دعوت پر وازوان کا اہتمام ہو۔اسی پیار ومحبت کے ساتھ ساتھ کشمیری پکوان کا ذکر بدکی اس طرح کرتے ہیں:

''ڈھکن کیا کھلے کہ ساری فضا کشمیری پکوان سے معطر ہوگئی۔ گشتابہ، رستہ، سیخ کباب، یخنی اور مرغ مسلم ایک طرف اور روغن جوش، کلیہ، کوفتہ، ندرو، ساگ اور دوم آلو دوسری طرف، جو کچھ بھی تھا سامنے تھا۔اور پھر سبھی مل بانٹ کر کھانے لگے۔اس منظر کو دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ انسان فریقوں اور جماعتوں میں بٹا ہوا ہے۔''۱۰۳؎

دیپک بدکی کے دیگر افسانوں ''شیر اور بکرا'' اور ''درفٹ وڈ'' وغیرہ میں بھی کشمیری تہذیب وثقافت کے نقوش کانگڑی، پھرن، موسم، سیب، کشمیر کا حسن، سیر تفریح کے مقامات گلمرگ،

پہلگام،سون مرگ وغیرہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

غلام نبی شاہد ۱۵ دسمبر ۱۹۵۲ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ان کی پہلی کہانی ''کتنے جھنڈے'' ۳-۱۹۷ء کو روز نامہ آفتاب میں شائع ہوئی۔ان کے دو افسانوی مجموعے ''مٹی کے دیئے'' اور ''اعلان جاری ہے (۲۰۱۳)'' شائع ہو چکے ہیں۔''مٹی کے دیئے'' ایک مشترکہ مجموعہ ہے اس میں سید یعقوب دلکش اور مشتاق مہدی کے افسانے بھی شامل ہیں۔مزید غلام نبی شاہد ریڈیو اور ٹی وی کے لئے سیریل اور ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔

غلام نبی شاہد نے کشمیر کے گزشتہ بیس سال کے خون آشام حالات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ان کے یہاں کشمیری عوام پر ظلم وزیادتی کے شکنجے پیش پیش نظر آتے ہیں۔کشمیری لوگوں کو اکثر کرکڈون میں مبتلا ہوتے اور جوانوں کو پریڈ کرتے ہوئے دیکھاتے ہیں۔گولی بارود اور بم دھماکے ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ان ہی حالات کی وجہ سے کشمیری تہذیب وثقافت نے ایک نیا رخ موڑ لیا۔لوگ اپنے گھروں میں چوروں کی طرح رہتے ہیں کیونکہ کہیں سے کوئی ایسی آفت نہ آن پڑھے جس سے انھیں کئی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے۔

افسانہ ''آجادی'' میں کرفیو کی حالت میں ڈونگے میں رہنے والے ایک غریب حاجی کی داستان بیان کی ہے۔جس کا بچہ بھوک کی وجہ سے رو رہا ہے۔پھر ایک فوجی سریندر انھیں ڈانٹ کر کہتا ہے بچہ کیوں رو رہا ہے۔مگر بچہ چپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتا ہے۔سریندر ان کو ڈونگے سے نکال کر باہر ساتھ چاول لانے لے جاتا ہے۔وہاں پر بچہ دوسری چیزوں کو دیکھ کر اور زیادہ رونا شروع کرتا ہے۔پھر سریندر ان کو ایک چپس کا پیکٹ دے کر کہتا ہے اور کیا چاہئے۔بچہ کہتا ہے۔آزادی۔

''درد کا دریا'' میں کشمیر کے بگڑے حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کشمیری دستکاری کو بھی ابھارا ہے جس کی نمائش ریاست کے باہر بھی کی جاتی ہے۔افسانے کا کردار علی محمد یہی کاروبار دہلی میں کرتا تھا اور وہاں ایک خریدار راجیش کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات استوار

ہوجاتے ہیں۔جس کا ذکر افسانے میں اس طرح کیا گیا ہے:

''تقریباً بیس برس قبل دلی میں ایک صنعتی نمائش میں کشمیری دستکاری کی کچھ خاص چیزوں کی تلاش کے دوران راجیش کی ملاقات علی محمد سے ہوئی تھی۔علی محمد کے سٹال میں رکھی کشمیری دستکاری سے متعلق کچھ چیزیں راجیش کے سامنے کچھ اس انداز سے پیش کیا تھا کہ راجیش نے چیزوں کو ساتھ ساتھ علی محمد کی زبان اور سادگی سے متاثر ہوکر اور بھی بہت ساری چیزیں خریدی تھیں۔دو مہینے تک جاری نمائش کے دوران راجیش وہاں آ کر علی محمد سے کشمیر سے متعلق اور باتوں کے علاوہ کشمیری دستکاری کے بارے میں طرح طرح کے سوالات پوچھتا رہا۔''[۱۰۴]

اس کے بعد ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا شروع ہوتا ہے۔اس دوران کشمیر کے حالات بگڑ جاتے ہیں اور سب کچھ درہم برہم ہوجاتا ہے۔پھر کئی سالوں کے بعد ایک دن راجیش علی محمد سے ملنے آتا ہے۔اس کا پورا خاندان ختم ہوگیا ہوتا ہے۔آخر میں علی محمد بھی راجیش کی آنکھون کے سامنے بم دھاکے میں مرجاتا ہے اور راجیش صرف دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔یہی درد و کرب غلام نبی شاہد کے افسانوں کے خاص موضوعات ہے۔جواب کشمیری تہذیب وثقافت میں پیوست ہوئے ہیں۔

زاہد مختار ۱۵ جنوری ۱۹۵۶ء کو اننت ناگ، کشمیر میں پیدا ہوئے۔انھوں نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا لیکن بہت جلدی افسانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ان کے دو افسانوی مجموعے ''جہلم کا تیسرا کنار(۲۰۰۴)'' اور ''تحریریں'' منظر عام پر آچکے ہیں اور ان کا ایک شعری مجموعہ ''سلگتے چنار'' اہمیت کے حامل ہے۔اس کے علاوہ دوردرشن کے لئے سیریل بھی لکھتے ہیں۔ان کی ادارت میں ہفتہ روزہ ''المختار'' اور ماہنامہ ''لفظ لفظ'' باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔ملک بھرنے ان کو انعام واعزازات سے نوازا ہیں۔زاہد مختار کے افسانوں میں زندگی کے مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان کے یہاں اکثر و بیشتر کشمیر کا ذکر ملتا ہے۔وہ کشمیر میں رہنے والی ایک پہاڑی لڑکی کے حسن کو

یوں اُبھارتے ہیں:

''گلبدن دور پہاڑی گاؤں سے اُتری کوئی پری، جسے ایک نظر دیکھنے
کے بعد اس کے سراپا سے نظریں ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ وہ تھی بھی
حسن کی ایک بے مثال مورت۔ سبز رنگ کا فرن پہنے، اس کا بر فیلے
دودھیا پانی سے نہایا ہوا مرمریں بدن، اسکے لباس پر رنگ برنگے پھول
جیسے کائینات کے ہر رنگ کی خواہش کا احترام کر رہے ہوں۔'' ۱۰۵

کشمیر میں ایک بات تو عام ہے کہ یہاں کے لوگوں کو نمکین چائے کا بہت چسکا ہوتا ہے۔ اس لیے اکثر و بیشتر لوگ اس کو پیتے ہیں۔ اسی طرح شادی بیاہ وغیرہ جیسے موقعے پر خاص طور سے وازوان کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کا ذکر زاہد مختار کے افسانہ ''پل صراط'' میں ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں کا لباس پھرن اور سماوار بھی پیش کئے ہیں جو یہاں کے خاص تہذیبی میراث ہیں:

''کچھ دیر کے بعد ہم دونوں میاں بیوی نمکین چائے پی کر اپنی تلخیوں کی
کڑواہٹ کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چائے کے سماوار میں اگر چہ
ابھی بھی کچھ چائے باقی تھی لیکن کھڑکیوں سے چھن کر آتی ہوئی صبح کی
روشنی مجھے پارک میں جا کر محلے والوں کے ساتھ شامل ہونے کا اشارہ کر
رہی تھی۔ میں نے فرن پہن کر بیوی کی جانب بے بس نظروں سے دیکھا
اور سرد صبح کی ہلکی ہلکی دھند میں کود پڑا............جس پارک میں کبھی محلے
کی کسی دلہن کا پاپ خوبصورت سائیاں لگا کر دولہے کا شاندار استقبال
کر کے کشمیری وازوان سے مہمانوں کے منہ کا ذائقہ خوشبودار بنا دیتا
تھا۔'' ۱۰۶

زاہد مختار نے افسانہ ''سحر ہونے تک'' میں شنکر آچاریہ پہاڑی کے خوبصورت سیڑھیوں کو پیش کیا ہے جہاں سے آس پاس کا حسین منظر بھی نظر آتا ہے۔ خاص کر بل کھاتی ناگن کی طرح ڈل جھیل جس کی خوبصورتی دنیا بھر میں مشہور ہے:

''کچھ لمحے اپنے گرد وپیش کا جائزہ لینے کے بعد، دور ڈل کی پھیلی ہوئی خوبصورت اور نرالی دنیا پر ایک الوداعی نگاہ ڈالنے کے بعد وہ شنکر آچاریہ کی پہاڑی پر بنی خوبصورت سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگا۔ اُسکے عقب میں شنکر آچاریہ کے مندر کا گھڑیاں بھی بج رہا تھا۔''[۱۰۷]

''جہلم کا تیسرا کنارا'' میں انھوں نے ہاوس بوٹ میں رہنے والے ایک کنبہ کی مظلومیت اور انکساری کی روداد بیان کی ہے۔ جو کئی دہائیوں سے ایک ہاوس بوٹ میں رہتے تھے۔ اس ہاوس بوٹ سے یہ لوگ بہت پیار کرتے تھے۔ کیونکہ یہی ان کا گھر تھا۔ مگر وہ اس بات سے بھی بے خبر تھے کہ کسی بھی وقت ان کا یہ آشیانہ مسمار ہوسکتا ہے۔ اور اگر خبردار ہوتے بھی، تب بھی وہ کیا کر سکتے تھے ان کا اختیار بھی تو اسی تک محدود تھا۔ جب ان کا یہ آشیانہ بکھر جاتا ہے۔ تب ان پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑھتا ہے اور وہ گھر سے بے گھر ہو جاتے ہیں۔ اس تعلق سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جب ہاوس بوٹ کا پہلا تختہ الگ ہوکر بہہ گیا تھا تب سونہ جو کی بیوی راجہ کو ہی اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ برسوں سے مرمت کی دہائی دینے والا اُنکے پرکھوں کا ہاوس بوٹ اپنے سارے حوصلے آج کے سیلاب میں ہار چکا ہے۔ وہ بے اختیار چلائی تھی اور یوں اُس پورے کنبے نے جہاں اپنی گھر گرہستی کو جہلم کے پانیوں میں ڈوبتے اور بکھرتے ہوئے دیکھا تھا وہیں ایک کنارے پر وہ ایک دوسرے کو بارش میں چھتیڑوں کی مانند بھیگے ہوئے دیکھ کر یہ یقین ہی نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ سب زندہ تھے۔''[۱۰۸]

ترنم ریاض کا نام وادی کی نمائندہ خواتین فکشن نگاروں میں سرفہرست ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۹ اگست ۱۹۶۳ء کو سرینگر میں ہوئی۔ ابتداء سے اعلیٰ تعلیم تک کا سفر اپنی ہی ریاست میں طے کیا۔ کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔اے اور بی۔ایڈ کی ڈگریاں حاصل کی۔ ان کی پہلی کہانی ۱۹۷۵ء کو روز نامہ ''آفتاب'' کشمیر میں شائع ہوئی۔ ترنم ریاض شاعر بھی کرتی ہے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''پرانی

کتابوں کی خوشبو(۲۰۰۵)'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ان کی دو کتابیں ''بیسوی صدی میں خواتین کا اردو ادب(۲۰۰۵)'' اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''چشم نقش قدم(۲۰۰۵)'' اہمیت کی حامل ہیں۔چار ناولٹ بعنوان ''فریب خطہ گل(۲۰۰۵)'' میں شامل ہے۔دو ناول ''مورتی(۲۰۰۴)'' اور ''برف آشنا پرندے(۲۰۰۹)'' اور چار افسانوی مجموعے ''یہ تنگ زمین(۱۹۹۸)''،''ابابیلیں لوٹ آئیں گی(۲۰۰۰)''،''میرا رخت سفر(۲۰۰۸)'' اور ''یمبر زل(۲۰۰۴)'' قابل ذکر ہے۔اس کے علاوہ ترجمہ کی ہوئی ان کی تین کتابیں ''سنو کہانی''،ہاوس بوٹ پر بلی'' اور ''گوسائیں باغ کا بھوت'' منظر عام پر آ چکی ہیں۔انھیں ملک بھر نے انعام واعزازات سے نوازا ہیں۔ریاستی کلچرل اکیڈیمی سے بیسٹ بک ایوارڈ،اردو اکاڈمی اتر پردیش سے فکشن بک ایواڈ اور اردو اکاڈمی دہلی سے دو مرتبہ بیسٹ بک ایواڈ وغیرہ حاصل کر چکی ہیں۔

ترنم ریاض کے بیشتر افسانے کشمیر اور کشمیری تہذیب وثقافت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ترنم ریاض کا تعلق کشمیر سے ہے لیکن اب مستقل طور پر دہلی میں سکونت اختیار کی ہے تاہم کشمیر سے دور رہ کر بھی ان کے دل میں کشمیر کے لئے محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیش پیش جھلک رہا ہے۔ افسانہ ''کشتی'' میں کشمیر کے خراب حالات کی وجہ سے لوگوں کو مختلف مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ گولی اور بارود سے لوگ طرح طرح کی الجھنوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔اسی بات کو موضوع بنا کر انھوں نے کشمیر کے تہذیبی وثقافتی پس منظر میں پیش کیا ہے۔اس میں ترنم ریاض نے کشمیری لباس کا ذکر کیا ہے جس کی ایک الگ شناخت ہے۔انھوں نے اس لباس اور کانگڑی کی بناوٹ کے حربے بھی سامنے لائے ہیں۔کشمیری لوگوں کے پہناوئے کے طریقے کار بھی اس افسانے میں پیش کئے ہیں:

> ''اس نے گھٹنوں سے ذرا اوپر تک کی لمبائی کا ہلکے رنگوں کی چھینٹ والے کسی موٹے کپڑے کا پھرن پہن رکھا تھا۔کرتے کی کاٹ کا نسبتاً چوڑا،چغہ نما پیرہن،اتنا کھلا کہ اگر ہاتھ استینوں کے اندر سے کھینچ کر جسم سے لگا لیے جائیں،یا سوکھی جھاڑیوں کی آگ سے بھرے مٹی کے

پیالے کے گرد بید کی نرم ہری ٹہنیوں سے بُنی گئی کانگری اس کے اندر رکھ لی جائے جب بھی اس پیرہن کی تنگی کا احساس نہ ہو۔ پھرن کے ساتھ اس نے نیم تنگ پائچوں والی اس چھینٹ کی شلوار پہن رکھی تھی............ ورنہ اس کی ماں کے سر پر پھیلے سوتی رومال کے نیچے ٹوپی، کسابہ، کے اندر سے ماتھے پر جھانکنے والے تین تین جھومروں اور کان کی بڑی بالیوں والا چاندی کا زیور کب کا گھر کی ضرورت کی نذر ہو گیا تھا۔'' ۱۰۹؎

''مجسمہ'' میں کشمیر کی تہذیب وثقافت اور تاریخ ورثے کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیریت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں پھرن، ٹوپی، برتنوں یعنی سماوار اور پیلوں، اخروٹ پکنے کا موسم، پیپر ماشی اور دستکاری وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ یہ افسانہ پچیس سال پرانے کشمیر کی یاد دِلاتا ہے۔ دراصل یہ افسانہ پرانے کشمیر اور آج کی زوال پذیر تہذیب کا موازنہ کرتا ہے۔ اس کہانی کے کردار کشمیر کی حکایات بیان کرتے ہیں، یہاں کے جھیلوں خاص طور سے ڈل جھیل اور ولر جھیل کی پرخمار منظر کو یاد کرتے ہیں۔ جہاں سیاح کے ساتھ ساتھ مقامی لوگ بھی کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں۔ ان جھیلوں میں مختلف قسم کی سبزیاں اگتی ہیں۔ جس کے ساتھ ایک طبقے کا روزگار جڑا ہے۔ اس کشمیر میں آج ایک طرح کا بکھراؤ پیدا ہوا ہے۔ کہانی کے کردار اس گزرے ماضی کی تلاش میں نظر آتے ہیں جو تاریخ کے اوراق میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اقتباس:

''کیا صدیوں پہلے کی طرح آج کوئی حکیم سویہ نہیں پیدا ہوسکتا۔ کیا پھر سے کوئی معرکہ سر نہیں ہوسکتا۔ کتنا مشہور ہے کشمیر کی تاریخ میں سویہ کارنامہ۔ صدیوں پہلے کا کارنامہ............ نویں صدی کے ایک راجہ اونتی ورمن کے راج میں ایک دانا درباری حکیم سویہ ہوا کرتا تھا۔ جہلم جو اُن دنوں وتستا کہلاتا تھا، گرمی کے موسم میں اکثر وبیشتر طغیانی پر ہوتا کہ دھوپ کی تمازت سے پہاڑوں کی برف پگھل کر وادیوں کی طرف بہہ

> نکلتی تھی ۔اور کناروں پر بسے گاؤں ،شہر سیلاب کی زد میں آجاتے ۔ خطے کے شمالی علاقوں میں ایک حصہ ہر برس جب سیلاب کا شکار ہونے لگا تو سو یہ نے رعایا سے محبت کرنے والے راجہ اونتی ورمن کے خزانے سے اشرفیاں لے کر دریا میں پھیکی جنھیں پانے کی خواہش میں لوگوں نے دریائی تہہ سے مٹی نکال کر دریا کو گہرا اور کناروں کو اونچا کر دیا جس سے سیلاب کا خطرہ جاتا رہا۔‘‘ ۱۱۰

’’یمبر زل‘‘ میں سارے کشمیر کو پس منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کشمیری تہذیب وثقافت، تاریخ، رہن سہن اور کشمیریت کے حوالے سے ترنم ریاض کا یہ ایک شاہکار افسانہ ہے۔اس میں کشمیر کے مظلوم عوام کی دکھ بھری داستان بیان کی گئی ہے۔ جو دہشت کی وجہ سے مختلف مسائل میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اس کہانی کا مرکزی کردار ’’یوسف‘‘ ایک الگ راہ اختیار کر کے شہید ہو جاتا ہے اور اسی شہادت کو وہ اپنا مقصد بنالیتا ہے۔ یوسف کے ماں باپ اپنے اس آخری سہارے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ کہانی دراصل یوسف جیسے کئی کشمیری نوجوانوں کا المیہ ہے۔جن کی موت سے کئی ماں باپ اپنے اولادوں، کئی بیویاں اپنے شوہروں اور کئی بہنیں اپنے بھائیوں کو کھو بیٹھیں ۔اس کہانی کے کردار اکثر وبیشتر پھرن اور کانگڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ کشمیر کے یخ آلودہ موسم کا ایک منظر اس افسانے میں یوں پیش کیا ہے:

> ’’ٹین کی، ڈھلوان ساخت کی چھت سے برف پگھل کر بوندیں بن ٹپکتی رہی۔ ہوا کچھ تیز چلنے لگتی تو یہ بوندیں زمین پر گرنے سے پہلے جم جم جاتیں اور فقط کوئی مہین سا قطرہ گرتا، باقی پانی کی مخروط نلیوں کی صورت رہ جاتیں۔‘‘ ۱۱۱

یہی کچھ چیزیں ہیں جو کشمیری تہذیب وثقافت کی شناخت ہے۔ترنم ریاض نے اس افسانے میں کشمیری نمکین چائے کا بھی ذکر کیا ہے جو کشمیری تہذیب کی ایک اہم جز ہے۔اس کے ساتھ مختلف قسم کی روٹیاں ،سنگاڑے، مکئی، چاول، گیہوں وغیرہ کی روٹیاں اور ستو (’’ستو‘‘ چاول اور

مکئی وغیرہ کو پہلے بونا جاتا ہے پھر اس کو پیس کر ''ستو'' تیار کیا جاتا ہے) کھاتے ہیں۔نمکین چائے شاید ہی ملک کی کسی اور ریاست میں پی جاتی ہو۔ترنم ریاض نے اس کو کشمیری برتنوں کے ساتھ تیار کرتے یوں دکھایا ہے:

''انھوں نے چولہے پر چڑھی نمک والی چائے بھرے تانبے کے گول پیندے والے پتیلے میں ذرا سا جھانکا۔اور چائے کا رنگ جانچنے کے لئے تانبے کے لمبے دستے والا کفگیر، پتیلے میں گھمانے کے بعد اس میں بھر بھر کر واپس ڈالتی رہیں۔''۱۲

کشمیر کی مشہور شاعرہ حبہ خاتون (جس کا اصل نام زون تھا) اور اس کے شوہر جو کشمیر کا بادشاہ گزرا ہے یوسف شاہ چک کی داستان بھی اس افسانے میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ان پر بھی صدیوں پہلے ظلم ڈھائے گئے تھے۔یعنی صدیوں سے یہاں ظلم وستم کی روایت چلی آ رہی ہے۔یوسف شاہ چک کو مغل بادشاہ اکبر اعظم نے دھوکے سے قید کیا تھا۔اور حبہ خاتوں نے ان کی یاد میں دم توڑ دیا۔ اس نے یوسف کی یاد میں بے شمار اشعار لکھے ہیں جو ہر کشمیری کے زیر لب ہوتے ہیں۔اس کے شعر کا ایک مصرعہ ترنم ریاض نے بھی ان کی روداد کے ساتھ پیش کیا ہے:

''جب شاعرہ معروف ومقبول اور ہر دل عزیز ملکۂ کشمیر زون، یعنی چودھویں کا چاند ملقب حبہ خاتون کے شاعر بادشاہ یوسف شاہ چک کو اکبر اعظم نے دھوکے سے قید کر لیا تھا۔شاہ غریب الوطنی میں اپنی ملکہ سے دور انتقال کر گیا۔وطن کی مٹی بھی اسے نصیب نہ ہوتی............اور ملکہ روتے روتے دیوانی ہوگئی۔ہجر کے نغموں سے بیاضیں سیاہ کر دیں۔ آخر کار اپنے یوسف کو پکارتے پکارتے حبہ خاتون نے بھی اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔وادی میں اُس کے نغمے گونجتے رہے۔

نادلائے، میانہ یُوسُوفو ولو۔

(پکارتی ہوں میں تجھ کو میرے یوسف آجا)۔''۱۳

اس کے علاوہ ڈوگروں کے عہد میں ظلم وبربریت اور صدیوں سے کشمیریوں کی مظلومیت اور محکومیت کی کہانی اس افسانے میں بیان کی ہے۔ساتھ ساتھ جھیل ڈل کے دلفریب مناظر اور رنگ برنگی کشتیوں کی قطاریں بھی اس افسانے ''یمبر زل'' میں پیش کئے ہیں۔

افسانہ ''حور'' بھی کشمیری تہذیب وثقافت کے تعلق سے اپنی مثال آپ ہے۔اس میں کشمیر کے مسلم گھرانے کی لڑکیوں کے مسائل کو موضوع بنا کر بہت ہی باریکی سے پیش کیا ہے۔کشمیر کی لڑکیوں کا حسن ستم ظریفی اور غربت کی وجہ سے مرجھا جاتا ہے۔جس کی عمدہ مثال کہانی کا کردار ''شریفہ'' ہے۔وہ بے حد خوبصورت، پاکیزہ اور شرم حیاہ سے مالا مال اور ماں باپ کی فرمابردار ہے۔کشمیر کے ہر گھرانے کی طرح ''شریفہ'' کے گھر میں بھی یہ روایت ہے کہ شادی سے پہلے لڑکیاں ہمیشہ گھر کی چار دیواری کے اندر ہی رہتی ہے۔جس کی وضاحت ترنم ریاض اس طرح کرتی ہے:

> ''ان پردہ نشینوں کو صرف اتنی اجازت تھی کہ اگر کہیں قریب ہی میں آتش زنی کی واردت ہو جائے یا زلزلہ آجائے تو صرف اس صورت میں سب مکینوں کے ساتھ ساتھ یہ لوگ بھی ہمارے گھر کے پائیں باغ میں، جس طرف پیڑ بہت کم تھے جمع ہو جاتیں، ورنہ اور کوئی صورت نہ تھی ان کے گھر سے باہر آنے کی، اس دن تک جب کوئی گھوڑی چڑھ دلہا بن آئے اور اسے ڈولی میں بٹھا اپنی پناہ میں لے لے۔''[۱۴۰]

اس افسانے میں انھوں نے کشمیری تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو ابھارہ ہیں۔جیسے اخروٹ کی لکڑی سے بنا سنگھاردان جس پر بیل بوٹے کے نقش بنائے گئے ہیں۔لکڑی کی بنی کنگھی، کشمیری لوگوں کا رہن سہن اور روزمرہ زندگی کے لئے استعمال میں لانے والی چیزیں گھاس کی چٹائی، پھرن اور کانگڑی وغیرہ کا ذکر بڑے پیمانے پر کیا ہے:

> ''اندر فیروزی رنگ مِلی ہوئی ملتانی مٹی سے پتے ہوئے ایک چھوٹے سے شفاف کمرے میں شریفہ جھیل میں اُگی لمبی لمبی گھاس سے بنی ہوئی چٹائی ''وگو'' پر بیٹھی کڑم کا ساگ چُن رہی تھی۔ٹھنڈے ٹھنڈے بھیگے

ساگ کو چنتے چنتے جب اس کے ہاتھ سرد ہونے لگتے تو وہ اپنے
دونوں ہاتھ سمیٹ کر اپنے پھرن کی آستینوں کے اندر کھینچ لیتی اور اپنی
گلابی گلابی انگلیوں سے کانگڑی کے ہتھے تھام لیتی اور لطیف آنچ سے
آسودہ ہوکر پھر ساگ چننے لگی۔اس نے کانگڑی پھرن سے باہر نکال دی
اور اس میں پڑے ہوئے اپلوں کی گرم راکھ کو کانگڑی کے ساتھ بندھی
ہوئی لوہے کی چمچی ''ژان'' سے الٹ پلٹ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا
پردہ ہوگیا ہے۔''۱۱۵

اس افسانے میں شریفہ کی شادی کو کشمیر کے مختلف رسومات کے ساتھ دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔شریفہ کے گھر میں ان کے رشتہ دار کا ایک یتیم لڑکا برسوں سے رہ رہا تھا۔جس کو شریفہ دل ہی دل میں بہت چاہتی تھی اس کے باوجود بھی وہ اپنے باپ کے فاصلے سے مطمئین ہوکر دوسری جگہ بیاہ کے لئے تیار ہوجاتی ہے۔وہ اپنے پیار کا ذکر کسی سے بھی نہیں کرتی ہے۔شریفہ کی شادی پر وازوان کا اہتمام کیا جاتا ہے۔جس میں عمدہ قسم کے پکوان تیار کئے جاتے ہیں۔نظر بد سے بچنے کے لئے اسپند کی کانگڑی کا استعمال کیا جاتا ہے۔یہ کانگڑی مخصوص موقعوں شادی بیاہ وغیرہ جیسے رسومات پر استعمال میں لائی جاتی ہے۔اس کو بہت ہی نفاست سے سجایا جاتا ہے اور پھر شریفہ کو کشمیری گیتوں (''ون وون'') کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے۔شریفہ کا عاشق جو گونگا ہوتا ہے چپ چاپ مہمانوں کی خاطر داری کرنے میں مشغول ہے۔مہمانوں کے ہاتھ دھلاتا اور دسترخوان سمیٹتا نظر آرہا ہے:

''ہمارے ہاں شادیوں میں دو ہی تو دلچسپیاں ہوتی ہیں ایک دلہن دوسرا
وازان۔ ایسے عمدہ پکوان کی روایت اور کہیں نہیں ہے۔ تقریباً
۳۶ طریقوں سے پکایا ہوا گوشت سار دن ان کے گھر سے لکڑی کے
ہتھوڑے سے پتھر کی سِل پر گوشت کوٹنے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔
اور میں سب سے آخری پکوان ''کشابہ'' کی منتظر تھی۔شریفہ کو گونگے کی
فکر تھی آپا اسے تسلی دیتی جا رہی تھیں۔ یوں تو وہ اللہ میاں کی گائے ہی

تھی۔جس کھونٹی سے باندھی، بندھ گئی چپ چاپ......وقفے وقفے کے بعد کوئی خاتون آتی اور دلہن کے سامنے رکھی ہوئی کانگڑی میں اسپند کے دانے ڈال جاتی۔ایسے میں کانگڑی کے ساتھ بندھی ''ژالن'' سے آگ ہلاتی اور دانے آگ سے چھوتے ہی چیخ چیخ کر ساری فضا میں خوشبو بکھیر دیتے۔دلہنوں کی کانگڑی بھی تو دلہنوں سی سجی جاتی ہیں خاص طور سے اس کانگڑی کے لئے چرار شریف کا علاقہ مشہور تھا(اب بھی ہے) کانگڑی کے چاروں طرف بید کی پتلی پتلی چھوٹی ٹہنیوں کو موڑ کر بنائے گئے ننھے ننھے دائرے آویزاں تھے۔جن پر باری باری سبز اور سرخ رنگ کیا گیا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے کسی حسینہ کے کانوں میں رنگ برنگی بالیاں۔کانگڑی کے بیچ میں لگے مٹی کے پیالے اور مخصوص جھاری کی نازک شاخوں سے بنی گئی جالی کے درمیاں، چمکیلا، سرخ اور سبز رنگ کا کاغذ بڑی نفاست سے پھنسایا گیا تھا۔دور سے کانگڑی کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کوئی جاپانی گڑیا فرش پر رکھی ہو۔سارے میں خوشبو پھیلی ہوتی تھی۔کانوں میں، شادیوں میں گائے جانے والے مخصوص گیت ''ون وون'' کی آوازیں آرہی تھیں............

مالِنچ کونزہ کر دیدۂ حوالئے
نیرہ کوری وآرو یکہ سوالئے

(مائیکے کی چابیاں ماں کے حوالے کر دے بیٹا کہ جا اب تجھے سسرال جانا ہے)

وہ غریب ''ون وون'' کے دل سوز گیتوں سے دھیان ہٹانے کی کوشش کرتی،تو سامنے سے گونگا ہاتھ میں بڑا قلعی کیا ہوا تانبے کا بھاری چمکتا ہوا لوٹا اور بہت بھاری بڑی سی طشت لیے مہمانوں کے ہاتھ دھلاتا، دسترخوان سمیٹتا نظر آتا۔کھویا کھویا سا سجے سنوارے مہمانوں کے

درمیان اجڑا سا‘‘ ۱۶؎

’’چھوئی موئی‘‘ پہاڑوں کی وادی میں رہنے والی ایک معصوم اور بولی بھولی بھالی خوبصورت لڑکی ’’زیتون‘‘ پر مشتمل ہے۔ یہ لڑکی قدرت کے حسین وادی لولاب میں رہتی ہے۔ شہر سے جو بھی آتا ہے۔ اس کے حُسن پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اور چند دنوں تک اسے پیار جتا کر بھاگ جاتا ہے۔ دوسری طرف اس کا موزانہ ایک شہری لڑکی سے کیا گیا ہے۔ جس نے ساری دنیا دیکھ کر ڈاکٹر کا پیشہ اپنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان پہاڑی گاؤں والوں کی طرز زندگی کی ترجمانی بھی کئی گئی ہے۔ ان کا لباس، شکل صورت، اخروٹ کے پیڑ کے درخت کی کھال سے دانت صاف کرنا اور ان پہاڑوں پر بے شمار چشمے ہوتے ہیں۔ جن کا پانی یہ لوگ سال بھر استعمال کرتے ہیں۔ ان کا پانی سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد ہوتا ہے۔ ان سب چیزوں کا ذکر ترنم ریاض کے یہاں ملتا ہے۔ اس تعلق سے افسانے کا ایک دلکش منظر ملاحظہ ہو:

> ’’میرے سامنے میٹھے پانی کا چشمہ تھا۔ پانی سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ اور یہ پانی اس قدر شفاف تھا کہ تہہ میں اُگی ننھی ننھی گھاس کے پودے، چھوٹے چھوٹے گول پتھر اور کنکر بالکل صاف نظر آتے تھے۔ خوبصورت چھوٹے سے فوارے کی شکل میں چشمہ چھوٹتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ چشمہ دائرہ نما تھا۔ اور ایک کنارے سے باہر کو ننھی سی ندی کی شکل میں بہہ رہا تھا۔ اس کے گرد ہری ہری گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اس کا پانی کنکنا تھا۔ چشموں کا پانی سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈا ہوا کرتا ہے۔ قدرت کی شان ہے ورنہ ان وادیوں اور پہاڑوں میں پانی کیسے گرم کیا جاتا‘‘ ۱۷؎

ان پہاڑی لوگوں کی گھر گرہستی اور رہن سہن کشمیر تہذیب وثقافت کی زندہ مثال ہے۔ جس کو ترنم ریاض نے اس افسانے میں قلم بند کیا ہے۔ بہار کے موسم میں کشمیری لوگ سبزیاں سوکھا کر رکھتے ہیں اور سرما میں جب کافی اونچی تعداد میں برف گرتی ہے۔ راستے بند ہو جاتے ہیں۔ کھیت

کھلیان ویران ہوجاتے ہیں تب یہی سوکھائی ہوئی سبزیاں اور دال کھانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔سال بھر یہاں کے لوگ سرما میں رہنے کے لئے مختلف انتظامات کرتے ہیں۔ یہاں پر ایک اور بات کو بھی سامنے لایا گیا ہے آج سے کئی سال پہلے لوگ اور مویشی ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ایک طرف مویشی اور دوسری طرف گھر کے افراد۔اس طرح سرما کا موسم کاٹنا آسان ہوتا تھا۔اب یہ روایت ختم ہوگئی ہے۔کہیں کہیں پر پہاڑوں میں ہی یہ روایت کم وبیش باقی رہی ہے جہاں بہت زیادہ برف گرتی ہے۔اس کی ایک مثال ترنم ریاض کے یہاں موجود ہیں:

''جہاں پر اس کا چھوٹا سا گھر جس کی چھت پر بہت سے ٹماٹر اور بیگن کاٹ کر سوکھنے کے لئے بچھائے گئے تھے اور چھت کے بیچوں بیچ ایک بڑے سے سوراخ میں سے دھواں نکل رہا تھا۔گھر کے دو اطرف مکی اگی ہوئی تھی اور تیسری طرف سبزیوں کا چھوٹا سا باغیچہ تھا جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ لوکی اور کدو وغیرہ بوئے گئے تھے اور ان کی بیلیں آدھی چھت ڈھکے دے رہی تھیں۔کہیں کہیں کھیرے اور لوکیاں لٹکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔گھر کے اندر ایک طرف کو مویشی رہتے تھے اور دوسری طرف اس کا سارا کنبہ۔''۱۸؎

اس ضمن میں ان کا ایک اور افسانہ ''مٹی'' میں بھی انھوں نے کشمیر کی ایک منفرد چیز کو سامنے لایا ہے'' باقر خانی'' جو کشمیری روٹی میں شامل ہوتی ہے۔صبح سویرے کہانی کا کردار ہلال احمد اس کو نمکین چائے میں بھگو کر کھانے لگتا ہے۔ یہ کشمیری لوگوں کی روایت میں شامل ہے۔اکثر روٹی کو نمکین چائے کے پیلے میں بھگوتے ہیں اور پھر چائے پینے کے بعد آخر میں بھیگوئی ہوئی روٹیاں کھاتے ہیں:

''ہلال احمد نے باقر خانی کا ایک کونا توڑ کر چوڑے منھ والی چھوٹی سی بغیر دستے کی پیالی میں بھری گلابی چائے میں ڈبویا ہی تھا کہ باہر میگا فون پر زور زور سے کچھ اعلان سنائی دیا۔''۱۹؎

ترنم ریاض کے دیگر افسانے بھی کشمیری تہذیب وثقافت کی عکاسی کرتے نظر آرہے ہیں۔ خاص طور سے ''اماں''، پھول''، ''برف گرنے والی ہے'' اور ''ماں صاحب'' اہمیت کے حامل ہے۔ان کے افسانے اور کردار کشمیری تہذیب وثقافت کی روایت کو ابھارنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کشمیر کے حالات ، واقعات، ماحول اور معاشرے کے مسائل پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔جس کو انہوں نے حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پرویز مایوس ۶ مارچ ۱۹۶۶ء کو سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام پرویز احمد بٹ ہے۔اب پرویز مانوس کے نام سے لکھتے ہیں۔ابتدائی تعلیم کشمیر میں ہوئی۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے ایم۔اے کرنے کے بعد محکمہ تعلم سے وابستہ ہے ۔ ان کا پہلا افسانہ ''احساس'' ۱۹۸۹ء میں ''ہند سماچار'' سرینگر میں شائع ہوا۔ ایک افسانوی مجموعہ ''شکارے کی موت (۱۹۹۵)'' منظر عام پر آچکا ہے۔اردو کے ساتھ ساتھ پہاڑی زبان میں بھی افسانے لکھتے ہیں۔ وہ شاعر بھی ہے۔ان کے تین شعری مجموعے'' بیتے لمحوں کی سوغاتیں (۱۹۹۲)''، ''موسم اڑان کا (۱۹۹۷)'' اور ''چاند لمس گلاب (۲۰۰۴)'' شائع ہو چکے ہیں۔مزید وہ ترجمہ نگاری کی حیثیت سے بھی مشہور ہے۔ پرویز مانوس کا شمار جدید دور کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے یہاں حُبّ الوطنی، بھائی چارگی،انسانیت کا عدم احترام،غربت وافلاس،فرقہ وارانہ تناؤ،غنڈہ گردی اور کشمیر تہذیب وثقافت کا فقدان وغیرہ کی جھلکیاں مکمل طور پر ملتی ہیں۔افسانہ ''شکارے کی موت'' میں جھیل ڈل کی خوبصورتی کو یوں نمایاں کیا ہے۔کہ جھیل کا پرجوش منظر پیکر بن کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے:

> ''جھیل کے دوسرے کنارے پر اونچے لمبے سفیدے کے درخت مستی میں جھومتے دکھائی دے رہے تھے۔سڑک کے بائیں جانب دور تک پھولوں کی ایک چادر بچھی ہوئی تھی۔جھیل کے دائیں جانب ایک بہت بڑی زیارت تھی جس کے سفید گنبد دور سے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ جھیل اپنے شفاف پانی سے اس زیارت

کے پاؤں دھورہی ہے۔اس کے سامنے والی پہاڑی پر کسی بہت بڑے قلعے کا کھنڈر موجود تھا۔اس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا شومندر بھی تھا۔ صبح وشام اس مندر کی گھنٹیوں کی آواز سے ساری وادی گونج اُٹھی۔جھیل کے مغرب میں دور تک پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جس پر آج بھی سردیوں کی برف کی چٹان کی مانند جمی ہوئی تھی۔سورج کی کرنیں پڑتے ہی یہ برف چاندی کی طرح چمکنے لگتی اور دیکھنے لگتی اور دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔ برف سے لدی ہوئی یہ چوٹیاں اور اس پر جھکا ہو نیلا آسمان قدرت کا عجیب منظر پیش کرر ہا تھا۔‘‘ ۱۲۰

منظر کشی کے ساتھ ساتھ اس افسانے میں ایک ہانجی گھرانے کی داستان بھی پیش کی ہے جو ہاوس بوٹ میں رہتا ہے اور آخر میں ان کی بوٹ پورے اہل وعیال کے ساتھ ڈل میں ڈوب جاتی ہے اور کئی ہاجیوں کی طرح ایک اور کہانی اس جھیل میں دفن ہو جاتی ہے۔اس کہانی کا مرکزی کردار ’’غفارا‘‘ ہے۔ان لوگوں سے جڑی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اس افسانے میں بیان کی گئی ہے۔یہ افسانہ کشمیری تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آرہا ہے۔اس کہانی کے کردار ٹوپی اور پھرن پہنے ہوئے ہیں اور بوٹ کے اندر بیٹھ کر نمدے پر کشیدہ کاری کرر ہے ہیں۔ جو یہاں کی دستکاری میں شامل ہے۔غفارا کشمیری شکل صورت اور خلوص کا ایک مجسمہ نظر آرہا ہے:

’’عفارا ابھی اپنے باپ دادا کی طرح سیاحوں کے ساتھ بڑے ادب وخلوص سے پیش آتا۔تبھی تو ہر سال بہار کے موسم میں اس کے ہاوس بوٹ پر ’’ہاوس فل‘‘ کا بورڈ اُویزاں ہوتا آس پاس کے ہاوس بوٹ والے اس کو حسد بھری نظروں سے دیکھتے اور سوچتے اس کے ہاوس بوٹ میں ایسی کونسی خوبی ہے جو ہر سیاح ادھر کا ہی رُخ کرتا ہے۔وہ غفارے سے حسد کرنے لگے............عفارا بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔چہرے پر سفید داڑی اور سر پر گول ٹوپی ہمیشہ پہن رکھتا............سردی ہو یا گرمی

وہ ہر موسم میں فرن (کشمیری کُرتہ) پہن رکھتا۔''۱۲۱؎

افسانہ ''چوتھا کونہ'' اصل میں سرمایہ دارانہ نظام پر ملامت کرتا ہے۔ کہانی میں نمبر دار گاؤں کے لوگوں سے اپنے تمام کام کرواتا ہے۔ اگر کبھی کوئی کسان اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اُسے وہ کڑی سزا دیتا ہے۔ اس گاؤں پر اس کا ہی راج چلتا ہے۔ اسی بات کو موضوع بنا کر کشمیر کے پہاڑی لوگوں کی تہذیب کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان کا رہن سہن، غربت اور افلاس اور ان کا شہر میں لکڑیں اور دودھ فروخت کر کے سودا سلف لانا وغیرہ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اس کہانی کے کردار ریشما اور دینو گوبر نکالتے ہیں اور ریشما گوبر کی تھاپیاں بنا کر دیواروں سے لگاتی ہے۔ مزید ان پہاڑی لوگوں کے دیگر طور طریقے بھی پیش کیے گئے ہیں جو خاص کشمیر تہذیب و ثقافت میں شامل ہے:

''دوسری طرف کچھ لکڑیوں کا ڈھیر جو کہ دینو نے سابقہ سیلاب میں دریا سے پکڑی تھیں......ایک ٹہارا......ایک دروازہ...... دو کھڑکیاں ......ایک آنگن...... دروازے کے بائیں جانب مٹی کا یک ''تندور'' جس میں کبھی کبھار ''ریشما'' روٹیاں لگاتی تھی............گھاس کی گھاڑی پر چند چوزے بیٹھ کر دھوپ کا مزا لے رہے تھے...... دور سے یہ سب کچھ بڑا دلکش لگ رہا تھا......یہی سب کچھ ان پہاڑی لوگوں کا اثاثہ تھا۔ صدیوں سے چلی آ رہی تہذیب کو کیسے ترک کر دیتے یہ لوگ...... یہ سب کچھ تو ان کی شناخت تھی......ریشما اُسے مٹی کی بنائی ہوئی کانگڑی میں چند انگار ڈال کر دیتی تو پھولاں اپنا جسم سیکتی اور گیلے کپڑے سکھاتی......جب بارش تھم جاتی تو پھولاں دو چار مٹی کے چھوٹے برتن بغل میں دبائے چشمے پر پانی بھرنے چلی جاتی۔''۱۲۲؎

''ریلیف'' میں پرویز مایوس سرکاری نظام پر طنز کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اس بات کا انکشاف بھی کیا ہے کہ سرکاری دفتروں میں رشوت خوری کا بازار کس قدر اونچے پیمانے پر ہے۔ وہاں عصمت دری کے حادثے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اس کہانی میں ایک عمر رسید آدمی ''دینو'' ریلیف

پانے کی غرض سے کئی چکر تحصیل تک لگا تا ہے اور تھک ہار کر آخری بار اپنی جوان اور خوبصورت بیٹی گلاں کو وہاں بھیجتا ہے۔ جہاں اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر جلدی اس کا کام کیا جاتا ہے اور پھر دھکا دے کر اس کی عصمت دری بھی کی جاتی ہے۔ یہ کہانی بھی کشمیری تہذیب وثقافت کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔اس افسانے میں دینو جب گھر واپس لوٹتا ہے تو گھر والے اس کا استقبال اس طرح کرتے ہیں جو کشمیری تہذیب وثقافت کی ایک خاص شناخت ہے:

''تم کو روز روز تکلیف ہوتی ہے۔ پھر وہ شام کو لوٹ آئے گی۔اتنے میں گلابو چائے کا سماوار لیکر آ گئی۔ سماوار کی بھاپ چھت کی طرف اُڑ رہی تھی۔ مالی نے سماوار کا ڈھکن اٹھا کر دو چار پھونکیں ماریں سماوار میں نمکین چائے ابل رہی تھی۔اس نے پیالی میں تھوڑی سی چائے لیکر نمک چکھا۔ پھر چائے کی ایک پیالی دینو کی طرف بڑھائی۔۱۲۳؎

''سانجھی دھرتی'' افسانہ میں کشمیری تہذیب کا بکھراو صاف دکھائی دے رہا ہے۔اس سوچ میں کہانی کا مرکزی کردار خالد پڑجاتا ہے جب وہ پانچ سال کے بعد سعودی عرب سے واپس لوٹتا ہے اور اپنی تہذیب کو درہم برہم ہوا پاتا ہے۔ جو تہذیب ہندو اور مسلمان بھائی چارے کی ایک مثال تھی۔اسے وہ سب یاد آتا ہے جب نوکری نہ ملنے کی وجہ سے وہ پیسے کمانے سعودی عرب گیا تھا اور محلے کے سب لوگ ہندو اور مسلمان دونوں فرقے کے لوگوں نے اس کو پیار ومحبت سے رخصت کیا تھا۔ لیکن واپس آنے پر اُسے ہر جگہ فوجی شناختی کارڈ چیک کرتے ہیں اور اپنے منہ بولے ماما دینا ناتھ کے گھر میں ملیڑی فوج دیکھ کر حقا بقا ہو کر رہ جاتا ہے۔اسے وہ وادی یاد آتی ہے جہاں جھیلوں کے آغوش میں ہزاروں شکارے دلہنوں کی طرح سجے ہوئے تیر رہے تھے اور باغوں میں سیاح کیمرے لٹکائے قدرت کے حسین مناظر قید کرتے تھے۔یہی بھائی چارے کی تہذیب اُسے پھیکی پھیکی نظر آتی ہے:

''دور دور تک پھیلے ہوئے وہ پہاڑوں کا سلسلہ جن پر آج بھی سردیوں کی برف کسی چٹان کی مانند جمی ہوتی تھی اور سورج کی کرنیں پڑتے ہی سنگ مرمر کی طرح چمکنے لگتی۔ آس پاس دھان کے مستی میں جھومتے

کھیت......زعفران کے پھولوں کی دور دور تک پھیلی ہوئی مہک جو کسی
بھی اجنبی کا دل موہ لے......اس پر وہاں کی لڑکیوں کا سریلی آواز میں
''رف'' وہاں کے حسن میں اضافہ کررہا تھا.....خالد کا وہ شہر جہاں ہندو
اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے۔اور ایک دوسرے کے دکھ
سکھ میں برابر شریک ہوتے...... جہاں لوگوں کے دلوں کے اندر سے
محبت کا جہلم اور چناب نکلتا تھا۔''[۱۲۴]

اس کے علاوہ ان کے دیگر افسانے بھی اس ضمن میں رکھے جاسکتے ہیں۔جن میں کشمیری تہذیب وثقافت کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔خاص کر''پتھر کے صنم''اور''کچا گوشت''میں کشمیر کے پانی کا ذکر ملتا ہے۔جو چشموں کی صورت میں بہتا ہے۔ان چشموں کا پانی سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد ہوتا ہے اور بنگلے بنانے کے لئے دیوار(درخت) کی لکڑی کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔یہی سب کشمیر کے ثقافتی ورثے میں شامل ہے جس کا ذکر بڑے پیمانے پر پرویز مایوس کے یہاں ملتا ہے۔

سیدہ نکہت فاروق ۱۹جولائی ۱۹۶۶ءکو سرینگر میں پیدا ہوئیں۔ایم۔اے کی تعلیم کشمیر یونیورسٹی سے حاصل کی۔ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی جموں یونیورسٹی سے تفویض ہوئیں۔اس وقت گورنمنٹ کالج میں بحیثیت اسٹنٹ پروفیسر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ''قہر نیلے آسماں کا(۲۰۰۹)''منظر عام پر آچکا ہے۔شعروشاعری سے بھی دلچسپی رکھتی ہے اس تعلق سے ان کا ایک شعری مجموعہ''بیتی باتوں کا جھروکہ''شائع ہوا ہے۔ان کا شمار ابھرتے خواتین قلم کاروں میں کیا جاتا ہے۔ان کے افسانے گزشتہ پچیس سالہ بربادی،ظلم وبربریت،دکھ درد اور خوف ودہشت کی روداد بیان کرتے ہیں جو کشمیری تہذیب وثقافت کے پس منظر میں پیش کیے گئے ہیں۔

افسانہ''قہر نیلے آسماں کا''ان باتوں کا عمدہ مثال ہے۔اس کہانی کے کردار رشید اور اسماء قالین بافی کا کام کرتے ہیں۔جو یہاں کے لوگوں کا ایک خاص پیشہ رہا ہے اور یہاں کے قالیں بہت مشہور بھی ہے۔موجودہ حالات کے اثرات سے یہ کام بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا سکا۔کہانی میں

رشیداور اسماء غریبی اور مفلسی مٹانے کے لئے قالین باقی کا کام شروع کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ننھے ننھے بچوں کو تعلیم دینے کے بجائے اسی کام کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔اور زندگی کو خوشحال بنانے کے خواب بنتے ہیں۔مگران کے یہ خواب تب چور چور ہو جاتے ہیں جب ملی ٹینٹوں اور حفاظتی فوج کے درمیان ہونے والی جھڑپ میں ان کا قالین گھر کے ساتھ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔اسی روداد کے ساتھ ساتھ کشمیر رہن سہن، برتن، اور قالین بافی کے ثقافتی نمونے بھی سامنے آجاتے ہیں جب یہ لوگ قالین بنانے میں مصروف ہوتے ہیں:

''رشید زور زور سے قالین بافی کی تعلیم پڑ رہا تھا۔ بچے اپنے ننھے ننھے ہاتھ بڑی چابکدستی سے چلا رہے تھے۔اسما چائے سے بھرا سماوار لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرہ کچا تھا، گھاس پھوس کی چھت کے نیچے رہنے والا یہ کنبہ اکثر بھوک کی مار بھی خوشی خوشی جھیل لیتا تھا۔'' ۱۲۵؎

افسانہ'' آدھے ادھورے لوگ'' میں سیدہ نکہت نے ''ڈیجھور'' کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے جو کشمیری پنڈت عورت کی شناخت ہے۔افسانے کا مرکزی کردار رجنی پورے افسانے میں اس ڈیجیور کی تلاش میں رہتی ہے۔اس ڈیجیور کے بدلے کشمیر کی مسلم عورتیں ''تالہ رز'' پہنتی تھیں۔ یہ ان دونوں کی انفرادیت تھی۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ یہ دونوں چیزیں کشمیر زیورات میں شامل ہیں۔''تالہ رز'' سر کے اُوپر سے دونوں طرف چہرے پر اویزاں رکھا جاتا ہے اور ''ڈیجھور'' کشمیری پنڈتانی'' جھمکے کے ساتھ جوڑ کر کانوں کے پیچھے کی طرف لے کر بالو میں باندھتی تھیں۔کشمیری پنڈت کشمیر سے فرار ہو کر ملک کے مختلف ریاستوں میں آباد ہوئے اور اپنی تہذیبی وثقافتی ورثے سے ان کا رشتہ کٹ گیا جس کا غم رجنی کو کھائے جا رہا ہے:

''ڈیجھور......اس کے کانوں سے جدا ہو گیا تھا۔ڈیجھور اس کی زندگی کا ترجمان............اس کے شریر کا ایک اہم حصہ...... ہلتا ہوا......حرکت کرتا ہوا......ڈیجھور...... نہ سپنا تھا اور نہ کوئی کچا وعدہ......رجنی کو اپنے کانوں سے لہو رستا ہوا محسوس ہونے لگا۔'' ۱۲۶؎

افسانہ ''ایک خواب ادھورا سا'' میں سیدہ نکہت کھوئے ہوئے کشمیر کی یاد میں افسوس کرتی نظر آرہی ہے۔ افسانے میں ایک لڑکی جس کا بچپن کشمیر میں گذرا تھا۔ اس کو ایک دن اپنی سہیلی ثریا کی یاد آئی جس کے ساتھ بازار جاتے وقت اکثر اس کو ایک دکان سے زیور خریدنے کی خواہش رہتی تھی۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے کچھ سال کے بعد جب وہ کشمیر جاتی ہے تو وہاں اس کو ہر طرف ویرانی نظر آتی ہے۔ کشمیر کا حسن کسی روٹھی دوشیزہ کی طرح محسوس ہورہا ہے اور وہ اپنے ماضی کو یاد کرتی ہے جس کی ایک الگ ہی پہچان تھی:

> ''برف کی ٹھنڈک کا احساس ہوتے ہی ثریا کی یاد یخ بستہ جھونکوں جیسے چُھو جاتی...... پھر وہ گرتی برف میں ڈل کا سناٹا۔ ٹھٹھرتی سردی میں دھیرے دھیرے گرم ہوتی انگلیوں کا وہ درد......اور پھر جمی ہوئی جھیل پر طرح طرح کے کھیل۔''۱۲۷

افسانہ ''تار تار آنچل'' میں سیدہ نکہت نے ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی ہے جو ایک دن بعد دلہن بننے والی تھی مگر حالات کا شکار ہوجاتی ہے۔ موجودہ دور کے فسادات میں شام کے دھندلکے میں کچھ ظالم گاڑی میں آکر اس کی عصمت دری کرتے ہیں۔ اس کا باپ اور بھائی صرف آنسوں بہانے اور احتجاج کرنے کے سوا کچھ نہیں کر پاتے ہیں۔ اس کہانی کو انھوں نے کشمیر کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ دلہن کے بال کھولنے کی رسم کو اس میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس رسم میں محلے اور رشتہ دار کی عورتوں کو گیت گانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ جس کو کشمیر میں ''ون وون'' کہتے ہیں۔ مہمانوں کو اس دن خاص طور سے زعفرانی قہوہ اور قلچہ پیش کیا جاتا ہے۔ جس کا ذکر سیدہ نکہت اس طرح کرتی ہے:

> ''شام ہونے کو آئی۔ ناہید نے اپنی بوا کے ساتھ مل کر ساری تیاریاں مکمل کر لیں۔ زاعفرانی قہوہ سماوار میں ابل رہا تھا۔ محلے کی تمام لڑکیاں اور عورتیں جمع ہوگئیں تھیں۔ ناہید کو بیچ میں بیٹھا کر بال کھولنے کی رسم ادا کی جارہی تھی۔ چاروں طرف ونہ ون کی گونج تھی۔ سب خوش

تھے۔''۱۲۸؎

میر ایوب میر کا اصلی نام محمد ایوب میر ہے۔ وہ ۱۹۶۷ء نوہتہ سرینگر میں پیدا ہوئے اور ادیب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے گھریلو کاروبار کے ساتھ جڑ گئے۔ ان کا پہلا افسانہ ''جستجو'' ۱۹۸۳ء کو'' گلفام'' میگزین میں شائع ہوا۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''ٹھنڈی آگ (۱۹۹۳)'' اور'' اور پھر ایک دن (۲۰۰۷)'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو کے لئے ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔ انھوں نے افسانہ'' زندہ لاشیں'' میں کشمیر کے سرد بھرے موسم کی عکاسی بڑے ہی خوبصورت اور حقیقی انداز میں کی ہے۔ سرما کے موسم میں یہاں کے لوگ جس طرح گھروں میں رہتے ہیں۔ اس کی ہو بہو تصویر میر ایوب نے اس افسانے میں پیش کی ہے۔ برفباری کی وجہ سے لوگوں پر کس طرح کے حالات حاوی ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''دو دن کی مسلسل برف باری سے پوری وادی سفید چادر میں لپٹی ہوئی لاش بن گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہاں زندگی کبھی تھی ہی نہیں اور اگر تھی بھی تو اس کی ساری چہل پہل ختم ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں یوں دبکے بڑے تھے جیسے قبروں میں مردے گڑے ہوں۔ برف کی کافی موٹی تہیں اور اس پر کڑاکے کی سردی اور گھنا، ڈراونا سکوت............ سڑک کے دونوں طرف دوکانوں پر لگے ہوئے تالے جمی ہوئی برف کے نیچے گم ہو چکے تھے۔ چاروں اطراف قبرستان کا عالم تھا۔''۱۲۹؎

مقبول ساحل ۱۵ اپریل ۱۹۶۸ء کو ضلع اننت ناگ کشمیر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کئی میدان میں اپنا نام کمایا ہے۔ وہ ایک افسانہ نگار کے علاوہ ایک شاعر اور صحافی بھی ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ'' قدم قدم تعزیز (۲۰۱۲)'' شائع ہو چکا ہے۔ مقبول ساحل کی کہانیاں کشمیر کے گرد ہی گھومتی ہیں۔ کشمیری تہذیب ان کے یہاں جا بجا جھلک رہی ہے۔ وہ کشمیر کے گزشتہ پچیس سالہ

حالات وواقعات سے کافی متاثر ہوئے نظر آتے ہیں۔ بقول نور شاہ:

> ''اپنی زندگی کے اکثر واقعات ، تجربات، حادثات اور مشاہدات کو سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی پس منظر میں افسانوی انداز میں قلم بند کر کے انھوں نے اپنے تئیں ایک حساس فنکار ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔''۱۳۰

انھوں نے افسانہ ''بانسری'' میں کشمیر کے ایک پر جوش منظر کو پیش کیا ہے۔ جہاں غریب کمسن بچے مویشیوں کو چراتے ہیں اور اسی کو اپنی دنیا سمجھ کر یہ بچے بے حد خوش نظر آتے ہیں۔ مکئی کی روٹی، جنگلی ساگ اور جھرنوں کا صاف وشفاف پانی ہی ان کے لئے سب کچھ ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اور کچھ سوچتے بھی نہیں ہیں۔ ان بچوں کے پاس ستر چھپانے کے لئے مختصر سا کپڑا ہے۔ لیکن شام کو جب یہ بچے گھر لوٹتے ہیں تب ان کے معصوم کندھوں پر مختلف طرح کا سامان لدا ہوا ہوتا ہے۔ یہی کشمیری پہاڑی گاؤں کے لوگوں کی تہذیب ہے۔ جس کی روایت یہاں پر برسوں سے چلی آ رہی ہیں۔ اس تعلق سے مقبول ساحل کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پورانا گہ بل اس کا ہمنوا بن گیا ہے اونچے اونچے برف پوش پربتوں سے پگھلنے والی برف کے پانی سے بننے والے سفید اور ٹھنڈے جھرنے، جھرنوں کے چاروں اطراف میں دور، دور تک پھیلے ہوئے کالے اور گھنے جنگلات، جنگلات کے درمیان ناگہ بل کی پہاڑی بستی اور بستی والوں کے مویشوں کے ریوڑ، بھیڑ بکریاں، گائیں اور بھینسو کے جھنڈ اور ان کی نگرانی کرتے گاؤں کے غریب اور کمسن بچے، ان کو تن پر بمشکل ستر چھپاتا ہوا مختصر سا لباس...... اسکولوں اور کالجوں کی رونق بننے کی بجائے ان جنگلوں میں مویشی چراتے اور شام کو اپنے کندھوں پر لکڑیوں کی گڈھی، گھاس کی بوری یا پھر جنگلی سبزیوں کی جھولی لے کر گھروں کو لوٹتے تو ان کے چہروں پر اتنا سکون اور خوشی ہوتی گویا دنیا فتح

کر لی ہو۔''۱۳۱؎

''زبرون کے دامن میں'' افسانہ میں کشمیر کے تاریخی نمونے اُجاگر کئے ہیں۔ جہاں دوردراز سے لوگ دعائیں مانگنے اور سیر تفری کے لئے آتے ہیں۔ یہ تاریخی وثقافتی تعمیرات یہاں کی اعلیٰ فنکاری کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ جو زیادہ تر اونچے اونچے پہاڑوں پر واقع ہیں۔ ان کی خوبصورتی اپنی جگہ مسلم ہے یہ ایرانی طرز تعمیر کی غمازی کرتے ہیں۔ اسی کا ایک پُرسوز منظر افسانے سے ملاحظہ فرمائیں:

> ''کوہ سلیمان پر شنکر آچاریہ کا مندر اور کوہ ماران کے اوپر مغل شہنشاہ، اکبر کا تعمیر کردہ قلعہ ناگر نگر اور دامن میں مخدوم صاحب کی درگاہ بھی صاف دکھائی دے رہی تھی، دائیں جانب جھیل ڈال کا صاف وشفاف پانی اس پر تیرتی کشتیاں اور شکارے...... ذرا اُوپر شمال کی جانب درگاہ حضرت بل کا مرمریں گنبد اور منارے بھی واضح دکھائی دے رہے تھے اور اس کے پہلو میں کشمیر یونیورسٹی اور پھر عقب میں نسیم باغ کے فلک بوس چنار۔''۱۳۲؎

کشمیر کے لوگ نمکین چائے کو کبھی کبھی بطور دوا بھی استعمال کرتے ہیں۔ جب کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو ڈاکٹر اُسے نمکین چائے پینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ خاص طور سے کشمیر میں سردرد عام ہے۔ تو اس کو بغیر دودھ کے نمکین چائے پلائی جاتی ہے پہاڑی لوگ اس کو ''کوڈا'' کہتے ہیں۔ اس کو پینے سے سردی، بخار، بدہضمی اور سردرد وغیرہ سے راحت ملتی ہے۔ جس کا ذکر مقبول ساحل افسانہ ''چشمے والا بزرگ'' میں اس طرح کرتے ہیں:

> ''ساجدہ نے جلدی سے نمکین چائے کا ایک پیالہ کر کے اسے دے دیا...... دودھ کے بغیر اس چائے کو پہاڑی زبان میں ''کوڈا'' کہا جاتا ہے اور بخار میں اکثر کام کرتا ہے۔''۱۳۳؎

کشمیری لوگوں کو چشمے کے تعلق سے عقیدہ ہے کہ چشمے کے آس پاس جنات رہتے

ہیں۔چشمے کو کشمیری زبان میں ''ناگ'' کہتے ہیں۔یہ جنات نماز کے وقت چشمے پر وضو بنانے آتے ہیں۔اکثر گاؤں کی عورتیں ان چشموں پر کبھی پانی لے جاتی ہے کبھی کپڑے اور برتن وغیرہ دھوتی ہے تو جنات ان کو وہاں سے بھگانے کے لئے مختلف روپ اختیار کر کے انھیں ڈراتے ہیں اور کبھی کبھی جنات کا سایہ بھی کسی پر پڑ جاتا ہے اس لئے گاؤں کے بزرگ لوگ اپنی بہو اور بیٹیوں کو صبح اور شام چشمے پر جانے سے اعتراض کرتے ہیں۔جس کی تفصیل مقبول ساحل نے افسانہ ''چشمے والا بزرگ'' میں کی ہے۔اس افسانے میں فاطمہ نام کی لڑکی رات کو بارش کے موسم میں چشمے پر پانی لانے جاتی ہے اور اس پر جن کا سایہ پڑ جاتا ہے۔واپس آتے وقت یہ زور سے گر جاتی ہے اور اناپ شناپ بولنا شروع کر دیتی ہے۔رات بھر گھر والے پریشان ہو جاتے ہیں اور صبح مولوی صاحب کو جن نکالنے کے لئے بلایا جاتا ہے اور مولوی صاحب جن کو بھگانے کے لئے کانگڑی کا سہارا لے کر طرح طرح کے حربے کرتا ہے۔اقتباس:

> ''مولوی صاحب کے ہاتھ میں بید کی ایک نرم شاخ تھی،اس نے آتے ہی ایک سبز رنگ کا کپڑا طلب کیا اور فاطمہ کے کمرے میں چلا گیا جہاں بہت بھیڑ جمع تھی۔کچھ لوگوں نے مولوی کو جگہ دی اور وہ فاطمہ کے بہت قریب چلا گیا پھر اس نے آگ سے بھری کانگڑی طلب کی اور اس ہرے رنگ کے کپڑے (دجی) کو اس میں ڈال دیا۔دھواں اُٹھنے لگا تو مولوی صاحب نے کانگڑی فاطمہ کی ناک کے قریب کر دی۔اس کے سر کو پکڑ کر کانگڑی کے بہت قریب لایا اور زیر لب کچھ پڑھتے رہے۔''۱۳۴

اس طرح جن تنگ آ کر کچھ شرطوں پر فاطمہ کے جبین سے نکل جاتا ہے اور اپنی شرائط کا تبصرا اس طرح کرتا ہے:

> ''صرف ایک موقع دوں گا...... کالی بکری اور مرغی لوں گا...... اور ایک وعدہ بھی کہ آج کے بعد چشمے کے نزدیک کوئی گندگی نہیں ڈالی جائے گی

اور نہ ہی کوئی عورت وہاں بے ہودہ حرکت کرے گی...... ورنہ اگلی
بار...... میر غصہ پورے گاؤں کو جلا کر راکھ کر دے گا............ کالی بکری
اور مرغی ذبح کر کے صدقے میں تقسیم کر دی گئی۔''۱۳۵؎

مقبول ساحل کے یہاں اکثر کشمیری وازوان رستہ، گوشتابہ، یخنی، کباب اور کشمیری ساگ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔افسانہ ''پکنک'' میں انھوں نے وازوان کو پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ ایک کشمیری رقص ''ہکٹ'' کو پیش کیا ہے۔اس تعلق سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''صائمہ اور صبیحہ نے رقص کے آخری لمحوں میں ایک دوسرے کے ہاتھ
پکڑ کر کشمیری رقص ''ہکٹ'' پیش کیا،اس رقص کے دوران دو رقاصائیں
ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر پاؤں کی انگلیوں کو ملا لیتی ہیں اور پھر ایک
دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر پاؤں کی انگلیوں کو ملا لیتی ہیں اور پھر ایک
دوسرے کا وزن تھامتے ہوئے اپنے سر اور کمر پیچھے کی طرف جھکا لیتی
ہیں اس کے بعد وہ لٹو کی طرح گھومنا شروع کر دیتی ہیں......اور اگر ایسے
میں ہاتھ سے ہاتھ چھوٹ جائے تو ان کو گر کر چوٹ بھی لگ سکتی
ہے۔''۱۳۶؎

موسم سرما میں شدید برفباری کی وجہ سے کشمیری عوام کو بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑھتا ہے۔ یخ آلودہ سردی میں لوگ کانگڑی لیکر موٹی موٹی لحاف اور کمبل اوڑھے چپ چاپ سرما گزرنے کا انتظار کرتے ہیں۔کبھی کبھی برفباری کی وجہ سے سردی کی شدت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ پوار نظام بیٹھ جاتا ہے۔گھروں سے باہر نکلنا محال ہوجاتا ہے ہر طرف برف کے تودے گرنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ایسے میں لوگ مسجدوں اور گھروں میں بخاری اور حمام کا اہتمام کرتے ہیں۔جس سے حمام کمرہ اور پانی گرم ہوجاتا ہے پھر لوگ اس کو استعمال میں لاتے ہیں۔جو کشمیری تہذیب وثقافت کا ایک اہم جز ہے۔اس کو مقبول ساحل نے ''میٹھی قینچی'' میں یوں اُجاگر کیا ہے:

''رات بھر کی قیامت خیز ہواؤں کے ساتھ شدید برفباری جاری رہی،

بجلی کی سپلائی منقطع ہوگئی اور ٹیلی فون نظام ٹھپ رہا۔ درختوں کے ٹوٹنے اور ٹین کی چھتوں سے برف کے تودے گرنے کی آوازیں تو باہر ہونے والی قیامت کا پتہ دے رہی تھیں لیکن اندر کا عالم یہ تھا کہ میں ٹھنڈ کی وجہ سے بری طرح کانپ رہا تھا، کانگڑی بجھ چکی تھی، بخاری کا کیروسین دو دن پہلے ہی ختم ہو چکا تھا اور کشمیر کو دنیا سے ملانے والی واحد شاہراہ کئی دنوں سے بند ہونے کی وجہ سے نہ گھر میں کھانا پکانے کی گیس موجود تھی اور نہ ہی مٹی کا تیل...... دو، دو لحاف اور گرم کمبل اوڑھنے کے باوجود شدید سردی لگی............ میں کروٹ بدل کر بستر کو خیر باد کہنے کی تیاری کرنے لگا تاکہ مسجد کے حمام میں گرم پانی سے نہا کر رات کے پالے سے چھٹکارا حاصل کرسکوں۔''[۱۳۷]

ریاض توحیدی کا اصل نام ریاض احمد بٹ یکم دسمبر ۱۹۷۳ء کو ضلع کپوارہ، تحصیل ہندوارہ کے قریب ایک گاؤں وڈی پورہ میں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے (اردو) کشمیر یونیورسٹی سے حاصل کیا۔ ایم۔فل۔ بعنوان ''پروفیسر حامدی کاشمیری بحیثیت اقبال شناس'' اور پی ایچ ڈی ''ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی اقبال شناسی'' عنوانات کے تحت اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سے تفویض ہوئیں۔ ان کا نام کشمیر کے ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں میں شامل ہے۔ پہلا افسانہ ''قتل اور مقتول'' کشمیر اعظمی (۲۰۰۵) میں شائع ہوا۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''کالے پیڑوں کا جنگل (۲۰۱۱)'' اور '' کالے دیووں کا سایہ (۲۰۱۴) منظر عام پر آ چکے ہے۔ ان کے افسانوں میں خون خرابہ، کشمیری عوام پر ڈھائے گئے ظلم و ستم اور کشمیریوں کا آپسی بھائی چارہ وغیرہ جھلک رہا ہے۔

افسانہ ''ناکہ بندی'' میں انھوں نے کرفیو کی حالت میں لوگوں کو مختلف مشکلات سے دوچار ہوتے ہوئے دیکھایا ہے۔ وردی پوش فورسز کس طرح یہاں لوگوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ کرفیو کی حالت میں لوگ گھر کے چار دیواری کے اندر بھوک اور دوائی وغیرہ کے لئے تڑپتے ہیں۔ کہانی میں

کرفیو کی حالت میں ساجدہ اور اس کا شوہر مجبور ہو کر اپنے شدید بیمار بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔ ان کے گھر میں بچے کو پلانے کے لئے دودھ تک موجود نہیں ہے۔ اس جرم میں فورسیز انھیں گولیوں سے چھلنی کر دیتے ہیں اور بچے کے لیے خریدے ہوئے دودھ کے ڈبے کو بم بنا کر پیش کرتے ہے۔ ساجدہ کا شوہر بشیر پریشانی کی حالت میں کشمیری مہمان نوازی کو یاد کر رہا ہے جو یہاں کے عوام کو تہذیبی روثے میں ملا ہے اسی مہمانوازی کے بدلے میں یہ مہمان ان کے ساتھ کیسے پیش آتے ہیں۔ جس پر بشیر افسوس کرتا ہوا نظر آتا ہے:

> ''اسے یاد آرہا تھا کہ کس طرح ہم کشمیری اپنی جنت میں وارد مہمانوں کا استقبال بے مثل فراخ دلی سے کرتے تھے اور اپنی مہمان نوازی کے حسین نقوش ان کے دلوں پر چھوڑ کر بار بار یہ ثابت کرتے آئے تھے کہ ''ذرا ذرا ہے میرے کشمیر کا مہمان نواز''۔ اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں............ اس انسانی سلوک کے بدلے یہ لوگ حیوانیت پر اتر آتے ہیں۔''۱۳۸

''جشن قبرستان'' میں ریاض توحیدی وادی کے پرسکون ماحول کو درہم برہم ہونے کی داستان بیان کرتے ہیں اور مجبور اور لاچار عوام پر کئے گئے ظلم، یہاں کی حکومت کے علمبرداروں پر طنز اور عوام کو روشن مستقبل بنانے کے لئے بے دار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہانی میں داد جی بچوں کو کشمیر کے ماضی کی صحت افزا آب ہوا، پرامن ماحول اور انسان دوستی وغیرہ سے اس طرح متعارف کرتے ہیں:

> ''وہ ایک پُرسکون وادی تھی۔ اس کے چمنستان رنگ برنگے پھولوں سے مہکتے رہتے تھے۔ ان پھولوں کی خوشبودار ہوائیں جب فضا میں پھیل جاتی تھیں تو پہاڑوں کی دوسری جانب بسنے والے لوگوں کے دماغوں کو معطر کر دیتی تھیں۔ اس وادی کی ایک شاندار تواریخ تھی۔ اس کی کہانی اپنی ایک تہذیب، اپنا ایک تمدن تھا اور سب سے بڑھ کر جو دولت ان

کے پاس تھی وہ تھا ان کا اپنا ایک آزاد ماحول۔ یہ ماحول بھائی چارے،
انسان دوستی اور انسانیت کی روشنی سے چمکتا رہتا تھا۔''۱۳۹

افسانہ ''ہوم لینڈ'' میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ صدیوں سے چلے آرہے کشمیر میں رہنے والے مختلف فرقوں یعنی ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے آپسی بھارے کو مختلف سازشوں کا شکار ہونا پڑا۔ اس افسانے کے تین کردار عبداللہ خان، سوم ناتھ اور سردار سرجیت سنگھ ہے۔ کشمیر میں جب فسادات شروع ہوجاتے ہیں تو سوم ناتھ کو اپنی کمیٹی کی طرف سے گھر چھوڑنے کا بلاوا آتا ہے۔ اس کے گھر چھوڑنے پر ان کے دوست عبداللہ خان اور سرجیت کو کافی دکھ ہوتا ہے اور اس کے گھر گرہستی کو یہ لوگ حفاظت سے رکھتے ہیں۔ وادی سے باہر سوم ناتھ کو مختلف مشکلات درپیش آتے ہیں اور وہ اپنی زمین بیچنے اور گھر جلانے پر مجبور ہوجاتا ہے تاکہ انشورنس کا پیسہ بھی وصول ہوجائے۔ آخر میں ان کا بیٹا فوجی آفیسر بن کر کشمیر آجاتا ہے اور پورے گاؤں کے لوگوں کو دھمکی دیتا ہے کہ اس کی زمین ایک مہینے کے اندر اندر خالی کی جائے۔ اسی موضوع کے ساتھ ساتھ اس افسانے میں یہاں کے مختلف فرقوں کے بھائی چارے کی ایک جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے جو کشمیری عوام کی ایک پہچان ہیں:

''وہ جنت نما وادی تھی، اس کے پاسبان برف سے ڈھکے ہوئے آسمان کے حریف بلند و بالا خاموش پہاڑ تھے۔ بہار کے موسم میں جب سورج کی کرنیں ان برفیلے پہاڑوں پر پڑتی تھی تو برف پگھل کر ٹھنڈے پانی میں تبدیل ہوکر بلندی سے پستی کی طرف مدھم آواز دھیرے دھیرے سفر شروع کرتی تھی اور اس گلپوش وادی کے چمن زاروں کے رنگ برنگے پھولوں کے لئے آب حیات کا کام انجام دیتی۔ یہ وادی ایک منفرد تہذیب و ثقافت کا مسکن رہی تھی جو صدیوں کی تاریخ پر مشتمل تھا۔ لوگ مختلف مذاہب کے پیروکار تھے لیکن انسانیت نوازی سب کا مشترکہ مذہب تھا۔''۱۴۰

''کشمیر نواز'' ایک علامتی افسانہ ہے۔ اس میں کالے دیو، لوگوں پر ظلم ڈھاتے ہیں اور

انھیں جھیل ولر میں پھینک دیتے ہیں۔اس حالت میں لوگ ''کشف رشی'' کو یاد کرتے ہیں۔جن کے سر کشمیر آباد کرنے کا سہرا ہے اور حضرت سلیمان کو لوگ فریاد کرتے نظر آتے ہیں جو تمام جنوں کا بادشاہ ہے پھر لوگ حضرت سلیمان کی انگوٹھی پا کر کالے دیوؤں کا مقابلہ کرتے ہیں اور انھیں بھگا دیتے ہیں۔ دراصل یہ کہانی دور حاضر میں ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار نے کشمیری عوام کے رہن سہن کو بھی پیش کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ماضی کے پردوں میں کشمیر نواز کو وہ دور نظر آیا جب وادی کے چاروں طرف پانی پھیلا ہوا تھا اور لوگ کشتیوں میں زندگی گزارتے تھے۔لوگ زیادہ تر مچھلیوں کا شکار کرتے تھے اور آرام سے زندگی گزارتے تھے۔اس زمانے کے کالے دیوؤں کو ان لوگوں کی خوشحالی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، اس لئے وہ آہستہ آہستہ وادی کے لوگوں کو ستانے پر اتر آئے۔''۱۴۱

افسانہ ''کبھی الوداع نا کہنا'' میں کشمیر کے سیر افزا مقام پہلگام کا منظر پیش کیا ہے جہاں کشمیر کا ایک جوان جوڑا اپنی جدائی میں آنسوں بہاتے ہیں۔کیونکہ ماں باپ ان کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کرتے ہیں۔اس کہانی کا ہیرو ساجد ماں باپ کے سامنے کچھ بھی نہیں کر پاتا بلکہ پہلگام کی حسین وادی میں اپنی محبوبہ ساجدہ کو ایک دوسرے سے جدا ہونے کا فیصلہ سناتا ہے۔جس میں وادی کی ایک سیر افزا جگہ پہلگام کا ذکر ملتا ہے:

> ''اس دن ساجد پہلگام کی حسین وادی میں ندی کنارے ساجدہ کو اپنی محبت کا بے رحم انجام سناتے سناتے جدائی کے درد سے اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا۔بے خودی کے عالم میں دونوں ندی کے اوپر والے پل کے درمیان چلتے چلتے پہنچ گئے۔انھیں محسوس ہونے لگا کہ جیسے پہلگام کی برفیلی پہاڑیوں سے آگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور برف پگھلنے سے ندی میں طغیانی آئی''۱۴۲

''دوشالہ'' میں کشمیر کے پیشے وارانہ کاریگری کو ابھارا گیا ہے۔جس کے ساتھ یہاں کے لوگوں کا روزگار جڑا ہوا ہے۔غریب عوام اس فن میں مہارت رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود بھی روپے پیسوں کے محتاج ہیں۔ یہ دن رات محنت اور ایمان داری سے کام کرتے ہیں۔لیکن بدلے میں ساہوکار انھیں صرف دووقت کی روٹی کے سوا کچھ بھی نہیں دیتا ہے اور برے وقت پر منھ موڑ لیتا ہے۔اس کہانی میں خوجہ کاک اپنا مکان گروی رکھ کر ریشم کا کاروبار شروع کرتا ہے اور ڈھنک کا کاریگر نہ ملنے کی وجہ سے اسے کافی نقصان اُٹھانا پڑتا ہے جس کی وجہ سے بنک کے کرمچاری اس کو گھر سے بے دخل کرنے آتے ہیں۔اسی دوران بستی کا ایک غریب ہمدرد کاریگر ریشم چاچا ان کرمچاریوں سے خوجہ کاک کی طرف سے چند مہینے کی مہولت مانگتا ہے اور خود اس کے کارخانے میں کام کرنے جاتا ہے۔

ریشم چاچا کا فن صاف وشفاف ہے جس کے چرچے دور دور تک ہے:

> ''ریشم چاچا کے دوشالے بنانے میں ریشم چاچا کا کوئی ثانی نہیں تھا یہ اُس کا خاندانی پیشہ تھا جن لوگوں کے ہاں بھی اس نے کام کیا تھا۔ان کے گھروں میں ریشم چاچا کی کاریگری سے چاندی ہی چاندی دکھائی دے رہی تھی لیکن ریشم چاچا کی قسمت میں دوسرے سینکڑوں کاریگروں کی طرح دووقت کی روٹی کے سوا کچھ نہ لکھا ہوا تھا۔''[۱۴۳]

خوجہ کاک کے گھر میں بھی ریشم چاچا کے فن سے چاندی ہی چاندی دکھائی دینے لگی۔ ایک دن کام کرتے کرتے ریشم چاچا کی انگلی کٹ جاتی ہے۔درد اپنا بڑ جاتا ہے۔آپریشن کی نوعیت آتی ہے۔جس کے لئے پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ریشم چاچا کی بیٹی خوجہ کاک سے پیسے ادھار مانگتی ہے مگر وہ منھ موڑ لیتا ہے اور آپریشن نہ ہونے کی وجہ سے ریشم چاچا کی موت ہو جاتی ہے۔خوجہ کاک نے انھیں تحفے کے طور پر ایک شال دیا تھا جس کو ریشم چاچا کی بیٹی خوجہ کاک کے گھر واپس لے جاتی ہے اور بدلے میں اپنے غریب باپ کے لئے کفن مانگتی ہے۔

اس طرح تقریباً جموں وکشمیر کے تمام افسانہ نگاروں نے کشمیری تہذیب وثقافت کے کئی

پہلو اپنے افسانوں میں پیش کیے ہیں۔جن میں فاروق احمد ریزو،محمد زماں آزردہ اور واجدہ تبسم وغیرہ بھی شامل ہے۔حالانکہ ریاست جموں وکشمیر تین خطوں جموں، کشمیر اور لداخ پر مشتمل ہے۔ ہر خطہ تہذیبی اعتبار سے اپنی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔لیکن کشمیر کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔اس لئے ہر ایک ادیب نے اسے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔کچھ افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جنہوں نے کشمیر کو تہذیبی طور پر پیش نہیں کیا ہے۔ جیسے مشتاق احمد وانی، مجید ارجمند، مشتاق مہدی، آنند لہر اور منصور احمد منصور وغیرہ ۔مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح سے کشمیر ان کے افسانوں میں جھلک رہا ہے۔الغرض کشمیر تہذیبی وثقافتی اعتبار سے ہے ہی اس قدر دلچسپ کہ اسے کوئی فراموش نہیں کر سکتا۔

حوالہ جات

۱۔ پریم ناتھ پردیسی۔ بہتے چراغ۔سہیل اعظم آبادی۔اظہار عقیدت۔ بروکار پریس سرینگر، کشمیر۔۱۹۵۵ء۔ص۔۱۶

۲۔ پریم ناتھ پردیسی۔ بہتے چراغ۔ سہیل اعظم آبادی۔اظہار عقیدت۔ بروکار پریس سرینگر، کشمیر۔۱۹۵۵۔ص۔۱۶

۳۔ پریم ناتھ پردیسی۔ بہتے چراغ۔ ڈھول۔ بروکار پریس سرینگر، کشمیر۔۱۹۵۵۔ص۔۳۰

۴۔ پریم ناتھ پردیسی۔ بہتے چراغ۔ کتبے۔ بروکار پریس سرینگر، کشمیر۔۱۹۵۵۔ص۔۸۴۔۸۵

۵۔ پریم ناتھ پردیسی۔ بہتے چراغ۔ٹیکہ بٹن۔ بروکار پریس سرینگر۔۱۹۵۵۔کشمیر۔ص۔۱۵۱۔۱۵۷

۶۔ پریم ناتھ پردیسی۔ بہتے چراغ۔پھسلن۔ بروکار پریس سرینگر، کشمیر۔ص۔۱۸۱

۷۔ پریم ناتھ پردیسی۔ بہتے چراغ۔نئی صبح۔ بروکار پریس سرینگر۔۱۹۵۵۔کشمیر۔ص۔۲۲۶۔۲۲۷

۸۔ پریم ناتھ پردیسی۔ بہتے چراغ۔جھنجھنا۔ بروکار پریس سرینگر، کشمیر۔۱۹۵۵۔ص۔۲۶۲۔۲۶۶

۹۔ پردیسی۔ بہتے چراغ۔ بہتے چراغ۔ بروکار پریس سرینگر، کشمیر۔ص۔۲۹۰)

۱۰۔ پریم ناتھ در۔ چناروں کے سائے میں۔پیش کلام۔۔فنکار کلچرل آرگنائزیشن سرینگر، کشمیر۔۱۹۹۱۔ص۔۶

۱۱۔ پریم ناتھ در۔ چناروں کے سائے میں۔ نیلی آنکھیں۔۔فنکار کلچرل آرگنائزیشن سرینگر، کشمیر۔۱۹۹۱۔ص۔۲۶۔۲۷

۱۲۔ پریم ناتھ در۔ چناروں کے سائے میں۔پیش کلام۔۔فنکار کلچرل آرگنائزیشن سرینگر، کشمیر۔۱۹۹۱۔ص۔۱۷

۱۳۔ پریم ناتھ در۔ چناروں کے سائے میں۔گیت کے چار بول۔فنکار کلچرل آرگنائزیشن سرینگر، کشمیر۔۱۹۹۱۔ص۔
۸۵۔۸۶۔۸۷

۱۴۔ پریم ناتھ در۔ چناروں کے سائے میں۔کوفتہ۔۔فنکار کلچرل آرگنائزیشن سرینگر، کشمیر۔۱۹۹۱۔ص۔۱۳۳۔۱۴۵

۱۵۔ پریم ناتھ در۔ چناروں کے سائے میں۔ نیلی آنکھیں۔فنکار کلچرل آرگنائزیشن سرینگر، کشمیر۔۱۹۹۱۔۔ص۔۳۰

۱۶۔ پریم ناتھ در۔ چناروں کے سائے میں۔کاغذ کا واسدیو۔فنکار کلچرل آرگنائزیشن سرینگر، کشمیر۔۱۹۹۱۔ص۔۲۱۷۔۲۱۸

۱۷۔قدرت اللہ شہاب /مرتب جوہر قدوسی۔ ماجی، یا خدا اور دیگر کہانیاں۔ یا خدا۔کشمیر بک فاونڈیشن، کشمیر۔۲۰۱۲۔۔ص۔۶۶

۱۸۔قدرت اللہ شہاب /مرتب جوہر قدوسی۔ ماجی یا خدا اور دیگر کہانیاں۔ یا خدا۔کشمیر بک فاونڈیشن، کشمیر۔۲۰۱۲۔ص۔۶۵

۱۹۔قدرت اللہ شہاب /مرتب جوہر قدوسی۔ ماں جی، یا خدا اور دیگر کہانیاں۔ پھوڑے والی ٹانگ۔کشمیر بک فاونڈیشن،
کشمیر۔۲۰۱۲۔ص۔۱۱۷۔۱۱۸

۲۰۔ٹھاکر پونچھی۔زندگی کی دوڑ۔پگڑی۔مکتبہ آشیانہ قرول باغ نئی دہلی۔۱۹۵۹۔ص۔۲۹

۲۱۔موہن یاور۔دوکنارے۔کلد یپ بک سنٹر جموں توی،جموں۔۱۹۶۲ء۔ص۔۹۴

۲۲۔موہن یارو۔دوکنارے۔کلد یپ بک سنٹر جموں توی،جموں۔۱۹۶۲۔ص۔۹۰

۲۳۔موہن یاور۔دوکنارے۔کلد یپ بک سنٹر جموں توی،جموں۔۱۹۶۲۔ص۔۹۲

۲۴۔مرتب حامدی کاشمیری۔رسالہ ہمارا ادب۔جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹس کلچر اینڈ لنگویجز سرینگر۔۱۹۶۲۔ص۔۱۸۲

۲۵۔مرتب سلیم سالک۔جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے (پردیسی سے ترنم ریاض تک)۔میزان پبلشرز،سرینگر۔۲۰۱۱۔ص۔۵۹

۲۶۔حامدی کاشمیری۔شہرافسوں۔کمپوٹر سٹی راجباغ سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۱۶۰

۲۶۔حامدی کاشمیری۔شہرافسوں۔کمپوٹر سٹی راجباغ سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۱۷۲

۲۶۔حامدی کاشمیری۔شہرافسوں۔کمپوٹر سٹی راجباغ سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۲۱۰

۲۹۔حسن ساہو۔پھول کا ماتم۔عکس۔راج تلک روڑ جموں توی۔۱۹۷۴۔ص۔۱۳۰

۳۰۔حسن ساہو۔اندھا کنواں۔اعتراف۔۔دوران پبلیکیشنز سرینگر۔۱۹۹۶۔ص۔۲۱

۳۱۔حسن ساہو۔اندھا کنواں۔ٹوٹی کہانی کمند۔دوران پبلیکیشنز سرینگر۔۱۹۹۶۔ص۔۱۷۱

۳۲۔حسن ساہو۔گردش دوراں۔صدائے بازگشت۔میزان پبلیشر ز سرینگر۔۹۰۰۲۔ص۔۹۶

۳۳۔حسن ساہو۔گردِش دوران۔ایک پہلو یہ بھی ہے۔میزان پبلیشر ز سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۹۸

۳۴۔حسن ساہو۔گردش دوراں۔اجاڑ۔میزان پبلیشر ز سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۱۶۳۔۱۶۵

۳۵۔پشکر ناتھ۔عشق کا چاند اندھیرا۔جوڑا ابابیلوں کا۔دریا گنج نئی دہلی۔۱۹۸۱۔ص۔۱۲۴۔۱۲۵

۳۶۔پشکر ناتھ۔کانچ کی دنیا۔ٹروٹ مچھلی۔ دریا گنج نئی دہلی۔۱۹۸۴۔ص۔۵۶

۳۷۔پشکر ناتھ۔کانچ کی دنیا۔درد کا مارا۔دریا گنج نئی دہلی۔۱۹۸۴۔ص۔۱۳۷

۳۸۔پشکر ناتھ۔کانچ کی دنیا۔پل نمبر صفر کے گدھ۔دریا گنج نئی دہلی۱۹۸۴۔ص۔۱۴۰

۳۹۔برج پریمی۔سپنوں کی شام۔خودکلامی کا جادوگر۔ویپ پبلی کیشنز پمپوش کالونی،جموں۔۱۹۹۵۔ص۔۹

۴۰۔برج پریمی۔سپنوں کی شام۔سینوں کی شام۔ویپ پبلی کیشنز جموں۔۱۹۹۵۔ص۔۵۷

۴۱۔برج پریمی۔سپنوں کی شام۔سپنوں کی شام۔ویپ پبلی کیشنز جموں۔۱۹۹۵۔۔ص۔۵۸

۴۲۔برج پریمی۔سینوں کی شام۔آنسوں کے دیپ۔ویپ پبلی کیشنز جموں۔۱۹۹۵۔ص۔۱۰۷

۴۳۔نور شاہ۔بے ثمر سچ۔اندھرے اجالے۔حضرت بل سرینگر کشمیر۔۲۰۰۵۔ص۔۷۹۔۸۰

۴۴۔نور شاہ۔ویرانے کے پھول۔علیا اور بلبل۔چاند پریس جموں۔۱۹۶۲۔ص۔۲۴

۴۵۔نور شاہ۔ویرانے کے پھول۔علیا اور بلبل۔چاند پریس جموں۔۱۹۶۲۔ص۔۲۶

۴۶۔نورشاہ۔ویرانے کے پھول۔مرغابی۔چاند پریس جموں۔۱۹۶۲۔ص۔۱۰۴

۴۷۔نورشاہ۔ویرانے کے پھول۔بٹوٹ کے آخری رات۔چاند پریس جموں۔۱۹۶۲۔ص۔۱۱۹

۴۸۔نورشاہ۔گیلے پتھروں کی مہک۔تتلی۔راما آرٹ پریس امرت سر۔۱۹۸۲۔ص۔۸۸

۴۹۔نورشاہ۔آسمان پھول اور لہو۔میرے حصے کے خواب۔سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۱۴۴

۵۰۔نورشاہ۔آسمان پھول اور لہو۔ایک کہانی کے تین باب۔سرینگر کشمیر۔۲۰۰۹۔ص۔۱۸۴

۵۱۔عبدالغنی شیخ۔دوراہا۔دوراہا۔جبران پبلی کیشنز لیہہ لداخ۔۱۹۹۳۔ص۔۱۴۳

۵۲۔عبدالغنی شیخ۔دوراہا۔ہوا۔جبران پبلی کیشنز لیہہ لداخ۔۱۹۹۳۔ص۔۱۵۷

۵۳۔مخمور بدخشی۔نیل کنول مسکائے۔نور اور سائے۔ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد۔۱۹۶۲۔ص۔۶۹

۵۴۔مخمور بدخشی۔نیل کنول مسکائے۔وادی کی رانی۔ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد۔۱۹۶۲۔ص۔۱۱۵

۵۵۔شبنم قیوم۔ایک زخم اور سہی۔دسہرہ کی سیتا۔سرینگر کشمیر۔۱۹۷۱۔ص۔۱۲

۵۶۔شبنم قیوم۔نشانات۔دیا جالاؤ۔...روشنی بجھاؤ۔وقار پبلیکیشنز سرینگر کشمیر۔۲۰۰۷۔ص۔۳۸

۵۷۔شبنم قیوم۔نشانات۔میری جوانی تیرا انعام۔وقار پبلیکیشنز سرینگر کشمیر۔۲۰۰۷۔ص۔۴۷

۵۸۔شبنم قیوم۔نشانات۔بہت اونچے، بہت نیچے۔وقار پبلیکیشنز سرینگر کشمیر۔۲۰۰۷۔ص۔۸۵۔۸۸

۵۹۔شبنم قیوم۔نشانات۔بہت اونچے، بہت نیچے۔وقار پبلیکیشنز سرینگر کشمیر۔۲۰۰۷۔ص۔۹۲

۶۰۔شبنم قیوم۔نشانات۔اور میں مر گیا۔وقار پبلی کیشنز سرینگر کشمیر۔۲۰۰۷۔ص۔۱۳۶۔۱۳۷

۶۱۔عمر مجید/مرتب سلیم سالک۔عمر مجید کے بہترین افسانے۔میزان پبلیشرز سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۲۷

۶۲۔عمر مجید/مرتب سلیم سالک عمر مجید کے بہترین افسانے۔محمد شمیم کو کشمیر جانا ہے۔میزان پبلیشرز سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۸۹

۶۳۔عمر مجید/مرتب سلیم سالک۔عمر مجید کے بہترین افسانے۔محمد شمیم کو کشمیر جانا ہے۔میزان پبلیشرز سرینگر۲۰۰۹۔ص۔۹۰

۶۴۔عمر مجید/مرتب سلیم سالک۔عمر مجید کے بہترین افسانے۔محمد شمیم کو کشمیر جانا ہے۔۔میزان پبلیشرز سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۹۲

۶۵۔عمر مجید/مرتب سلیم سالک۔عمر مجید کے بہترین افسانے۔مردہ چنار۔۔میزان پبلیشرز سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۹۶

۶۶۔عمر مجید/سلیم سالک۔عمر مجید کے بہتریں افسانے۔مردہ چنار۔۔میزان پبلیشرز سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۹۹

۶۷۔عمر مجید/مرتب سلیم سالک۔عمر مجید کے بہترین افسانے۔برف کے پھول۔میزان پبلیشرز سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۱۰۱

۶۸۔عمر مجید/سلیم سالک۔عمر مجید کے بہترین افسانے۔پرچھائیاں۔میزان پبلیشرز سرینگر۲۰۰۹۔ص۔۱۵۷

۶۹۔وریندر پٹواری۔لالہ رخ۔برف۔موڈرن پبلیشنگ ہاوس نئی دہلی۔۲۰۱۳۔ص۔۵۸

۷۰۔وریندر پٹواری۔لالہ رخ۔رسرتھ۔۔موڈرن پبلیشنگ ہاوس نئی دہلی۔۲۰۱۳۔۲۵۵

۷۱۔وریندر پٹواری۔لالہ رخ۔لالہ رخ۔موڈرن پبلیشنگ ہاوس نئی دہلی۔۲۰۱۳۔ص۔۲۹۴

۷۲۔وریندر پٹواری۔لالہ رخ۔روبوٹ۔موڈرن پبلیشنگ ہاوس نئی دہلی۔۲۰۱۳۔ص۔۴۷

۷۳۔بشیر شاہ۔سب کے سمندر میں۔برف کا درد۔میزان پبلیشرز سرینگر۔۲۰۱۱۔ص۔۹۴

۷۴۔بشیر شاہ۔شب کے سمندر میں۔برف کا درد۔میزان پبلیشرز سرینگر۔۲۰۱۱۔ص۔۹۵

۷۵۔خالد حسین۔ستی سر کا سورج۔ستی سر کا سورج۔پنجاب ادبی منگت، جموں۔۲۰۱۱۔ ص۔۶۱۔۶۲

۷۶۔خالد حسین۔ستی سر کار سورج۔لکیر۔۔پنجاب ادبی منگت، جموں۔۲۰۱۱۔ ص۔۶۶

۷۷۔خالد حسین۔ستی سر کا سورج۔ایک مرے بندے کی کہانی۔پنجاب ادبی منگت، جموں۔۲۰۱۱۔ص۔۹۰

۷۸۔خالد حسین۔ستی سر کا سورج۔سانجھا درد۔پنجاب ادبی سنگت، جموں۔۲۰۱۱(ص۔۱۳۴۔۱۳۵

۷۹۔اشوک پٹواری۔کچھ لمحے کچھ سائے۔فریاد۔موڈرن پبلیشنگ نئی دہلی۔۲۰۰۵۔ص۔۹۰

۸۰۔اشوک پٹواری۔کچھ لمحے کچھ سائے۔فریاد۔موڈرن پبلیشنگ ہاوس نئی دہلی۔۲۰۰۵۔ص۔۹۴

۸۱۔جان محمد آزاد۔آشیاں سے آسماں تک۔لالہ طور۔پرائم پرنٹنگ پریس سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۴۱

۸۲۔جان محمد آزاد۔آشیاں آسماں تک۔لالہ طور۔پرائم پرنٹنگ پریس سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۴۲

۸۳۔جان محمد آزاد۔آشیاں سے آسماں تک۔آس کا پنچھی۔پرائم پرنٹنگ پریس سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۵۸

۸۴۔جان محمد آزاد۔آشیاں سے آسماں تک۔آس کا پنچھی۔پرائم پرنٹنگ پریس سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۶۶

۸۵۔جان محمد آزاد۔آشیاں آسماں تک۔آس کا پنچھی۔پرائم پرنٹنگ پریس سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۷۰

۸۶۔جان محمد آزاد۔آشیاں سے آسماں تک۔انضمام۔پرائم پرنٹنگ پریس سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۱۰۳

۸۷۔شمس الدین شمیم۔ویرانے۔انگلیاں۔۱۹۷۴۔ص۔۴۸

۸۸۔شمس الدین شمیم۔ویرانے۔رات کے سائے میں۔۱۹۷۴۔ص۔۹۳

۸۹۔راجہ نذر بونیاری۔یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں۔سٹیٹ منٹ۔کشمیر۔۲۰۰۹۔ص۔۳۳

۹۰۔راجہ نذر بونیاری۔یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں۔جھنجھنا۔کشمیر۔۲۰۰۹۔ص۔۴۷

۹۱۔راجہ نذر بونیاری۔یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں۔آدھی سواری۔کشمیر۔۲۰۰۹۔ص۔۵۷

۹۲۔راجہ بونیاری۔یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں۔پورا چاند اور آدھی رات۔کشمیر۔۲۰۰۹۔ص۔۹۷

۹۳۔دیپک کنول۔پمپوش۔باباجی۔راہی کتاب گھر شاہدرہ۔۲۰۱۱۔دہلی۔ص۔۱۲۱

۹۴۔دیپک کنول۔پمپوش۔مرغی چور۔راہی کتاب گھر شاہدرہ، دہلی۔۲۰۱۱۔ص۔۱۴۳

۹۵۔دیپک کنول۔پمپوش۔پمپوش۔راہی کتاب گھر شاہدرہ دہلی۔۲۰۱۱۔ص۔۱۵۳۔۱۵۹

۹۶۔دیپک بدکی۔ریزہ ریزہ حیات۔دس انچ زمین۔میزان پبلیشرز سرینگر۔۲۰۱۱۔ص۔۲۸

۹۷۔دیپک بدکی۔ریزہ ریزہ حیات۔میں ساری کی ساری تمہاری۔میزان پبلیشرز سرینگر۔۲۰۱۱۔ص۔۱۲۷

۹۸۔دیپک بدکی۔ریزہ ریزہ حیات۔کبھی ہم سے سنا ہوتا۔میزان پبلیشرز سرینگر۔۲۰۱۱۔ص۔۴۳

۹۹۔دیپک بدکی۔ریزہ ریزہ حیات۔ریزہ ریزہ حیات۔میزان پبلیشرز سرینگر۔۲۰۱۱۔ص۔۴۸

١٠٠۔دیپک بدکی۔ریزہ ریزہ حیات۔پروٹوکول۔میزان پبلیشرز سرینگر۔٢٠١١۔ص۔١٠١

١٠١۔دیپک بدکی۔زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی۔زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی۔میزان پبلیشرز سرینگر۔٢٠٠٧۔ص۔٧٩

١٠٢۔دیپک بدکی۔زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی۔اداس لمحوں کا کرب۔میزان پبلیشرز سرینگر۔٢٠٠٧۔ص۔٨٦۔٨٧

١٠٣۔دیپک بدکی۔ادھورے چہرے۔اچانک۔انٹرنیشنل اردو پبلیکیشنز دریا گنج نئی دہلی۔١٩٩٩۔ص۔٩٣

١٠٤۔غلام نبی شاہد۔اعلان جاری ہے۔درد کا دریا۔اسلام آباد کشمیر۔٢٠١٣۔ص۔٥٩

١٠٥۔زاہد مختار۔جہلم کا تیسرا کنارہ۔المختار پبلی کیشنز کشمیر۔٢٠٠٤۔ص۔٣٦

١٠٦۔زاہد مختار۔جہلم کا تیسرا کنارا۔پل صراط۔المختار پبلی کیشنز کشمیر۔٢٠٠٤۔ص۔٤٤۔٤٥

١٠٧۔زاہد مختار۔جہلم کا تیسرا کنارا۔سحر ہونے تک۔المختار پبلی کیشنز کشمیر۔٢٠٠٤۔ص۔٧٣

١٠٨۔زاہد مختار۔جہلم کا تیسرا کنارا۔جہلم کا تیسرا کنارا۔المختار پبلی کیشنز کشمیر۔٢٠٠٤۔ص۔١١١

١٠٩۔ترنم ریاض۔یمبرزل۔کشتی۔نرالی دنیا پبلیکشنز دریا گنج نئی دہلی۔٢٠٠٤۔ص۔١١۔١٦

١١٠۔ترنم ریاض۔یمبرزل۔مجسمہ۔نرالی دنیا پبلیکشنز دریا گنج نئی دہلی۔٢٠٠٤۔ص۔٩١

١١١۔ترنم ریاض۔یمبرزل۔یمبرزل۔نرالی دنیا پبلیکشنز دریا گنج نئی دہلی۔٢٠٠٤۔ص۔١١٧

١١٢۔ترنم ریاض۔یمبرزل۔یمبرزل۔نرالی دنیا پبلیکشنز دریا گنج نئی دہلی۔٢٠٠٤۔ص۔١٢٢

١١٣۔ترنم ریاض۔یمبرزل۔یمبرزل۔نرالی دنیا پبلیکشنز دریا گنج نئی دہلی۔٢٠٠٤۔ص۔١٢٦

١١٤۔ترنم ریاض۔یہ تنگ زمین۔حور۔موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دریا گنج نئی دہلی۔١٩٩٨۔ص٦١

١١٥۔ترنم ریاض۔یہ تنگ زمین۔حور۔موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دریا گنج نئی دہلی۔١٩٩٨۔ص۔٦٠

١١٦۔ترنم ریاض۔یہ تنگ زمین۔حور۔موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دریا گنج نئی دہلی۔١٩٩٨۔ص۔٦٣۔٦٤۔٦٥

١١٧۔ترنم ریاض۔یہ تنگ زمین۔چھوئی موئی۔موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دریا گنج نئی دہلی۔١٩٩٨۔ص۔٦٧

١١٨۔ترنم ریاض۔یہ تنگ زمین۔چھوئی موئی۔موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دریا گنج نئی دہلی۔١٩٩٨۔ص۔٧١

١١٩۔ترنم ریاض۔ابابیلیں لوٹ آئیں گی۔مٹی۔نرالی دنیا پبلی کیشنز، دریا گنج نئی دہلی۔٢٠٠٠۔ص۔٨٢

١٢٠۔پرویز مانوس۔شکارے کی موت۔شکارے کی موت۔درخشاں پبلیکیشن، پونچھ سٹی جموں۔١٩٩٥۔ص۔٢٢

١٢١۔پرویز مانوس۔شکارے کی موت۔۔درخشاں پبلیکیشن، پونچھ سٹی جموں۔١٩٩٥۔ص۔٢٣

١٢٢۔پرویز مانوس۔شکارے کی موت۔چوتھا کونہ۔۔درخشاں پبلیکیشن، پونچھ سٹی جموں۔١٩٩٥۔ص۔٣٦۔٣٨

١٢٣۔پرویز مانوس۔شکارے کی موت۔ریلیف۔درخشاں پبلیکیشن، پونچھ سٹی جموں۔١٩٩٥۔ص۔٥٨

١٢٤۔پرویز مانوس۔شکارے کی موت۔سانجھی دھرتی۔درخشاں پبلیکیشن، پونچھ سٹی جموں۔١٩٩٥۔ص۔٨١

١٢٥۔سیدہ نکہت فاروق۔قہر نیلے آسمان کا۔قہر نیلے آسمان کا۔میزان پبلشرز سرینگر۔٢٠٠٩۔ص۔٢٨۔٢٩

١٢٦۔سیدہ نکہت فاروق۔قہر نیلے آسماں کا۔آدھے ادھورے لوگ۔میزان پبلشرز سرینگر۔٢٠٠٩۔ص۔٤٥

۱۲۷۔سیدہ نکہت فاروق۔قہر نیلے آسماں کا۔ایک خواب ادھورا سا۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۸۵

۱۲۸۔سیدہ نکہت فاروق۔قہر نیلے آسماں کا۔تارتار آنچل۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۰۹۔ص۔۸۵

۱۲۹۔میر ایوب میر۔ٹھنڈی آگ۔زندہ لاشیں۔سرینگر۔۱۹۹۳۔ص۔۱۱۔۱۲

۱۳۰۔مقبول ساحل۔قدم قدم تعریز۔قدم قدم تعزیز۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۲۔ص۔۶

۱۳۱۔مقبول ساحل۔قدم قدم تعزیز۔بانسری۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۲۔ص۔۵۲

۱۳۲۔مقبول ساحل۔قدم قدم تعریز۔زبرون کے دامن میں۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۲۔ص۔۸۳

۱۳۳۔مقبول ساحل۔قدم قد،تعزیز۔چشمے والا بزرگ۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۲۔ص۔۱۱۵

۱۳۴۔مقبول ساحل۔قدم قدم تعزیز۔چشمے والا بزرگ۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۲۔ص۔۱۱۹

۱۳۵۔مقبول ساحل۔قدم قدم تعزیز۔چشمے والا بزرگ۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۲۔ص:۱۲۱۔۱۲۲

۱۳۶۔مقبول ساحل۔قدم قدم تعزیز۔پکنک۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۲۔ص۔۲۰۵

۱۳۷۔مقبول ساحل۔قدم قدم تعزیز۔میٹھی قینچی۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۲۔ص۔۲۳۲۔۲۳۳

۱۳۸۔ریاض توحیدی۔کالے پیڑوں کا جنگل۔ناکہ بندی۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۱۔ص۔۴۰

۱۳۹۔ریاض توحیدی۔کالے پیڑوں کا جنگل۔جشن قبرستان۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۱۔ص۔۴۵

۱۴۰۔ریاض توحیدی۔کالے پیڑوں کا جنگل۔ہوم لینڈ۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۱۔ص۔۷۵

۱۴۱۔ریاض توحیدی۔کالے پیڑوں کا جنگل۔کشمیر نواز میزان پبلشر سرینگر۔۲۰۱۱۔ص۔۸۳

۱۴۲۔ریاض توحیدی۔کالے پیڑوں کا جنگل۔کبھی الوادع نا کہنا۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۱۔ص۔۸۷۔۸۸

۱۴۳۔ریاض توحیدی/مدیر محمد اشرف ٹاک۔رسالہ شیرازہ۔دوشالہ۔جموں اینڈ کشمیر کلچرل اکیڈیمی سرینگر۔ص۔۲۵۵۔۲۵۶

ماحصل

تہذیب وثقافت کا تصور اجتماعی سطح پر ایک ہی طرح سے پیش کیا گیا ہے۔اس کا جائزہ پہلے باب میں لیا گیا ہے۔اس تعلق سے مفکرین اور دانشوروں نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ ہر ایک نے اسے اپنے اپنے نظریے سے دیکھا اور پرکھا ہے۔لیکن وہ تمام نظریات تہذیب وہ ثقافت کے ہی کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں مگر اس کی کوئی مکمل تصویر پیش نہیں کرتے ہیں۔کسی نے تہذیب کو ایک الگ اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے،کسی نے ثقافت کو الگ طور سے استعمال کیا ہے اور کسی نے دونوں کو ایک ساتھ تہذیب وثقافت کی اصطلاح سے برتا ہے۔لیکن کوئی بھی ان کے معنی ومفہوم میں امتیاز قائم نہیں کرسکا ہے۔کسی نے تہذیب کی جو تعریف کی ہے اور پھر کسی دوسرے نے ثقافت کی وہی تعریف کی ہے۔بعض مفکرین نے ان دونوں اصطلاحات کو ہم معنی قرار دیا ہے۔ان تمام نظریات سے اعلحدٰہ سطح پر ان دونوں اصطلاحات کی کوئی صورت ذہن میں نہیں اُبھرتی۔لغوی اور اصطلاحی طور پر بھی انھیں خلط ملط کر کے پیش کیا گیا ہے۔یعنی تہذیب کا ترجمہ کلچر کیا گیا ہے اور پھر دوسری جگہ ثقافت کا ترجمہ بھی کلچر بتایا گیا ہے۔کہیں پر ثقافت کے معنی تہذیب بتائے گئے ہیں اور کہیں پر کلچر کے معنی تہذیب بتائے گئے ہیں اور کہیں پر کلچر کا ترجمہ تہذیب وثقافت کیا گیا ہے۔جس سے انھیں الگ کرنے میں بہت بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔دراصل اُردو میں تہذیب وثقافت کا استعمال

اس طرح سے کیا گیا ہے کہ یہ دونوں اصطلاحات ہم معنی شکل اختیار کر گئے ہیں۔اس طرح تہذیب و ثقافت دو الگ الگ اصطلاح ہوتے ہوئے بھی ساتھ ساتھ ہیں اور دونوں مل کر معاشرے کی تعمیر کرتے ہیں۔اس لئے میں نے بھی انھیں ''تہذیب وثقافت'' کی اصطلاح سے استعمال کیا ہے۔جو اپنے اندر وسیع معنی ومفہوم رکھتی ہے۔یہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہے۔یہ کسی مخصوص نظریہ یا مفہوم کی محتاج نہیں ہے۔کائنات میں انسانی زندگی کا سارا نظام اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔اس میں سماجی، مادی، ذہنی، تاریخی، روحانی اور مذہبی میلانات وغیرہ سب چیزیں شامل ہیں۔سماج کا ہر فرد تہذیب وثقافت کا قیدی ہے۔وہ جو بھی کرتا ہے۔مثلاً جو خواب دیکھتا ہے، جو خواہش کرتا ہے، کام کاج، شادی بیاہ اور تفریح وغیرہ سب اپنی تہذیب وثقافت کے مطابق کرتا ہے۔یہ تہذیب وثقافت ہی ہے جو انسانی توانائیوں کو کنٹرول کرتی ہے اور حسب معمول آزادی دیتی ہے۔یہی انسان کو زندگی گزارنے کے طریقے سکھاتی ہے۔تہذیب وثقافت کے بغیر معاشرے میں انسانی زندگی کی کوئی وقعت نہیں ہے۔یہ سماج میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔جو سماج کو تعمیر کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

چنانچہ میرا مقصد کشمیری تہذیب و ثقافت کو ابھارنا ہے۔ جس کا تابناک ماضی تاریخی دستاویزات میں محفوظ ہے۔کشمیر اپنے جغرافیائی محل وقوع، سیاسی و تاریخی، ارضی حسن اور تہذیب وثقافت کی رنگارنگی کی وجہ سے برعظیم میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ابتدا میں کشمیر ایک گہری جھیل کی شکل میں موجود تھا جس کے چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ استادہ ہیں۔پھر اس کی پانی کا نکاس کیسے ہوا۔ اس کے تعلق سے کئی نظریات پیش کئے گئے ہیں۔جن میں بیشتر نظریات خیالی قصے کہانیوں سے مستعار لیے گئے ہیں۔لیکن ان تمام نظریات کو چھوڑ کر ایک مستند اور اطمینان بخش نظریہ یہ نظر آتا ہے کہ کشمیر میں زلزلے ہمیشہ سے آتے رہے ہیں۔جن کی وجہ سے کئی ہزار سال پہلے بارہ مولہ کے قریب ایک طرف پہاڑ ٹوٹ گیا، جہاں سے پانی خارج ہو گیا اور وادی کشمیر وجود میں آئی۔پھر اس کی اپنی ایک خودمختار حکومت ہوا کرتی تھی۔مورخین کے مطابق ۲۴۵۰ قبل مسیح سے کشمیر کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔تب سے لیکر ۱۲۳۹ء تک کشمیر میں ہندو راجاؤں کی حکومت تھی جو کشمیر کے ہی باشندے تھے اور

اس وقت کشمیر میں صرف ہندو مذہب رائج تھا۔۱۳۲۰ء میں رینچن شاہ کے اسلام قبول کرنے کے ساتھ کشمیر میں اسلام طلوع ہوا۔ اسلام کی طرف یہاں کی عوام بہت جلدی راغب ہوئی اور اسلام قبول کرنے لگے۔ اس کے بعد ۱۵۸۶ء تک کشمیر کے دو مسلمان خاندانوں نے کشمیر پر حکومت کی۔ ۱۳۳۹ء تک شہمیری خاندان کی حکومت رہی اور اس کے بعد ۱۵۸۶ء تک چک خاندان کی حکومت تھی۔ لیکن تاریخ کے مختلف استحصال اور جارج قوتوں نے کشمیر میں اپنے پنجے گاڑے، ۱۵۸۶ء میں مغل بادشاہ اکبر نے کشمیر پر قبضہ کیا۔ مغلوں کے زوال کے بعد اس پر افغانوں کا قبضہ ہوگیا۔ افغانوں کے بعد سکھوں کا تسلط قائم ہوا۔ پھر انگریز اس پر قابض ہوگئے اور ''معاہدہ امرتسر'' کے ذریعہ اس خطہ ارضی اور اس کے باسیوں کو گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ کوڑیوں کے مول فروخت کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں بھارت نے اس پر قبضہ جمالیا۔ اس طرح طویل عرصے سے کشمیری مقامی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی آزادی اور حقوق کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

تہذیب وثقافت ارتقاء پذیر ہوتی رہتی ہے اور اس کی باقیات تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہوکر رہ جاتی ہے اس لئے تاریخ ،تہذیب وثقافت کی ایک اہم حصّہ کہی جاسکتی ہے۔ کشمیری تہذیب و ثقافت اپنی ایک منفرد شناخت رکھتی ہے جس کے خدوخال تیسرے باب میں پیش کیے گئے ہیں جو ہر اعتبار سے ملک بھر میں الگ تھلگ ہے۔ اس کے وجوہات یوں ہیں کہ آج کے مقابلے میں کشمیر زیادہ ٹھنڈا علاقہ تھا جبکہ آج سہولیات بھی میسر ہے۔ آج سے کئی سو سال پہلے یہ بھی میسر نہیں تھیں اس لئے کشمیر میں ایک منتخب طبقہ ہی اس سردی کو جھیلتا تھا اور سردی سے بچنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتے تھے جو آگے چل کر یہاں کی تہذیب میں شامل ہوئے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کشمیر کو ایک الگ ملک ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہ چکا ہے اور ہندوستان کے ساتھ ملتے وقت یہاں آرٹیکل ۳۷۰ لگا ہے جس کے تحت یہاں کسی بھی غیر ملکی یا غیر ریاستی فرد کو زمین خریدنے کا اختیار نہیں ہے۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیری عوام ہمیشہ ظلم وزیادتی کی شکار ہوتی رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے دوسرے ریاست کے لوگ یہاں تجارت کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس نتیجہ میں کشمیر ملی جلی تہذیب نہ بن سکی۔

مزید ٹھنڈی ہواؤں کا بانکپن ،خوشگوار موسم ، برف سے بھری بڑی بڑی چوٹیاں ،خاموش جھیلیں ، پراسرار نظارے ،جھرنے اور چشمے اسے دنیا کے دوسرے خطوں سے انفرادیت عطا کرتے ہیں ۔جس کی بنا پر اسے جنت بےنظیر کے خطاب سے نوازا گیا۔اس کے علاوہ حساس ذہن رکھنے والے بادشاہوں نے یہاں کی تعمیرات میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور یہاں اعلیٰ فن تعمیرات کے نمونے کھڑا کر دیئے۔جن میں مندریں ،مساجد ،خانقاہیں ، قلعے اور محلات شامل ہیں ۔فطین ذہن رکھنے والے یہاں کے دستکاروں کی دستکاری کے انمول نمونے اپنی دستکاری کی گواہی دے رہے ہیں ۔ یہاں کی شال بانی ، پیپر ماشی ، قالین بافی ،کشیدہ کاری وغیرہ دور دور تک مشہور ہے ۔کشمیری لباس اور پکوان کی بھی اپنی منفرد شناخت ہے ۔کشمیری ''وازہ وان'' اور اسے پیش کرنے کا اپنا ایک الگ انداز اسے دوسرے خطوں کی تہذیبوں سے امتیاز عطا کرتا ہے ۔کشمیر کے سایہ دار درخت اور لذیز میوے شاید ہی کہیں اور دستیاب ہوں ۔ یہاں کے سیب ، اخروٹ ، بادام ، خوبانی اور زعفران عمدہ پیداوار میں شامل ہیں ۔جس کی کاشت یہاں بڑے پیمانے پر ہوتی ہے ۔کشمیر کے فطین اور نفاست پسند لوگوں اور ان کی مہمان نوازی کے چرچے دور دور تک مشہور ہے ۔ یہ لوگ گھر آئے ہوئے مہمان کا کھلے دل سے استقبال کرتے ہیں اور مہمان کی خاطر داری کرنے میں کوئی کمی نہیں رکھتے ہیں ۔اس کے علاوہ کشمیریوں کے رسومات اور ان کو ادا کرنے کا ڈھنگ تقریباً دنیا بھر کے رسومات سے مختلف ہیں ۔ بچہ پیدا ہونے ،شادی بیاہ اور تہواروں پر مختلف رسموں کا اہتمام کیا جاتا ہے ۔جن میں زافل ،مبارکباد ، پاؤ،عقیقہ ،منڈن ، بات ، منگنی ، بال کھولنے کی رسم ،مہندی کی رسم ، فاتحہ خوانی ، نکاح خوانی ، برات ، رخصت ،گھونگھٹ اُٹھانا ، ہش کاٹ اور پھر سال وغیرہ شامل ہیں ۔ان تمام رسومات پر مقالے کے تیسرے باب میں روشنی ڈالی گئی ہے ۔اب گلوب لائی زیشن کے دور میں تہذیبیں بڑے پیمانے پر اثر انداز ہورہی ہیں جس کے تاثر سے کشمیر بھی نہ بچ سکا ۔اب یہاں کا لباس ، رسومات ، رہن سہن ، پیار ومحبت اور آپسی بھائی چارہ وغیرہ دھیرے دھیرے ختم ہوتا جارہا ہے ۔جس کی ایک منفرد شناخت ہیں ۔لوگ مشینی آلات کے محتاج ہوتے جارہے ہیں ۔اب بیرونی تہذیب وثقافت کے اثرات سے کشمیری لباس میں بدلاؤ آیا ہے ۔

پھرن، پگڑی اور قمیض پائجامے کا رواج دھیرے دھیرے ختم ہو رہا ہے۔ پھرن صرف شدید سردی میں پہنا جاتا ہے۔ اب لوگ جدید طرز کی پتلون، ٹائی اور کوٹ وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔ آرائش وزیبائش میں کافی بدلاؤ آیا ہے۔ کشمیری عورتوں کا زیور اب صرف تصویر لینے کے لئے شوق سے استعمال کیا جاتا ہے جس کو پہنتے وقت دلہن مندر کی کلس جیسی نظر آتی تھی۔ کشمیری زبان کا استعمال کم ہونے لگا ہے۔ بچے کو اپنی اس مادری زبان سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اس زبان کے تحریر کردہ بے شمار علم وادب اور لوک موسیقی سے نئی پود ناواقف ہے۔ خاص طور سے کشمیر ایک الگ ہی حادثے کا شکار ہوا۔ چونکہ گزشتہ ۲۵ سالوں کی بربریت، قتل وغارت اور ظلم واستبداد نے کشمیری تہذیب وثقافت پر کافی اثرات مرتب کیے۔ جس سے شادی بیاہ کے رسومات سمٹ کے رہ گئے۔ ''روف گیتوں'' بانڈ پتھر اور آپسی میل جول کا خاتمہ ہو گیا۔ لوگ پھونک پھونک کر گھر سے باہر قدم رکھتے ہیں کہ کیا پتہ واپس آنا ہو کہ نہیں۔ خوف اور دہشت زدہ یہ لوگ گھر کے اندر بھی ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے رہتے ہیں۔ مسلسل کرفیو اور ہڑتال نے کشمیر کا نیا رخ موڑ دیا۔ ایک کشمیری کی شناخت آئی کارڈ (i-card) تک محدود رہ گئی۔ جس کے سامنے ایک کشمیری کی کوئی وقعت نہ رہی۔ جو کشمیری کہیں سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ اب آئی کارڈ گم ہو جانے پر قدم قدم پر اس کی جان کو خطرہ لاحق رہتا ہے۔ پھرن، برقعہ اور داڑھی کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ برقعہ پوش خاتون جو برقعہ پردہ کرنے کے لئے پہنتی تھی اب اسے فوج کے سامنے برقعہ اُٹھا کر اپنا پردہ فاش کرنا پڑتا ہے۔ ان سب باتوں سے ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اب یہی تہذیبی بکھراؤ جموں وکشمیر کے افسانوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ ادیب واضح طور پر سماج کا نمائندہ ہوتا ہے۔ جس قدر سماج میں بدلاؤ آتا ہے ادیب اسی سے متعارف کراتا ہے اور ان بدلتی تبدیلیوں کی اچھائیوں اور برائیوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ جموں وکشمیر میں بیسوی صدی سے پریم ناتھ پردیسی کی کہانیوں سے اُردو افسانے کا آغاز ہوا۔ ان کے یہاں جا بجا کشمیری تہذیب وثقافت کے نمونے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے نمایاں طور پر کشمیری تہذیب وثقافت کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ جن میں خاص طور سے پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در کا نام لیا جا سکتا

ہے۔ انھوں نے مختلف زاویوں سے کشمیری تہذیب وثقافت کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ جہاں انھوں نے کشمیری رہن سہن، رسومات اور غربت وغیرہ کو پیش کیا ہے وہیں کشمیر کے خوبصورت مناظر بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئے ہیں۔ چاہئے موسم بہار کے حسین نظارے ہو یا موسم سرما کی شدت بھری سردی میں برف سے ڈھکی وادی ہو۔ ان کے یہاں کشمیر کے کھیت کھلیان، برف پوش پہاڑ، سر بفلک درخت جلوہ نما ہوتے ہیں۔ کشمیری زبان کے الفاظ اور گیت کشمیری رسومات کے ساتھ ان کے یہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے کردار انسان دوستی، محبت پرستی، آپسی بھائی چارے اور امن پسندی کے مجسمے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے کشمیر کے تہذیبی پس منظر میں کشمیر کے بھوک، افلاس اور استحصال سے بلکتی زندگیوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ کشمیری پکوان اور برتنوں کا ذکر بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔ دھول (پردیسی)، کتبے (پردیسی)، ٹیکہ بٹن (پردیسی)، نئ صبح (پردیسی) جھنجھنا (پردیسی)، بہتے چراغ (پردیسی)، نیلی آنکھیں (در)، گیت کے چار بول (در)، کوفتہ (در)، کاغذ کا واسدیو (در) ان کے ایسے افسانے ہیں جو کشمیری تہذیب وثقافت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در کے ہمعصر افسانہ نگاروں میں قدرت اللہ شہاب، ٹھاکر پونچھی اور موہن یارو وغیرہ ہے جن کے یہاں بھی کشمیری تہذیب وثقافت کے چند نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے بعد تا حال تک جموں وکشمیر میں افسانہ نگاروں کی ایک لمبی فہرست ابھر کر سامنے آئی۔ جن میں تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیری، حسن ساہو، پشکر ناتھ، برج پریمی، نور شاہ، محمود بدخشی، شبنم قیوم، عمر مجید، وریندر پٹواری، خالد حسین، جان محمد آزاد، دیپک بدکی، ترنم ریاض اور مقبول ساحل وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام کے بیشتر افسانے کشمیری تہذیب وثقافت پر مبنی ہے۔ کشمیری تہذیب وثقافت کے کئی پہلو جا بجا ان کے یہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے کردار کشمیری تہذیب وثقافت کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کشمیر کے حالات، واقعات، ماحول اور معاشرے کے مسائل پوری شدت کے ساتھ موجود ہے جس کو انھوں نے حقیقت پسندی سے پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں چند شاہکار افسانے رکھے جاسکتے ہیں۔ جن میں جہلم کے سینے پر (تیج بہادر بھان)، اندھیروں میں

(حامدی کاشمیری)، عکس (حسن ساہو)، صدائے بازگشت (حسن ساہو)، جوڑا ابابیلوں کا (پشکرناتھ)، درد کا مارا (پشکرناتھ)، سپنوں کی شام (برج پریمی)، آنسوں کے دیپ (برج پریمی)، اندھیرے اُجالے (نورشاہ)، علیا اور بلبل (نورشاہ)، بٹوت کے آخری رات (نورشاہ)، بہت اُونچے، بہت نیچے (شبنم قیوم)، مردہ چنار (عمر مجید)، پرچھائیاں (عمر مجید)، برف (وریندر پٹواری)، رسرتھ (وریندر پٹواری)، ستی سر کا سورج (خالد حسین)، آس کا پنچھی (جان محمد آزاد)، انگلیاں (شمس الدین شمیم)، پمپوش (دیپک کنول)، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (دیپک بدکی)، اداس لمحوں کا کرب (دیپک بدکی)، مجسمہ (ترنم ریاض)، بمبر زل (ترنم ریاض)، حور (ترنم ریاض)، چھوئی موئی (ترنم ریاض)، شکارے کی موت (پرویز مانوس)، سانجھی دھرتی (پرویز مانوس) آدھے ادھورے لوگ (سیدہ نکہت فاروق)، بانسری (مقبول ساحل)، چشمے والا بزرگ (مقبول ساحل)، دوشالہ (ریاض توحیدی)، کشمیر نواز (ریاض توحیدی) وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ایسے افسانے ہیں جن میں کشمیری تہذیب وثقافت کی بازیافت اور صدائے باگشت سنائی دیتی ہے۔

ابتدائی افسانہ نگاروں نے شروع شروع میں کشمیر کے قدرتی مناظر میں پائی جانے والی کشش اور رومان پرور فضا کے سحر کو اہمیت دی اور یہ خطہ حسن کا استعارہ بن گیا۔لیکن وقت کے ساتھ ساتھ برٹش انڈیا کی تقسیم کاری سے جنت بے نظیر کشمیر آگ اور خون کا استعارہ بنتا چلا گیا۔ چونکہ اب نہ صرف افراد کی نفسیاتی کیفیات کو بیان کیا جانے لگا بلکہ اپنے عہد کا سچا منظرنامہ پیش کیا جانے لگا۔اس لئے افسانوں میں کشمیر کے جلتے چناروں اور سلگتے ہوئے مسائل کی بازگشت سنائی دینی لگی۔۱۹۹۰ء میں کشمیر ایک ایسے دور میں داخل ہوا کہ ہر کوئی آنکھیں ملتا رہ گیا۔ ایسے پس منظر میں کوئی بھی ادیب آفاقی نظریہ پیش نہیں کرسکتا۔ وہ محض اپنے سچ کا اظہار کرسکتا ہے۔ کیونکہ اس کی جڑیں اس کو اپنے ہی ملک کی مخالفت کرنے سے باز رکھتی ہے۔ اس لئے یہی خون خرابہ اور ظلم و بربریت وغیرہ کشمیر کے تہذیبی وثقافتی پس منظر میں پیش کیا جانے لگا۔کشمیری تہذیب وثقافت اب قتل وغیرت اور لہو کی تہذیب کا

روپ دھار چکی ہے۔جس سے جموں وکشمیر کے افسانے بے حد متاثر ہوئے نظر آتے ہیں۔ان افسانوں کے کردار محض کشمیری ہیں۔جن کے وضع،سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ اور لہجہ خالص کشمیری ہے۔کئی افسانے کشمیری پنڈتوں کی ہجرت پر لکھے گئے ہیں۔جن کے کردار ہمیشہ اپنی تہذیب وثقافت سے الگ ہونے پر اظہار افسوس کرتے نظر آتے ہیں۔

کشمیر کے خوبصورت زعفران زاروں اور لہلہاتے مرغزاروں کے درمیان پھیلی ہوئی اہل کشمیر کی غربت کو بھی افسانہ نگاروں نے سامنے لایا ہے۔ان افسانوں میں جہاں کشمیریوں کا سارا کرب جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہاں کشمیری تہذیب وثقافت کے تمام رنگ بھی بیان ہوتے ہیں۔جموں و کشمیر کے افسانوں میں کشمیر کے خوش ذائقہ پھلوں اور خوبصورت مناظر کے ساتھ ساتھ وہاں کے بے رنگ اور غربت زدہ پژمردہ چہرے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔اس طرح کشمیر، جموں وکشمیر کے افسانے میں ایک اہم موضوع کی حیثیت سے سامنے آیا ہے۔جس سے کشمیری تہذیب وثقافت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔

کتابیات

بنیادی مواد

شمارہ نمبر	کتاب	مصنف	مقامِ اشاعت	سن اشاعت
۱	آنندلہر	انحراف	گوڑھ بخشی نگر جموں	۱۹۸۴
۲	آنندلہر	سرحد کے پار	سیمانت پرکاشن دریا گنج نئی دہلی	۲۰۰۱
۳	اشوک پٹواری	کچھ لمحے کچھ سائے	موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی	۲۰۰۵
۴	برج پریمی / مرتب پریمی رومانی	سپنوں کی شام	ویب پبلی کیشیز جموں	۱۹۹۵
۵	بشیر شاہ	شب کے سمندر میں	میزان پبلشرز سرینگر کشمیر	۲۰۱۱
۶	پرویز مایوس	شکارے کی موت	درخشاں پبلیکیشن پونچھ سٹی	۱۹۹۵
۷	پریم ناتھ پردیسی	بہتے چراغ	بروکار پریس سرینگر، کشمیر	۱۹۵۵
۸	پریم ناتھ در	چناروں کے سائے میں	فنکار کلچرل آرگنائزیشن سرینگر	۱۹۹۱
۹	پشکر ناتھ	کانچ کی دنیا	دریا گنج نئی دہلی	۱۹۸۴
۱۰	پشکر ناتھ	عشق کا چاند اندھیرا	دریا گنج نئی دہلی	۱۹۸۱

۱۱	ترنم ریاض	یہ تنگ زمین	موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دریا گنج نئ دہلی	۱۹۹۸
۱۲	ترنم ریاض	ابابیلیں لوٹ آئیں گی	نرالی دنیا پبلی کیشنز دریا گنج نئ دہلی	۲۰۰۰
۱۳	ترنم ریاض	میرا رخت سفر	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۲۰۰۸
۱۴	ترنم ریاض	یمبرزل	نرالی دنیا پبلی کیشنز دریا گنج نئ دہلی	۲۰۰۴
۱۵	ٹھاکر پونچھی	زندگی کی دوڑ	مکتبہ آشیانہ قرول باغ نئ دہلی	۱۹۵۹
۱۶	جان محمد آزاد	آشیاں سے آسماں تک	پرائم پرنٹنگ پریس سرینگر کشمیر	۲۰۰۹
۱۷	حامدی کاشمیری	شہرافسوں	کمپیوٹر سٹی راجباغ سرینگر کشمیر	۲۰۰۹
۱۸	حسن ساہو	پھول کا ماتم	راج تلک روڈ جموں توی جموں	۱۹۷۴
۱۹	حسن ساہو	اندھا کنواں	دوران پبلیکیشنز سرینگر کشمیر	۱۹۹۶
۲۰	حسن ساہو	گردش دوراں	میزان پبلیشرز سرینگر کشمیر	۲۰۰۹
۲۱	خالد حسین	ستی سر کا سورج	پنجاب ادبی منگت ،جموں	۲۰۱۱
۲۲	دیپک بدکی	ادھورے چہرے	انٹرنیشنل اُردو پبلیکیشنز دریا گنج نئ دہلی	۱۹۹۹
۲۳	دیپک بدکی	زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی	میزان پبلیشرز سرینگر کشمیر	۲۰۰۷
۲۴	دیپک بدکی	ریزہ ریزہ حیات	میزان پبلیشرز سرینگر کشمیر	۲۰۱۱
۲۵	دیپک کنول	پمپوش	راہی کتاب گھر شاہدرہ دہلی	۲۰۱۱
۲۶	راجہ نذر بونیازی	یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں	بارہمولہ کشمیر	۲۰۰۹
۲۷	ریاض توحیدی	کالے پیڑوں کا جنگل	میزان پبلیشرز سرینگر کشمیر	۲۰۱۱
۲۸	زاہد مختار	جہلم کا تیسرا کنارہ	المختار پبلی کیشنز کشمیر	۲۰۰۴

۲۹	زماں آزردہ	اور وہ ٹاپ کر گئی	مرزا پبلیکیشن حسن آباد سرینگر	۱۹۷۵
۳۰	شبنم قیوم	نشانات	وقار پبلیکیشنز سرینگر کشمیر	۲۰۰۷
۳۱	شبنم قیوم	ایک زخم اور سہی	فتح کدل سرینگر کشمیر	۱۹۷۱
۳۲	شمس الدین شمیم	ویرانے		۱۹۷۴
۳۳	عبدالغنی شیخ	دوراہا	جبران پبلیکیشنز لیہہ، لداخ	۱۹۹۳
۳۴	عمر مجید / مرتب سلیم سالک	عمر مجید کے بہترین افسانے	میزان پبلیشرز سرینگر کشمیر	۲۰۰۹
۳۵	غلام نبی شاہد	اعلان جاری ہے	اسلام آباد کشمیر	۲۰۱۳
۳۶	فاروق رینزو	ڈوبتے کنارے		۱۹۷۹
۳۷	ایضاً	گرتی بلندیاں		۱۹۸۴
۳۸	قدرت اللہ شہاب / مرتب جوہر قدوسی	ماجی، یا خدا اور دیگر کہانیاں	کشمیر بک فاونڈیشن کشمیر	۲۰۱۲
۳۹	وریندر پٹوری	آواز سرگوشیوں کی	جے۔ اے۔ آفسٹ پریس دہلی	۱۹۹۴
۴۰	وریندر پٹوری	فرشتے خاموش ہیں		۱۹۸۱
۴۱	وریندر پٹوری	لالہ رخ	موڈرن پبلیشنگ ہاوس نئی دہلی	۲۰۱۳
۴۲	مجیدار جمند	ابابیلوں کی واپسی	سرینگر کشمیر	۲۰۰۹
۴۳	مخمور بدخشی	نیل کنول مسکائے	ادارہ ادبیات اُردو حیدر آباد	۱۹۶۲
۴۴	مشتاق احمد وانی	میٹھا زہر	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۲۰۰۸
۴۵	مشتاق مہدی	آنگن میں وہ	مہدی پبلی کیشنز حضرت بل سرینگر	۲۰۱۰
۴۶	مقبول ساحل	قدم قدم تعزیز	میزان پبلیشرز سرینگر کشمیر	۲۰۱۲
۴۷	نور شاہ	ویرانے کے پھول	چاند پریس جموں (توی)	۱۹۶۲

۴۸ نورشاہ	گیلے پتھروں کی مہک	راما آرٹ پریس امرتسر	۱۹۸۲
۴۹ نورشاہ	بے ثمر سچ	امیکس بکس، حضرت بل سرینگر کشمیر	۲۰۰۵
۵۰ نورشاہ	آسمان، پھول اور لہو	میزان پبلیشرز سرینگر	۲۰۰۹
۵۱ موہن یارو	دو کنارے	کلدیپ بک سنٹر جموں توی ، جموں	۱۹۶۲
۵۲ موہن یارو	تیسری آنکھ	کلدیپ بک سینٹر، جموں، توی	۱۹۶۰
۵۳ میر ایوب میر	ٹھنڈی آگ	سرینگر کشمیر	۱۹۹۳
۵۴ سیدہ نکہت فاروق	قہر نیلے آسماں کا	میزان پبلیشرز سرینگر کشمیر	۲۰۰۹
۵۵ واجدہ تبسم	ڈولتی نیا		۱۹۸۳

ثانوی مواد

شمارہ نمبر	کتاب	مصنف	مقامِ اشاعت	سن اشاعت
۱	اسحاق خان، پروفیسر محمد	kashmirs trasintion to islam	manoher,new delhi	۱۹۹۴
۲	اشرف وانی، پروفیسر محمد	islam in kashmir	oriental publishing house srinager	۲۰۰۵
۳	امین پنڈت، محمد	مختصر تاریخِ کشمیر	گلشن پبلیشرز، سرینگر، کشمیر	۲۰۰۱
۴	امین خان، محمد	آئینہ تاریخِ کشمیر	گلشن پبلیشرز، سرینگر، کشمیر	۲۰۰۲
۵	انوار احمد	جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کی اُردو ادبی خدمات	ادبی کتاب گھر صدر بل، سرینگر، کشمیر	
٦	ایم۔ایس۔ناز	تصویرِ کشمیر	گلشن پبلیشرز، سرینگر، کشمیر	۱۹۹۳
۷	برج پریمی	جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشو نما	رچنا پبلی کیشنز، جانی پورہ، جموں	۲۰۰۴
۸	پریم ناتھ بزاز م/مترجم عبدالحمید نظامی	تاریخِ جدو جہد آزادی کشمیر	گلشن پبلیشرز، سرینگر، کشمیر	۲۰۰۲
۹	ترنم ریاض	چشم نقش قدم (تنقیدی و تحقیقی مضامین)	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰٦
۱۰	ثناءاللہ بٹ، خواجہ	عہد نامہ کشمیر	بڑشاہ چوک سرینگر کشمیر	۱۹۹٦

۱۱	جان محمد آزاد	جموں وکشمیر کے اُردو مصنفین	جموں اینڈ کشمیر، کلچرل اکیڈیمی، سرینگر	۲۰۰۴
۱۲	جہانگیر/ مترجم اعجازلحق	توزک جہانگیر	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۷۰
۱۳	حامد حسن قادری	داستانِ تاریخ اردو	آفیسٹ پریس پرنٹرز، دہلی	۲۰۰۷
۱۴	حسن کھویہامی/ مترجم مولوی محمد ابراہیم	تاریخِ کشمیر، ترجمہ تاریخِ حسن	ریسرچ لائبریری، سرینگر	۱۹۵۷
۱۵	خلیفہ عبدالحکیم	ثقافت کیا ہے۔	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	۲۰۱۲
۱۶	رحمان مذنب	تہذیب وتمدن اور اسلام	شاھراہ قائداعظم، لاہور	۱۹۹۲
۱۷	سبط حسن	پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء	کراچی، دانیال	۲۰۰۹
۱۸	سلیم سالک، مرتب	جموں وکشمیر کے منتخب اُردو افسانے (پردیس سے ترنم ریاض تک)	میزان پبلیشرز، سرینگر، کشمیر	۲۰۱۱
۱۹	سید احمد دہلوی، مولوی/ مرتب خلیق انجم	رسوم دہلی	اُردو اکادمی، دہلی	۲۰۰۶
۲۰	صابر آفاقی	عکس کشمیر	لاہور	۱۹۹۱
۲۱	عبدالقادر سروری	کشمیر میں اُردو، جلد۔ا	جموں اینڈ کشمیر کلچرل اکیڈیمی، سرینگر، کشمیر	۱۹۸۱
۲۲	عبدالقادر سروری	کشمیر میں اُردو، جلد اول، دوسرا ایڈیشن	جموں اینڈ کشمیر کلچرل اکیڈیمی، سرینگر، کشمیر	۱۹۹۳
۲۳	عبدالقیوم رفیقی، پروفیسر	Sufism in Kashmir	bharti publising house banaras	
۲۴	عتیق اللہ	ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ جلد۔اول	اُردو مجلس	۱۹۹۵

۲۵	عنصر صابری	تاریخ کشمیر (مظلوم کشمیر)	اُردو بازار، لاہور	۱۹۹۱
۲۶	کلہن پنڈت/ مترجم ٹھاکر اچھر چند شاہپوریہ	مکمل راج ترنگنی، جلد اول	سرینگر کشمیر	
۲۷	والٹر روبرٹ لارنس/ مترجم غلام نبی خیال	ویلی آف کشمیر/ ترجمہ کشمیر کی وادی	قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی	۲۰۱۴
۲۸	محمد الدین فوق	تواریخ اقوام کشمیر جلد دوم	گلشن پبلیشرز، سرینگر کشمیر	۱۹۹۶
۲۹	محمد الدین فوق	حکایات کشمیر۔ بار اول	شاہین پبلیشرز، بڈشاہ چوک سرینگر، کشمیر	
۳۰	مشتاق احمد وانی	تقسیم کے بعد اردو ناولوں میں تہذیبی بحران	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۲
۳۱	ممتاز حسین	نقد حیات	الہ آباد پبلیشنگ ہاؤس، الہ آباد	۱۹۵۰
۳۲	منصور احمد منصور	اردو افسانے میں ہندوستانی تہذیبی عناصر	مرکز ادب اردو لکھنو	۱۹۸۸
۳۳	محمد منور مسعود	رتنچن سے رنجیت سنگھ تک	انڈین پرنٹنگ پریس، سرینگر	۱۹۹۳
۳۴	نصیر احمد ناصر	اسلامی ثقافت	تاج کمپنی دہلی	۱۹۸۷
۳۵	Williams, Raymond.	Keywords: A vocabulary of culture and society.	New York: Oxford University Press.	۱۹۷۶

رسائل وجرائد

شمارہ نمبر	رسالے کا نام	مدیر کا نام	مقامِ اشاعت	سن اشاعت
۱	شیرازہ	نلامبر دیو شرما	جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی سرینگر، کشمیر	جلد۔۵، شمارہ۔۱
۲	ایضاً	محمد اشرف ٹاک	ایضاً	جلد۔۵۱، شمارہ۔۱
۳	کشمیر اعظمی (روزنامہ)	فیاض احمد کلو	سرینگر، کشمیر	۱۲۶ اکتوبر، ۲۰۱۴
۴	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۲۱ دسمبر، ۲۰۱۴
۵	نوائے ادب	عبدالستار دلوی	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی	اپریل تا ستمبر، ۲۰۱۲
۶	ہمارا ادب	حامدی کشمیری	جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی سرینگر، کشمیر	۱۹۶۲
۷	ایضاً	محمد یوسف ٹینگ	ایضاً	۱۹۷۹۔۱۹۸۰
۸	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۰۔۱۹۸۱
۹	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۱۔۱۹۸۲
۱۰	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۲۔۱۹۸۳
۱۱	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۳۔۱۹۸۴

لغات

شمارہ نمبر	مرتب/مترجم	لغات	مقامِ اشاعت	سن اشاعت
۱	شان الحق حقی	اوکسفرڈ انگلیش اردو ڈکشنری	اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس	۲۰۰۳
۲	عبدالحق/ Abdul Haq baba-e-Urdu	The Standard English Urdu Dictionary	Anjuman Taraqqi Urdu, New Delhi	۱۹۸۵
۳	فیروزالدین، مولوی	جامع فروز الغات	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۶
۴	وارث سر ہندی، ایم۔اے	علمی اردو لغت (جامع)	علمی کتاب خانہ اردو بازار لاہور	۱۹۸۳
۵	یعقوب میراں مجتہدی	اردو انگریزی لغت مجتہدی Volume-I(ا تا ج)	حیدر آباد	۲۰۰۷

مقالات

مقالہ نگار	نگران	مقالے کا نام	یونیورسٹی کا نام	سن اشاعت
اعجاز احمد	ڈاکٹر رشید امجد	اردو ناول میں کشمیر بطور موضوع تحقیقی جائزہ (ایم۔فل)	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد	۲۰۰۳
حمیرہ تسلیم	پروفیسر مظفر علی شہ میری	اُردو فکشن میں حیدرآبادی تہذیب کی عکاسی (پی۔ایچ۔ڈی)	شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد	۲۰۰۹
محمود احمد	پروفیسر سکھ چین سنگھ	ریاست جموں وکشمیر کے افسانوی ادب میں دیہاتی زندگی کی عکاسی (پی۔ایچ۔ڈی)	شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں وکشمیر	۲۰۱۱
نبیل احمد	پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران	اردو تنقید میں تہذیب وثقافت کے مباحث (تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ) (پی۔ایچ۔ڈی)	شعبۂ اردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	۲۰۱۳

Website.

UK Essays. "Understand The Two Concepts Culture And Civilization Sociology Essay"
http://www.ukessays.com/essays/sociology/understandthetwo conceptscultureandcivilizationsociologyessay.php# 4/21/2015

UNIVERSITY OF HYDERABAD

(A Central University established by an Act of Parliament)
PO.CENTRAL UNIVERSITY, HYDERABAD-500046(INDIA)

DECLARATION

I, **JAVEED AHMAD MIR** hereby declare that this thesis entitled "**URDU AFSANAI MA KASHMIRI TEHZEEB-O-SAQAFAT: JAMMU–KASHMIR KE AFSANA NIGAROO KE HAWALE SE**" submitted by me under the supervision of **Dr. A. R. MANZAR** is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously, in part or in full, to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in Shodganga/INFLIBNET.

Date: Name: JAVEED AHMAD MIR

Signature of the Student

Reg. No: 11 HUPH 11

Signature of the Supervisor

UNIVERSITY OF HYDERABAD
(A Central University established by an Act of Parliament)
PO.CENTRAL UNIVERSITY, HYDERABAD-500046(INDIA)

CERTIFICATE

This is to certify that the Thesis entitled **"URDU AFSANE MAI KASHMIRI TEHZEEB –O–SAQAFAT: JAMMU – KASHMIR KE AFSANA NIGAROO KE HAWALE SE"** submitted by **JAVEED AHMAD MIR,** bearing **Reg. No.11HUPH11** in partial fulfillment of the requirement for the award of the Degree of **Doctor of Philosophy** in Urdu is original work has been carried out by him under my supervision and guidance. The Thesis has not been previously, in part or in full, submitted for any degree or diploma to this University or any other institution.

Place: Hyderabad

Date: ....

Dr. A. R. MANZAR

Supervisor

HEAD
Department of Urdu
University of Hyderabad

DEAN
School of Humanities
University of Hyderabad

URDU AFSANAI MAI KASHMIRI TEHZEEB-O-SAQAFAT

JAMMU – KASHMIR KE AFSANA NIGAROO KE HAWALE SE

A Thesis submitted to the University of Hyderabad in Partial Fulfillment of Requirement for the Award
Of

Doctor of Philosophy

In Urdu
By

JAVEED AHMAD MIR

Enrolment No.11 HUPH 11

Under the Supervision of

DR. A. R. MANZAR

(Assistant professor)

Department of Urdu
SCHOOL OF HUMANITIES
UNIVERSTIY OF HYDERABAD
Hyderabad-500046 (INDIA)

June-2015